OUDH
وقائع دل پذیر
بادشاہ بیگم اَوَدھ
ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا مذہبی پہلو
جلد اوّل
تالیف
عبد الاحد رابط
حیٔ 1268ھ/1851ء
تدوین و تقدیم
علامہ محمود احمد عبّاسی
اعداد و تعارف
محمد فہد حارث
حارث پبلی کیشنز

بادشاہ بیگم اودھ

ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا مذہبی پہلو

تالیف: عبدالاحد رابط

تدوین وتقدیم: علامہ محمود احمد عباسی

اعداد وتعارف: محمد فہد حارث

پبلشر: حارث پبلی کیشنز

وقائع دل پذیر

بادشاہ بیگم اودھ

ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا مذہبی پہلو

حارث پبلی کیشنز

جملہ حقوق اشاعت برائے حارث پبلی کیشنز محفوظ ہیں

وقائع دل پذیر

بادشاہ بیگم اودھ

ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا مذہبی پہلو جلد اوّل

تالیف: .... عبدالاحد رابط

تدوین و تقدیم: .... علامہ محمود احمد عباسی

اعداد و تعارف: .... محمد فہد حارث

اشاعت اوّل: .... اگست 2019ء

تعداد کتاب: 250

کمپوزنگ: .... مسز محمد عمران

قیمت: 700

پبلشر:
حارث پبلی کیشنز

شروع اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

فہرست

حرفِ چند

لکھنؤ کا تمدن:

شیخ محمد اکرام اپنی کتاب ''رودکوثر'' میں بیان کرتے ہیں کہ برصغیر کے شیعوں نے اپنی ذہانت، بلند نظری اور قابلیت سے ہماری تمدنی اور ادبی تاریخ میں کئی رنگین باب اضافہ کئے۔ اسی ادبی اور تمدنی تاریخ کے رنگین ابواب کا ایک ثمر لکھنؤ، اودھ اور فیض آباد کا تمدن ہے جس سے متعلق زیر نظر کتاب میں آگے جا کر قارئین کو تفصیلی ورق گردانی کا موقع ملے گا۔ تاہم ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس تمدن سے اپنے قارئین کو آگاہ کرنے میں تھوڑا بہت حصہ ہم بھی ڈال لیں۔ سو ذیل میں چند سطریں اسی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی ادنیٰ سی کاوش ہیں۔

لکھنؤ اور ایران:

لکھنؤ ابتداً اہلسنت شہر تھا۔ مسلمانوں کی فتوحات کے سلسلے میں سب سے پہلے اس کا ذکر سید سالار مسعود غازی کے بیان میں ملتا ہے جو کہ ۴۵۹ ہجری کے عہد کی بات ہے۔ اس کے بعد ۶۳۱ ہجری میں بختیار خلجی نے اس پر حملہ کیا اور یہاں مسلمان آ کر آباد ہونا شروع ہوئے۔ مغل بادشاہ اکبر کے عہد تک لکھنو و اودھ خالصتاً سُنّی ریاستیں ہوا کرتی تھیں۔ اکبر نے جب اپنی مملکت کو صوبوں میں تقسیم کیا تو اودھ ایک مستقل صوبہ اور لکھنو اس کا دارالخلافہ قرار پایا۔

شیخ عبدالرحیم جو کہ سنی المذہب تھے ان کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا۔ عہد اکبری میں ہی لکھنو ایک بڑی تجارتی منڈی بن گیا تھا اور اسکی ترقی کا یہ عالم تھا کہ ایک

فرانسیسی تاجر جو گھوڑوں کی تجارت کیا کرتا تھا اس نے دربار شاہی سے لکھنو میں قیام کے لئے سند (آج کی اصطلاح میں ویزہ کہہ لیں) حاصل کی ہوئی تھی، سال ختم ہونے پر اس کی سند کی تجدید نہ ہوسکی اور جب اس نے زبردستی غیر قانونی و بلا اجازت قیام کرنا چاہا تو اس کے مکانات اور املاک بحق سرکار ضبط کر لئے گئے۔ یہی مکانات و املاک بعد میں مُلّا نظام الدین سہالوی کو عطا ہوئے اور اس فرانسیسی کی نسبت سے فرنگی محل کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ وہی مشہور مُلّا نظام الدین ہیں جن کا مرتب کیا ہوا نصاب تعلیم کا سلسلہ بعد میں درس نظامی اور نظامیہ کے نام سے نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ بیرون بھی رائج ہوا اور آج تک رائج ہے۔

عہد شاہجہانی میں یہاں کے صوبہ دار سُنی المذہب علی قلی خان تھے۔ علی قلی خان کے دو بیٹے مرزا فاضل اور مرزا منصور تھے جن کے نام پر فاضل نگر و منصور نگر آباد کئے گئے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ صوبہ داروں کی قوت کم ہوتی گئی اور اصل قوت شیخ زادوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ جن کا زور ۱۱۳۳ ہجری بمطابق ۱۷۲۰ عیسوی میں میر محمد امین سعادت خان برہان الملک نیشاپوری نے توڑا اور لکھنو میں شیعہ حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

لکھنؤ اور اودھ میں شیعیت کی ابتداء:

ہندوستان کے کئی ایسے علاقے جو عرصہ دراز تک اہلسنت کا مذہب رکھتے تھے، حکمرانوں کے تبدیلی مذہب کے سبب اہل تشیع اکثریتی علاقوں میں تبدیل ہو گئے۔ اودھ کی ریاست اس کا جیتا جاگتا نمونہ تھی جو عرصۂ دراز تک سنی المذہب اکثریت پر مشتمل تھی۔ جیسا کہ ہم نے چند سطر قبل بیان کیا کہ اودھ و لکھنؤ میں شیعیت کی ابتداء اس وقت ہوئی جب میر محمد امین سعادت خان برہان الملک نیشاپوری دربارِ دہلی کی طرف

سے اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو کر فیض آباد پہنچے۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھنؤ کا دبستان شاعری میں لکھتے ہیں کہ میر محمد امین ایرانی نژاد تھے۔ ان کے اجداد میں قاضی سید شمس الدین، شاہ صفوی کے عہد میں ایران میں قاضی القضاۃ تھے۔ میر محمد امین کے چچا میر محمد یوسف شاہ عباس ثانی کے ہاں ملازم تھے۔ ایک نازک موقع پر انہوں نے شاہ عباس ثانی کی جان ایک موذی شیر سے بچائی تھی جس کے صلہ میں انہیں نیشاپور کی جاگیر عطا ہوگئی۔ عہدہ وزارت بھی انہیں پیش کیا گیا لیکن انہوں نے اسے پسند نہ کیا بلکہ اپنے بھائی میر نصیر کی شادی وزیر السلطنت رضا قلی بیگ کی بیٹی سے کروادی جس کے بطن سے میر محمد امین پیدا ہوئے جو بعد میں نواب سعادت خاں برہان الملک کے نام سے معروف ہوئے اور جن کی اولاد نے ایک صدی سے زیادہ یعنی ۱۷۱۹ء تا ۱۸۵۵ء لکھنؤ میں حکومت کی۔

نولکشور پریس سے شائع ہونے والی تاریخ اودھ مصنفہ نجم الغنی میں مذکور ہے کہ

> ''میر محمد امین کے والد میر نصیر ہندوستان وارد ہوئے تھے اور یہیں میر محمد امین متولد ہوئے اور پلے بڑھے۔ آدمی قابل تھے سو دہلی پہنچ کر بعض درباریوں سے توسل پیدا کیا اور شاہزادگانِ دہلی کی جائدادوں کا ٹھیکہ لینا شروع کیا۔ تعلقات بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھے کہ فرخ سیر نے انہیں منصب ہزاری عطا کیا اور کچھ دنوں بعد ان کی شادی صوبہ دار اکبر آباد نواب نقی خان کی بیٹی سے ہوگئی۔ ان دنوں دہلی میں ساداتِ بارہہ کا زور تھا۔ بادشاہ اور رعیت دونوں ان سے پریشان تھے۔ میر محمد امین نے بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر نواب حسین علی خاں کے قتل کی سازش کی اور میر حیدر کو اس کام پر آمادہ کر کے سادات کے امیر الامراء

نواب حسین علی خاں کو قتل کروا دیا جس کے بعد شاہزادگانِ دلّی اور سیّدوں کے مابین علانیہ جنگ چھڑ گئی جو سادات بارہہ کے زوال پر منتج ہوئی۔ ساداتِ بارہہ کا زور توڑنے میں میر محمد امین خان کا بڑا ہاتھ تھا سو بادشاہ کی طرف سے پنج ہزاری کا منصب اور اکبر آباد کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ ابھی اکبر آباد کی صوبہ داری پر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حکمرانوں کی طرف سے محمد امین سعادت خاں برہان الملک کو صوبہ اودھ کی صوبہ داری تزویج کر کے بھیج دیا گیا جو کہ اس وقت کافی مشکل صوبہ تھا''۔

سُنّی المذہب شیخ زادگان اودھ:

برہان الملک کی اودھ آمد سے قبل یہاں شیخ زادوں کا دور دورہ تھا اور وہ برسرِاقتدار تھے۔ سید میر محمد زائر نے سوانح سلاطین اودھ جو کہ نولکشور پریس سے ۱۸۹۶ء میں طبع ہوئی تھی، لکھا ہے کہ شیخ زادوں کے جد بجنور کے شیخ عبدالرحیم تھے۔ شیخ عبدالرحیم مفلسی اور محتاجی سے تنگ آ کر تلاشِ معاش میں دہلی پہنچے اور اکبر کے دربار تک رسائی پیدا کی۔ اسی سال ایک روز بادشاہ کو نجومیوں نے اطلاع دی کہ فلاں دن بادشاہ کے لئے بڑا منحوس ہے اور مصلحت یہ ہے کہ اس خاص ساعت کے واسطے بادشاہت کسی اور کو بخش دی جائے۔

بادشاہ نے شیخ عبدالرحیم کی طرف نظر ڈالی، عبدالرحیم تو خود جان سے بے زار تھے۔ احکام شاہی کی تعمیل میں یہ خدمت قبول کر لی۔ جب وہ ساعت ختم ہونے کے قریب آئی تو بادشاہ نے پوشاک طلب فرمائی۔ خواجہ سرا نے تاجِ شاہی پیش کیا، اس میں سے ایک سانپ نکلا جس نے خواجہ سرا کی انگلی میں کاٹ لیا اور وہ ہلاک ہو گیا۔ نجومیوں نے کہا کہ یہی وہ آفت تھی جو بجائے سلطان معظم کے خواجہ سرا پر گزر گئی۔

بادشاہ نے سکھ کا سانس لیا اور شیخ عبد الرحیم کو ایثار کے بدلے تین دن کی سلطنت اور لکھنو جاگیر میں عطا فرمائی۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی فرماتے ہیں کہ

''لکھنؤ کا مشہور پنج محلہ انہیں کی یادگار ہے جہاں انہوں نے اپنی پانچ بیگمات کے لئے پانچ محلات تعمیر کرائے تھے اور خود اپنی سکونت کے لئے مشہور قلعہ مچھی بھون بنوایا تھا۔ اس پر مچھلی کی تصویر تھی سیا معماروں نے بغرض آرائش قلعے کے ۲۶ دروازوں پر دو دو مچھلیاں بنا دی تھیں۔ مچھلیوں کی مجموعی تعداد چونکہ ۵۲ تھی، اس لئے عمارت کا نام مچھی باون ہوگیا اور کثرتِ استعمال سے لوگ باون کی جگہ بھون کہنے لگے۔ شیخ عبد الرحیم اور ان کے بعد ان کی اولاد اس جاگیر پر قابض رہی۔

لکھنؤ ی شیوخ کی دوسری نسل شیخ ابو المکارم کی اولاد تھی جن کی یادگار ندوہ کے عقب میں مکارم نگر اب تک موجود ہے۔ ابو المکارم عالمگیر کے عہد میں اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے تھے اور ان کے توسل سے ان کی آل اولاد لکھنؤ میں آباد تھی اور شیوخ لکھنؤ میں یہی لوگ سب سے مقتدر تھے۔ انہوں نے مچھی بھون کے صدر دروازہ میں ایک برہنہ شمشیر لٹکا رکھی تھی اور جو کوئی ان شیخ زادوں سے ملنے جاتا وہ پہلے جھک کر اس تلوار کی تعظیم بجا لاتا، حتیٰ کہ وہ صوبہ دار بھی جو دِلّی سے اودھ پر حکومت کرنے کے لئے مقرر ہوکر آتا تھا، شیخ زادوں کی طاقت کے سامنے جھک کر یہ رسم ادا کرتا تھا۔''①

① لکھنؤ کا دبستان شاعری حاشیہ صفحہ ۲۸ تا ۲۹.

برہان الملک کی اودھ میں آمد:

انہیں شیخ زادوں کی طاقت توڑنے کے لئے بادشاہِ دِلّی نے میر محمد امین سعادت خان برہان الملک کولکھنؤ کی صوبہ داری پر بھیجا۔نواب برہان الملک نے کیونکر شیخ زادوں کا اثر ورسوخ ختم کر کے لکھنؤ پر قبضہ حاصل کیا،اس بابت مولانا عبدالحلیم شرؔر اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی دونوں نے تقریباً ایک ہی طور کی معلومات بالترتیب گزشتہ لکھنؤ اور لکھنؤ کا دبستانِ شاعری میں درج کی ہیں۔ہم یہاں یہ تفصیلات ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے قلم سے ہدیۂ قارئین کررہے ہیں:

''برہان الملک جب اودھ روانہ ہوئے تو راستہ میں کچھ دنوں نواب محمد خاں نواب فرخ آباد کے مہمان رہے۔نواب آزمودہ کار اور مدبر تھے،برہان الملک کو یہ مشورہ دیا کہ لکھنؤ میں یکا یک داخل ہوکر قبضہ کرنے کی کوشش خطرہ سے خالی نہیں۔کیونکہ شیخ زادوں کی طاقت وتمرد کی داستانیں عام طور پر مشہور ہیں اور اکثر صوبہ دار یکا یک لکھنؤ میں داخل ہوکر ان کے نرغے میں پھنس چکے ہیں۔برہان الملک نے اس مشورہ پر عمل کیا اور ارادہ کرلیا کہ پہلے حالات دیکھ کر پھر لکھنؤ میں داخلہ کی کوشش کی جائے۔اسی غور وفکر میں برہان الملک نے دریائے گنگا کو پار کیا،اس سفر میں ایک مچھلی پانی سے جست لگا کر نواب کے دامن میں آگری۔نواب نے اسے اپنے حق میں فالِ نیک سمجھ کر احتیاط سے اٹھالیا۔

لکھنؤ پر قابض ودخیل ہونے کے بعد بھی یہ مچھلی بطور تبرک شاہی خزانہ میں محفوظ تھی اور ان کے خاندان کی حکومت کے آخری زمانہ تک موجود رہی۔

اسی کو نوابانِ اودھ کے درباری نشان میں استعمال کیا جاتا تھا اور یہی شکل

آج تک اس صوبہ کی موجودہ حکومت کے نشان میں شامل ہے۔
چنانچہ لکھنؤ شہر کے قریب پہنچ کر برہان الملک نے شیخ زادوں کو اطلاع کرائی اور اپنا خیمہ شہر سے باہر ایک مناسب مقام پر نصب کرایا۔ عرصہ تک ان شیوخ کو قابو میں لانے کی صورت نہ نکلی لیکن رفتہ رفتہ ان سے ارتباط بڑھا۔ ایک دن سات ہزار شیوخ کی دعوت کی گئی اور جب وہ سب غافل ہوگئے تو برہان الملک کے آدمی ان پر ٹوٹ پڑے اور سب کو ٹھکانے لگا دیا۔
ایک روایت یہ بھی ہے کہ نواب برہان الملک نے راتوں رات گومتی کو پار کیا اور اپنی سپاہ اور توپوں کو لیکر اس مشہور شیخ دروازہ سے گذر گئے جہاں شیخ زادوں کی شمشیر برہنہ لٹک رہی تھی۔ سب سے پہلے برہان الملک نے اس تلوار کو کاٹ کر شیخ زادوں کے غرور ونخوت کے اس نشان کو مٹا دیا اور پھر خاص مچھی بھون کے پھاٹک کے سامنے خیمہ لگا دیا۔ شیخ زادوں نے دیکھا کہ میدان ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ناچار اطاعت قبول کر لی۔ برہان الملک نے مچھی بھون کے خالی کرنے کا حکم دیا۔ اس دن سے مچھی بھون دارالامارۃ مقرر ہوا‘‘۔①

فیض آباد:

میر محمد امین سعادت خان برہان الملک ایرانی نژاد تھے۔ ان کے اجداد میں قاضی سید شمس الدین، شاہ صفوی کے شیعہ عہد میں قاضی القضاہ کے عہدے پر مامور تھے اور مذہب اثنا عشریہ کے مطابق قضایا کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ برہان الملک کے بعد

① لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صفحہ ۲۸ تا ۳۰۔

صفدر جنگ مسند نشین ہوئے۔ان کے زمانے میں فیض آباد بسایا گیا جو کہ خالصتاً شیعہ بستی تھی۔صفدر جنگ کی سرپرستی میں فیض آباد کو وہ عروج نصیب ہوا کہ دہلی سے ہمسری کا دعویٰ محسوس ہوتا تھا۔صفدر جنگ کے انتقال کے بعد کچھ عرصے کے لئے فیض آباد میں خزاں آگئی لیکن جلد ہی ان کے فرزند شجاع الدولہ نے عقل وحکمت سے کام لے کر شہر کو نہ صرف اس کی پرانی رونقیں واپس کردی بلکہ ان میں روز افزوں ترقیاں دیتے چلے گئے۔شہر میں بازار جانے والی سڑکیں اس قدر چوڑی تھیں کہ ایک ساتھ دس چھکڑے بآسانی گزر سکتے تھے۔حوالی شہر میں دو مرغزار شکارگاہ قرار دیئے گئے تھے جن میں ہرن، چیتل، بارہ سنگھے، نیل گائے اور کثرت سے شکار کئے جانے والی دیگر جانور چھوڑے گئے تھے۔

خاص شہر کے اندر تین نہایت بڑے بڑے باغ بنائے گئے تھے جو اس شان کے تھے کہ شہر کے امراء اور شہزادے بھی وہاں چہل قدمی اور سیر کے لئے آیا کرتے تھے۔ان میں سے ایک باغ کا نام لال باغ تھا جس کی خوبصورتی اور پھول والے پودوں کی چمن بندی اس قدر مشہور تھی کہ بادشاہِ ہندوستان الٰہ آباد سے دہلی واپسی پر خاص اس باغ کی سیر کے شوق میں فیض آباد رکتے ہوئے گئے اور اس باغ میں کئی دن قیام کیا۔شجاع الدولہ چونکہ سپہ گیری سے خاص شوق رکھتے تھے اس لئے شہر میں فوج کی پلٹنوں کی پلٹن نظر آتی تھیں۔

مولانا عبدالحلیم شرر فیض آباد کی خوشحالی کا آنکھوں دیکھا حال تاریخ فرح بخش کے مصنف منشی فیض بخش کے الفاظ میں لکھتے ہیں کہ

’’میں جب فیض آباد گیا اور ممتاز نگر پہنچا جو کہ فیض آباد شہر کے مغربی پھاٹک سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے

انواع واقسام کی مٹھائیاں، گرما گرم کھانا، کباب، سالن، روٹیاں اور پراٹھے پک رہے ہیں۔سبیلیں رکھی ہوئی ہیں۔ نان خطائیاں، مختلف قسم کے شربت اور فالودہ بک رہا ہے اور صدہا آدمی خریداری کے لئے ان دکانوں پر گرے پڑتے ہیں۔ مجھے خیال گزرا کہ میں شہر کے اندر داخل ہوگیا اور خاص چوک میں ہوں مگر متحیر تھا کہ ابھی تک شہر کا پھاٹک تو آیا ہی نہیں، میں اندر کیسے پہنچ گیا؟ لوگوں سے پوچھا تو ایک راہگیر نے کہا، جناب شہر کا پھاٹک یہاں سے چار میل ہے۔آپ کس خیال میں ہیں؟

اس جواب پر حیرت کرتا ہوا میں شہر میں داخل ہوا تو عجب چہل پہل نظر آئی۔ایک عجیب رونق وتمکنت کا شہر نظر آیا جس میں وضعداران دہلی میں سے خوش پوشاک اور وضعدار شریف زادے، حاذق اطبائے یونانی، اعلیٰ درجے کے مردانے اور زمانے طائفے، ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گوّیے سرکار میں ملازم تھے اور بڑی بڑی تنخواہیں پا کے عیش و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے۔ ادنیٰ و اعلیٰ سب کی جیبیں روپیوں، اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیں اور ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے یہاں کبھی کسی نے افلاس و احتیاج کو خواب میں بھی نہیں دیکھا ہے۔شجاع الدولہ شہر کی سرسبزی اور رعایا کی مرفہ الحالی میں ہمہ تن مصروف ہیں اور معلوم ہوتا تھا کہ چند ہی روز میں فیض آباد دہلی کی ہمسری کا دعویٰ کرے گا''۔①

یہ تو تھا تصویر کا روشن پہلو جو پوری دیانتداری سے ہم نے قارئین کے سامنے رکھ دیا۔تاہم اب عبدالحلیم شرر کی گزشتہ لکھنؤ سے ہی اس تصویر کا سیاہ پہلو بھی قارئین

① گزشتہ لکھنؤ صفحہ نمبر ۵۹،۵۸.

کے سامنے رکھ دینا مناسب سمجھتے ہیں کیونکہ ۔

جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

''شجاع الدولہ کا طبعی میلان مہ جبیں عورتوں اور قص وسرود کی طرف تھا جس کی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والی طوائفوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہوگئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ ان سے خالی نہ تھا اور نواب (شجاع الدولہ) کے انعام واکرام سے وہ اس قدر خوش حال اور دولت مند تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں جن کے ساتھ دو دو تین تین عالیشان خیمے رہا کرتے اور نواب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے اور سفر میں ہوتے تو نوابی خیموں کے ساتھ ساتھ ان کے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھکڑوں پر لدلد کے روانہ ہوتے اور ان کے گرد دس دس بارہ بارہ تلنگوں کا پہرہ رہتا اور جب حکمران کی یہ وضع تھی تو تمام امراء اور سرداروں نے بھی بے تکلف یہی وضع اختیار کرلی اور سفر میں سب کے ساتھ رنڈیاں رہنے لگیں''①

اس بیہودگی وفحاشی نے خود اہل فیض آباد اور لکھنؤ کی طبیعتوں پر کیا اثر ڈالا اس کے لئے عبدالحلیم شرر کے قلم سے نکلی اگلی سطریں کافی ہیں جو کہ اس فحاشی و بدحیائی کا اعتراف کرنے کے باوجود اس کو شہر کی رونق کا سبب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگرچہ اس سے بداخلاقی اور بے شرمی کو ترقی ہوگئی، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان شاہدان بازاری کی کثرت اور امراء کی شوقینی سے شہر کی رونق

① گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۵۹-۶۰۔

بدر جہا بڑھ گئی تھی اور فیض آباد دلہن بن گیا تھا‘‘①

نواب شجاع الدولہ کے مرتے ہی فیض آباد کی رونقیں ماند پڑنے لگیں گرچہ ان کی بی بی بہو بیگم نے شہر کی حالت برقرار رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن نالائق بیٹے آصف الدولہ کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہوسکا جو ماں سے لڑ جھگڑ کر فیض آباد سے لکھنؤ آ بیٹھے اور اس کو اپنا مستقر حکومت قرار دے ڈالا۔

لکھنؤ کا مستقرِ حکومت بننا:

آصف الدولہ ماں سے ناراض ہوکر لکھنؤ آ تو بیٹھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے باپ کے برعکس حکومت کرنے کی اہلیت سے سراسر عاری تھے۔ نواب شجاع الدولہ اپنی تمام عیاشیوں کے باوجود سپاہی آدمی تھے اور بقول منشی فیض بخش شجاع الدولہ کی بندوقیں انگریزی بندوقوں سے کہیں تیز اور بہتر تھیں جن کے سامنے انگریزی بندوقیں کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔ جو انگریز شجاع الدولہ کی فوجی حکمت عملی سے ڈرتے تھے انہوں نے شجاع الدولہ کے نالائق بیٹے کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ باپ کی لاکھوں افراد پر مشتمل فوج کو برخاست کرکے ان کے اخراجات اپنی عیاشی پر صرف کریں اور سپہ گیری کا کام انگریزوں کے لئے چھوڑ دیں۔ آصف الدولہ کو اپنی عیاشی کے لئے اور کیا چاہیئے تھا، سب کو معزول کیا اور بس تھوڑی سی فوج رکھ کر لکھنؤ کی حفاظت انگریزوں کے حوالے کردی۔ تاہم فوجی اخراجات سے جو پیسے بچے ان کو جی بھر کر لکھنؤ کی تزئین وآرائش پر لگایا اور لکھنؤ کو ایسی جائے فرحت بنادیا کہ یورپ سے فرنگی سیاح لکھنؤ کی گلیاں اور باغات دیکھنے آتے تھے۔

آصف الدولہ نے لکھنؤ میں امام باڑوں اور دیگر عمارتوں کی صناعی پر کثیر رقم

① صفحہ ۶۰.

خرچ کی اور لکھنؤ میں ایسی ایسی عمارتیں بنوائیں جن کی لداؤ کی چھتیں ساری دنیا میں کہیں نہیں تھیں اور اسی وجہ سے اس وقت وہ عمارات دنیا کی اعجوبۂ روزگار کاریگریوں میں شمار کی جاتی تھیں۔آصف الدولہ کو تعمیرات سے جو دلچسپی تھی اس کا اندازہ ایک طرف تو لکھنؤ میں اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں سے ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کے اس شعر سے۔

جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے
عمارت بناتے چلے جایئے

آصف الدولہ کے عہد میں ہی لکھنؤ ادبی مرکز بنا اور دہلی کے اکابر شعراء ہجرت کر کے اودھ پہنچے۔اور یوں ہر گزرتے حکمران کے ساتھ لکھنؤ ترقی کی نئی منازل طے کرتا گیا اور یوں وہ تمدن پروان چڑھا جس کو لکھنویت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اسی لکھنؤ کے بارے میں مرزا جعفر حسین اپنی تالیف قدیم لکھنؤ کی آخری بہار میں لکھتے ہیں:

''اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ لکھنؤ ایک انتہائی دلفریب اور گرانقدر تہذیب کا کچھ عرصہ قبل تک مرکز تھا۔لکھنؤ کی تہذیب اپنی جگہ پر ایک ایسی حسین وجمیل اور پُر کیف دنیا تھی جس کو شاہانِ اودھ کے دورِ اقتدار میں بسایا اور آباد کیا گیا تھا''۔①

لیکن ڈاکٹر سلیم اختر صاحب لکھنؤ کی تہذیب اور کلچر کو کچھ الگ طور سے دیکھتے ہیں اور اس کی چکا چوند کر دینے والی تہذیب کو طاؤس و رباب کا کلچر بتاتے ہیں۔آپ لکھتے ہیں:

''میں ذاتی طور پر لکھنؤ کے سلسلے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ لکھنؤ کا کلچر

① صفحہ ۷.

قوت کی پیدا کردہ شان و شوکت کے برعکس انحطاط کے کلچر کی دل کشی کا حامل تھا۔ لکھنؤ کا کلچر طاؤس ورباب اول اور اس سے جنم لینے والے اس احساس پر مبنی تھا: عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!۔ دراصل لکھنؤ کو یوں شہرت حاصل ہوگئی کہ یہاں عیش کے تمام وسائل، نشاط کوشی کے تمام ذرائع اور تعیش کے تمام لوازم کو ان کی منطقی انتہا تک پہنچا دیا گیا جس کے نتیجے میں وہ محض ذریعہ سے بڑھ کر مقصود بالذات ہو گئے''۔①

ڈاکٹر سلیم اختر کی بات اپنی جگہ نہایت درست ہے۔ لکھنؤ میں حکمرانوں کی عیاشیوں نے لوگوں کی طبیعت پر اس قدر سفلی اثر ڈالا کہ عیش کوشی کی ہر چیز ذریعہ نہیں رہا بلکہ مقصود بن کر سامنے آیا۔ وہ کونسی عیاشی ہوگی جو لکھنؤ میں اپنے عروج کو چھو کر نہ آئی ہو۔

شہوت پرستی وزن بازی:

ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

''آصف الدولہ کے بارے میں مفتاح التواریخ نے لکھا ہے کہ ان کے محل میں پانچ سو عورتیں تھیں جن میں سے کئی ایسی تھیں جو حالتِ حمل میں داخل ہوئیں تھیں''۔②

ڈاکٹر سلیم اختر لکھنؤ میں قحبہ گیری کی لعنت پر شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چلیں اس زمانہ کی طوائفیں پڑھی لکھی، شعروشاعری کے ذوق کی حامل، آدابِ محفل سے آگاہ اور رقص میں ماہر اور دل لبھا لینے والے فنون میں طاق ہوتی تھیں، اس لئے طوائفیں بیوی بن کر بھی جمالیاتی ذوق کی تسکین کا

① ڈاکٹر سلیم اختر: مقدمہ گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۲۹-۳۰۔
② لکھنؤ کا شعروادب: عہدنوابین کے معاشرتی وثقافتی تناظر میں، صفحہ ۸۷

باعث بن سکتی ہوں گی لیکن اس کا کیا کیجئے کہ نصیر الدین حیدر کی ایک بیگم بنارس کے ایک کوری کی لڑکی تھی جس کا اصلی نام دلاری تھا۔ وہ ایک فیل بان کے ساتھ ناجائز طور پر منسلک تھی اور جب محل میں مُنّا جان کی پیدائش کے وقت انّا کی حیثیت سے آئی تھی تو بادشاہ اس کو دیکھتے ہی دل کھو بیٹھے۔ چنانچہ اس کو دوسری خواصوں کے ہمراہ نواب کے عیش کے واسطے بھیج دیا گیا۔ بعد میں یہ عقد میں آئیں اور ملکہ زمانیہ کا خطاب پایا۔ اسی طرح نصیر الدین حیدر کی ایک دوسری ملکہ جو تاج محل کے خطاب سے نوازی گئیں، چھجو طوائف کی لڑکی تھی۔ ایک اور بیگم بادشاہ محل میں پہلے ایک رقاصہ تھی اور ان کے گھر مجرا کرنے جایا کرتی تھی کہ بادشاہ اس کی بانکی ترچھی اداؤں کے گھائل ہو گئے اور ایک بیگم خاص محل کا اصلی نام حسینی خانم تھا، قوم کی حلال خوری تھی اور اس خدمت پر محل میں مامور تھیں لیکن نصیر الدین حیدر اس پر بھی فریفتہ ہو گئے۔ اس طرح پھول محل بنیں''۔①

کچھ اسی طور کا شکوہ سید محمد ابو الخیر کشفی نے بھی اپنی کتاب اردو کا سیاسی اور تاریخی پس منظر میں کیا۔ آپ لکھتے ہیں:

''امجد علی شاہ کا دور بہت مختصر ہے۔ وہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۷ء تک فرماں روائے اودھ رہے۔ انہیں عام طور پر مذہبی حکمراں قرار دیا جاتا ہے۔ مذہب کے رسمی پہلوؤں کی حد تک یہ بات درست ہے۔ امجد علی شاہ مجالس عزا برپا کرتے، غم حسین رضی اللہ عنہ میں سیہ پوش رہتے اور انیس و دبیر کی مجالس میں شرکت کرتے۔ لیکن دوسری طرف جنسی لذتوں کے دریا میں پیرا کی

① مقدمہ گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۳۸.

کرتے اور شرعی پابندیوں پر متعہ کے اسمِ اعظم سے قابو پالیتے۔ مذہب کو ذاتی مقاصد کے لئے بادشاہوں نے اکثر استعمال کیا ہے۔ دین کو اجتماعی زندگی اور دل ونظر کی گہرائیوں سے الگ کرکے محض رسمی طور پر اس کے شعائر کی پابندی سے نہ دنیا بنتی ہے، نہ آخرت۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھنے کے بعد امجد علی شاہ کے مذہبی رجحانات اور ان کے عہد کی اس تصویر میں کوئی تضاد نہیں رہتا جو رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عبرت میں پیش کی ہے:

اس دورے میں رنڈیوں کا دور ہوا۔ اگر پیشِ خدمت ہمشیر ہے تو برادرِ عزیز حضرت کا مشیر ہے۔ خالہ، خلوت میں پائیں نشیں، بھانجا جلوت میں صدر امین۔ اُخت سرکار میں، اخی اخبار میں اور جس کی اندر جوان لڑکی ہے، اس کی باہر سواری بڑے ہلڑ کی ہے''۔①②

ڈاکٹر سلیم اختر گزشتہ لکھنؤ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''اس تماش بین معاشرہ کو تماش بینی نے ناچ، مجرے اور طوائف کو تہذیب کا مرکز اور ثقافت کا محور بنادیا تھا۔ اس دور کے بڑے بڑے شعراء کو بیس پچیس روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا جس پر وہ اور ان کا کنبہ پلتا تھا مگر طوائفوں کا عالم تھا کہ بقول مصحفیؔ۔

منہ تھیلیوں کے کھلتے ہیں از بہر طوائف

اس موقع پر مجھے استاد محترم ڈاکٹر صفدر حسین کی بات یاد آرہی ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ یہ بتا کر کتابوں میں لکھے کی گویا توثیق کردی کہ آدابِ محفل

① رجب علی بیگ سرور: فسانہ عبرت۔
② اردو کا سیاسی اور تاریخی پس منظر صفحہ ۵۳، ۵۴.

سیکھنے کے لئے ہمیں طوائفوں کے ہاں بھیجا جاتا تھا بلکہ ہمارے والد ساتھ لے کر وہاں جاتے تھے اور ایک تم پنجابی ہو کہ کنجری قرار دے کر اسے بے وقار کر دیا۔

میں نے جواباً کہا اب میں سمجھا کہ ہمیں آدابِ محفل کیوں نہ آسکے۔ ہمارے ابا ہمیں بھی طوائفوں کے کوٹھے پر بھیجتے تو ہم بھی کلچرڈ ہوتے۔

میرے اس جواب پر ڈاکٹر صاحب نے بھرپور قہقہہ لگایا''۔①

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر میں لکھتے ہیں:

''میر حسنؔ کی کلیات میں فردیات کی نوعیت تاریخی ہے۔ یہ فردیات مختلف طوائفوں کی تعریف میں ہیں اور ہر فرد میں طوائف کا نام نظم کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ میر حسنؔ کے دور میں یہ سب طوائفیں اودھ کی ممتاز شہری ہوں۔ننھی اور دردانہ کے بارے میں فردیات ملاحظہ ہوں:

لئے جاتی ہے دل آنکھوں میں سب کا
سمجھتی ہی نہیں ایسی ہے ننھی

عجب لذت، مزا ہے اس میں یارو
بدن دردانہ ہے اس گلبدن کا

اردو شاعری پر لکھنوی تمدن کا اثر:

حکمرانوں کے نقشِ قدم پر چل کر عوام کا مزاج بھی انتہائی رذیل اور گرا ہوا ہو چکا تھا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہا جس کو شہوت پرستی نے متاثر نہ کیا ہو۔لکھنوی شعراء نے اپنے اشعار میں جی بھر کر جنسی چٹخارے ڈالے۔ انہوں نے غزل کو جسم کی

① صفحہ ۴۲.

پکارا اور لذت الاعضاء بنا کر رکھ چھوڑا۔

رشید حسن خاں گزشتہ لکھنؤ کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''لکھنؤ میں ان دنوں شاعری کا چرچا حد سے بڑھا ہوا تھا، اکیلے لکھنؤ میں اتنے شاعر موجود تھے کہ اگر سارے ہندوستان کے شعراء جمع کئے جاتے تو ان کی تعداد لکھنؤ کے شاعروں سے بڑھ نہ سکتی تھی۔ میرؔ اور سوؔدا کی پرانی شاعری تقویم پارینہ ہو چکی تھی۔ اب ناسخؔ کی زبان اور آتشؔ کے خیالات دماغوں میں بسے ہوئے تھے جن میں رند و صبا کے رندانہ کلام اور نواب مرزا شوؔق کی مثنویوں نے شہوت پرستی کی روح پھونک دی تھی اور اسی مذاق کو بادشاہ کی طبیعت کا اصلی رنگ چاہتا اور پسند کرتا تھا''۔

اس ضمن میں رشید حسن خاں نے واجد علی شاہ کی جنسی مہمات کے شاعری میں بیان کرنے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یوں لکھا:

''اپنے بہت سے عشقوں اور اپنی عنفوان شباب کی صدہا رندانہ بے اعتدالیوں کو خود ہی موزوں کر کے ملک میں پھیلا دیا اور اخلاقی دنیا میں اقراری مجرم بن گئے۔ واجد علی شاہ کی طرح کسی نے اپنے ان بے شرمی کے جرائم کو خود ہی پبلک کے سامنے پیش نہیں کیا۔ اور یہاں تک ترقی کی کہ بعض موقعوں پر انہیں مبتذل، بازاری، بدمذاق اور فحش الفاظ کے استعمال میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ وہ کہاریوں، رنڈیوں، خواصوں اور محل میں آنے والی عورتوں، غرض صدہا عورتوں پر عاشق ہوئے اور چونکہ ولی عہد سلطنت تھے سو اپنے عشق میں خوب کامیاب ہوئے۔ جن کی شرمناک داستانیں ان کی نظموں، تحریروں اور تصنیفوں میں، خود ان کی زبان سے

سنی جا سکتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ تاریخ میں ان کا کیرکٹر سب سے زیادہ ناپاک اور تاریک نظر آتا ہے''۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں صاحب نے واجد علی شاہ سے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے، اس کا عملی نمونہ خود واجد علی شاہ کے کلام سے پیش کر دیا جائے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

جس روز کہ دن چھٹی کا آیا
مہمان ہر ایک کو بلایا
مہمان نکھر نکھر کے آئے
روپئے اپنے ہر ایک نے دکھائے
وہ ٹھاٹ ہر ایک کا اور وہ جوبن
وہ ناز و ادا وہ شوخ چتون
وہ قاتل ہوش بانکپن تھے
پامالی دل کے سب چلن تھے
وہ بیگموں کا کبھی اترنا
ارباب محل کا وہ نکھرنا
آپس میں گلے لپٹ لپٹ کر
کہتی تھی ہر ایک ماہ پیکر
آنکھیں مری ڈھونڈتی تھیں تجھ کو
پُچھوا بھی کبھی نہ بھیجا مجھ کو
اللہ رے رنڈی بے مروت

کیا تجھ سے ہوئی مجھ کو نفرت
مسی کا وہ لعل لب پہ جوبن
گلبرگ بنا تھا برگ سوسن
کاجل نہیں آنکھ میں تھا زنہار
ایک مست کے ہاتھ میں تھی تلوار
چھپکا وہ موتیوں کا سر پر
انجم ، شبِ تار میں منور
تھیں بالیاں کانوں میں جڑاؤ
یا بیٹھے تھے برگ گل پہ جگنو

اب ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

کمر دھوکا، دہن عقدہ، غزال آنکھیں، پری چہرہ
شکم ہیرا، بدن خوشبو، جبیں دریا، زباں عیسیٰ
برائے سیر مجھ سا رند میخانے میں گر آئے
گرے ساغر، لنڈھے شیشہ، ہنسے ساقی، بہے دریا

اس پر رہی سہی کسر ریختی کی خرافات نے پوری کر دی۔ ریختی کے معاملے میں اس قدر غلو بڑھا کہ بعض شعراء نے اپنے تخلص تک زنانہ کر لیے جیسے جمعیت علی ثریا، علی بیگ نازنین، عابد مرزا بیگم۔ ایک شاعر معراج میر یار علی خان المعروف جآن صاحب تو اس ضمن میں اس انتہا تک گئے کہ زنانہ لباس پہن کر، عورتوں کا سا سرخی پاؤڈر لگا کر، ڈولی میں سوار ہو کر زنانیوں کی طرح مشاعروں میں جاتے اور زنانہ انداز و اطوار بلکہ اداؤں کے ساتھ اپنی ریختی سناتے۔ گویا لکھنؤ کی تہذیب نے شاعری کی جنس تو خراب

کی ہی، ساتھ ہی شعراء کی جنس بھی خراب کردی۔ پھر شعراء ایسا کیوں نہ کرتے جب حکمران خود ان ساری خرافات پر عمل پیرا تھے۔

بقول عبدالحلیم شرر:

''نصیرالدین حیدر میں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہوگئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا سا لباس پہنتے تھے۔زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی (اثنا عشری) عقیدت نے یہ شان پیدا کردی تھی کہ ولادت ائمہ اثنا عشری کی تقریبوں میں خود حاملہ بن کر زچہ خانے میں بیٹھتے، چہرے اور حرکات سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرتے اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے جس کی ولادت، چھٹی اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیئے جاتے''۔①

شعراء نے یہی سب کچھ امراء سے سیکھا اور معاشرے میں شاعری کے نام پر فروغ دیا۔ رشید حسن خاں اس حالتِ زار کا رونا روتے ہوئے مثنویات شوق (صفحہ ۲۰) کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''جب شاہی محلات میں کم درجہ عورتوں کو بار عام مل سکتا تھا اور اس صورت میں ان عورتوں کے دوسروں سے ناجائز تعلقات ہوسکتے تھے تو اس سے معاشرہ کی عام حالت پر جو اثرات پڑ سکتے تھے، ان کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔حیدری بیگم نے واجد علی شاہ سے جب یہ کہا تھا:

کہا، حمل ثابت علی خاں کا ہے
خطا کی، خطا کام انساں کا ہے

① گزشتہ لکھنؤ۔

نہیں میں فقط ایک تقصیر وار
کہ اس دام میں اور بھی ہیں شکار ①

تو ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا تھا جس سے بہت سے لوگ باخبر تھے۔ اسی طرح نواب مرزا شوق فریب عشق میں یہ کہتے ہیں:

رنڈیاں گو کہ ساری آفت ہیں
بیگمیں اور بھی قیامت ہیں
کھلتا ہر اک پہ ان کا حال نہیں
کون ان میں ہے جو چھنا نہیں
ڈھونڈتی پھرتی خود حسین ہیں یہ
ہم سے دونی تماش بین ہیں یہ

تو معاشرے کی ایک ایسی تلخ حقیقت کو بیان کیا تھا جس سے لوگ بے خبر نہیں تھے لیکن اس کو بیان کرنے کی جراءت باقی نہیں رہی تھی۔②

شاعری کا ارتقاء: عشقِ حقیقی سے عشقِ مجازی تک:

لکھنوی تہذیب نے دلّی کی زاہدانہ و متصوفانہ شاعری کو کس طرح متاثر کیا، اسکا مفصل نقشہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی پی ایچ ڈی ڈگری کے لئے لکھے گئے اپنے مقالے لکھنؤ کا دبستان شاعری میں یوں کھینچا ہے:

''ایران کا یہ (مذہبی) رنگ لکھنؤ پہنچا۔ یہاں کے حکمرانوں نے شدید مذہبی ارادت کو اس حد تک تو نہیں پہنچایا جو صفویوں کے عہد میں برِ سرکار تھی لیکن نواب وزیر (حکمرانِ اودھ کے عہدے کا سرکاری نام) اور ان

① تذکرۂ شوق صفحہ ۳۶۔ ② صفحہ ۳۰۔

کے خاص محل کے ذاتی اثر نے اس عقیدے کو لکھنوی تمدن کا ایک نمایاں عنصر بنا دیا۔ مذہب کا اثر ایک اور جانب سے شاعری اور ادب پر پڑا، دلّی کی شاعری بالخصوص غزل میں تصوف کو بڑا دخل ہوا۔ (لیکن) مذہب اثنا عشری کے پیروؤں کو تصوف سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں تصوف کو غزل سے خارج کر دیا گیا۔ اس کا اثر شاعری کے حق میں کچھ اچھا نہ ہوا۔ دلّی کے صوفی منش شعراء نے عشق و عاشقی کے راز و نیاز بڑے پُر کیف و معنی خیز انداز میں نظم کئے تھے، ان کا معشوق اکثر حسن مطلق شاہد حقیقی ہوتا یا کم ازکم وہ ان مضامین کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ متانت کا پاس ضروری ہو جاتا تھا لیکن لکھنؤ نے عشقِ حقیقی پر عشقِ مجازی کو ترجیح دی اور اسی کے مضامین نظم کئے۔ عشقِ مجازی کی منزل عشق حقیقی نہ ہو تو وہ بہت جلد ہوسنا کی کی جگہ لے لیتا ہے۔

چنانچہ لکھنوی شعراء نے شعر و شاعری کی دنیا میں عشق و ہوسنا کی کے درمیان حد فاصل قائم کرنا ضروری نہ سمجھا۔ لکھنوی شاعری میں معاملہ بندی اور اس کے متعلقات اسی غلط روی کا نتیجہ ہیں۔ لکھنوی شعراء میں صرف ایک سلسلہ اس عام روایت کی پابندی سے آزاد نظر آتا ہے۔ یہ مصحفؔی کا سلسلہ ہے۔ عام لکھنؤ کے شعراء حسن مطلق سے کنارہ کش ہوئے تو ان کا جمالیاتی تصور بھی کچھ کا کچھ ہو گیا، چنانچہ بجائے ان کیفیات کے بیان کرنے کے جو حسن کے اثر سے دل پر گزرتی یا گزر سکتی ہیں، شعراء محض خارجی متعلقاتِ حسن کے گرداب میں پھنس گئے اور شاعری میں وہ آلودگیاں راہ پا گئیں جن کا اب ہر طرف ماتم ہے۔

مذہب کے اثرات کے بعض دوسرے پہلو بھی قابل لحاظ ہیں مثلاً اب تک مثنویوں میں عام طور پر حمد و نعت کے بعد ممدوح کی تعریف بیان کر کے اصل قصہ شروع

کردیا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی مثنویوں کا اکثر یہ انداز ہے کہ ائمہ کرام کی مدح کو بھی جزوضروری سمجھا گیا ہے۔ میرحسن، شنکرنسیم، شوق سب نے اس کا لحاظ رکھا ہے۔ مذہبی لٹریچر کا اک اور رنگ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ یہ عوام کا مذہبی لٹریچر ہے۔

جس طرح عوام اپنے عقاید میں بعض ایسے عناصر اور روایات شامل کر لیتے ہیں جن کی تاریخی سند کوئی نہیں ہوتی، اسی طرح یہ روایات بعض اوقات شعروادب میں بھی راہ پا جاتی ہیں، کربلا کے واقعات جو تاریخوں میں ملتے ہیں نہایت مختصر ہیں۔ لیکن مرثیوں میں ان کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں بہت سی ایسی باتیں بھی شامل کردی گئی ہیں جن کی بنیاد تخیل پر ہے۔ ان کی تفصیل انیس کی مرثیہ گوئی کے سلسلہ میں ملے گی۔

مذہب کے علاوہ شاعری پر معاشرت کی دوسری چیزوں کا بھی اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ لکھنؤ میں مذہب کے بعد سب سے اہم عنصر معاشی فارغ البالی تھا جس نے تعیش کا رنگ اختیار کرلیا تھا۔ اس فضا کی پیداوار کے بہت سے کارنامے یادگار رہیں مثلاً قیصر باغ کا مشہور میلا جس میں واجد علی شاہ کنہیا بنتے اور خوش شمائل عورتیں گوپیاں بن کر ان کو ڈھونڈتی پھرتیں اور اس تقریب میں شرکت کے لئے لکھنؤ کے رنگین مزاج جوق درجوق آتے اور محبت کی لگن دل میں لگا کر جاتے۔

قلق نے اپنے مشہور قصیدہ شہر آشوب میں لکھنؤ کے پرانے جلسے، خاص باغ، زرد کوٹھی، رہس منزل کی صحبتیں اور بے تکلف مجلسیں یاد کی ہیں۔ اسی فضا کی یادگار امانت کی اندرسبھا ہے جو اردو ڈرامائی نظم ونثر کا اولین نمونہ ہے۔ علاوہ واجد علی شاہ شاہی مجلسوں کے درگاہوں اور زیارتوں کے مجمعے بھی بڑے رنگین ہوتے تھے، ان کی تصویریں دیکھنا ہوں تو شوق کی مثنویوں میں بکثرت موجود ہیں اور معاشرت کی صحیح

آئینہ دار ہیں۔

ان رنگ رلیوں سے جو خرابیاں سوسائٹی میں پیدا ہوسکتی ہیں وہ سب لکھنؤ میں پیدا ہوگئیں، مثلاً نواب سعادت علی خان برہان الملک کی سپاہیانہ زندگی کے برعکس شجاع الدولہ کو حسین و مہ جبیں عورتوں کی صحبت پسند تھی اور وہ اپنا زیادہ وقت انہی کی صحبت میں گزارتے تھے بلکہ اکثر ڈیرہ دار طوائفیں ان کی ملازم تھیں اور دورہ تک میں ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کے درباری اور امراء بھی اس شوق کو معیوب نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ شاعری جس میں بگڑنے کے آثار پیدا ہو چلے تھے، ان کے اعمال ناموں کی سیاہی سے آلودہ ہوگئی۔ ایسی شاعری کا ایک خاص نام معاملہ بندی ہوا جس کے پردے میں بداعمال اپنی سیہ کاریوں کا اعلان کرنے لگے۔ اس حالت کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ اربابِ فضل وکمال کے ساتھ ساتھ دہلی کی پیشہ ور عورتیں بھی فیض آباد اور لکھنؤ آرہی تھیں، چنانچہ دریائے لطافت میں انشاءاللہ خاں نے بی نورن اور میر غضر غینی کی جو گفتگو نقل کی ہے، اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس فضا نے شاعروں کے خیالات اور ان کی زبان کو بھی آلودہ کر دیا اور اس حمام میں آکر لکھنؤ کے اچھے اور شریف خاندانی بزرگ بھی عریاں ہوگئے۔ رفتہ رفتہ ہزل گوئی اور فحاشی ایک مستقل صنف بن گئی۔ نواب اور رئیس زادے اپنا شوق پورا کرنے کے لئے ہزل گوئی کی باقاعدہ سرپرستی کرنے لگے۔

نسائیت (نسوانیت) اور فحش گوئی سے مل کر ریختی کی بنیاد پڑی، یہ ایسی صنف ہے جو اردو کے سوا دنیا کی کسی اور زبان کی شاعری میں موجود نہیں ہے۔ اس کا سلسلہ کچھ کچھ ہندی شاعری سے ملتا ہے کیونکہ ہندی شاعری میں بھی عورتوں کے جذبات انہیں کے محاورہ میں ادا کئے جاتے ہیں لیکن ریختی میں صرف عورتوں کی زبان کا لحاظ نہیں رکھا

جاتا بلکہ پیشہ ورعورتوں کے مبتذل جذبات بازاری اور عامیانہ زبان میں ادا ہوتے ہیں۔لکھنوی شاعری کے دور سے پہلے بھی ایک آدھ ریختی گوشاعر (مثلاً ہاشمی دکنی) کا نام ملتا ہے لیکن مستقل فن کی حیثیت اسے لکھنؤ میں آ کر ہی حاصل ہوئی۔ رنگینؔ اور جاؔن صاحب کے لئے خالص لکھنؤ کی فضا درکار تھی۔ عام شعراء جو ریختی نہیں کہتے تھے ان کے محاورہ میں بھی نسائیت پیدا ہوگئی اور رفتہ رفتہ شاعری کے خمیر میں شامل ہوگئی۔

تکلف اور تصنع کو لکھنوی تہذیب و معاشرت کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔لکھنؤ کے شعروادب سے اس کی تائید ہوتی ہے۔شعرائے لکھنؤ نے اپنی تمام تر توجہ شعر کی ظاہری صورت یعنی بیان کی اصلاح میں صرف کی ہے۔لکھنوی شعراء کے طبقہ اول میں ناسخ کو استاد سمجھا جاتا ہے۔ان کا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے اردوئے معلیٰ کو اردوئے مظلا بنادیا۔فصاحت کی جگہ بلاغت،سلاست وسادگی کی جگہ تصنع اور آہ کی جگہ واہ کو شاعری کی جان بنادیا۔ جب جذبات نگاری کو محض ثانوی درجہ دے دیا گیا تو خارجی مضامین کے بیان کو قدرتی طور پر فروغ ہوا۔

اب تک حسن اور اس کی کیفیات، اس کے اثرات اور کارفرمائی سے عشقیہ شاعری کی دوکان کی رونق تھی، اب حسن اور اس کے لوازمات پر عملِ جراحی کیا گیا۔ لب ودندان، رُخ وزلف، پنجہ مرمریں ودستِ حنائی کے مضامین شعرائے دہلی نے بھی باندھے تھے مگر جس تفصیل اور شرح کو لکھنؤ کے شعراء نے ملحوظ رکھا اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔صرف ایک ناسخ کے کلام میں ان تمام زیورات اور لوازماتِ آرائش کا ذکر موجود ہے جو اُس زمانے میں نسوانی حسن کی آراستگی کے لئے ضروری سمجھے جاتے تھے۔

لکھنؤ میں علوم وفنون متداولہ کے ساتھ ساتھ موسیقی اور رقص کو بھی فن شریف سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ خود واجد علی شاہ ان دونوں کے ماہر تھے۔ ان کا اثر اردو کی

ڈرامائی نظم پر جو ہوا ہوگا ظاہر ہے، امانتؔ نے اندر سبھا لکھی اگر چہ اندر سبھا کے متعلق تاریخی واقعات اب تک بحث طلب ہیں لیکن یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ واجد علی شاہ نے رہس کے قدیم نمونے پر ایک سبھا تیار کی تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس رہس کی تحریک میں ایک فرانسیسی شامل تھا، اس کی مدد سے مغربی اسٹیج کے تخیل نے قدیم رہس کے نمونہ پر بہت کچھ اضافہ کیا اور اگر چہ یہ بات اب تک اختلافی ہے کہ واجد علی شاہ نے خود کسی رہس میں کام کیا لیکن ان کی عاشقانہ طبیعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لوگوں نے لکھا ہے کہ واجد علی شاہ خود کنھیا یا راجہ اِندر بنتے اور گوپیاں یا پریاں ان کو ڈھونڈتی پھرتیں۔

مختصر یہ کہ لکھنؤی شاعری کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے عناصر کا تعلق براہِ راست لکھنؤ کے تمدن اور وہاں کی معاشرت سے ہے۔سطور بالا میں جو بحث کی گئی ہے اور جو نتائج اس سے مرتب ہوتے ہیں، مختصر طور پر اس طرح بیان کئے جاسکتے ہیں:

۱۔لکھنوی معاشعرت کا تعلق برہان الملک کے خاندانی حالات کی بناء پر ایرانی تمدن اور مذہب اثنا عشری سے تھا جس کا نتیجہ ایک طرف مرثیہ اور دوسری طرف ہرزیہ گوئی کی صورت میں ہوا۔

۲۔اثنا عشری عقیدہ نے تصوف کے مضامین کو شاعری سے خارج کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عارفانہ مضامین کا رواج اٹھ گیا اور عشق و ہوسنا کی کی حدیں مل گئیں۔

۳۔مذہبی غلو اور توغل نے علاوہ مرثیہ کے نعت اور منقبت پر بڑا اُبرا اثر ڈالا۔

۴۔معاشی فارغ البالی نے عاشقانہ مثنویوں اور غزلوں کے مضامین پر خاص اثر ڈالا۔

۵۔خاص حالات نے نسائیت پیدا کر دی جس نے شاعری میں معاملہ بندی واسوخت

اور ریختی کے رواج کو موقع دیا۔

۶۔تکلف اور تصنع نے رعایتِ لفظی اور خارجی مضامین کو رواج دیا۔

۷۔موسیقی اور رقص کے رواج نے ڈرامائی نظم کی بنیاد ڈالی۔

۸۔جن عناصر نے شعروشاعری پر ناخوشگوار اثر ڈالا تھا وہ سلطنتِ اودھ کے انحطاط کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتے چلے گئے①۔

فیض بخش مصنف فرح بخش لکھتے ہیں کہ

''فیض آباد کے اجڑنے کے بعد جب لکھنؤ بسا یا گیا تو اہل فضل وکمال کا جو سیلاب اب تک فیض آباد آرہا تھا وہ لکھنؤ کی طرف امنڈ پڑا۔لکھنؤ کے دارالسلطنت بنتے ہی میر حسنؔ، میر سوزؔ، مرزا رفیع سوداؔ، میر تقی میرؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، میر انشاء اللہ خاں انشاءؔ وغیرہ یہاں آ گئے۔باادب و باحیا پرانے شاعر تو زمانے کے ساتھ دنیا سے گزر گئے البتہ نئی نسل نے میدان خالی پا کر اپنا رنگ کھل کر کھیلا اور لکھنؤ کی شاعری کی ابتداء ہی حیاباختی اور بے ادبی سے ہوئی اور چونکہ بنیاد کج تھی اس لئے عمارت آخر تک کج ہی چلی گئی۔لکھنؤ کی شاعری پر سب سے پہلا اثر لکھنؤ کی معاشرت کا پڑا۔یہ وہ زمانہ تھا جسے سحرؔ نے اپنے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو
ہر اک گھر خانہ شادی ہے ہر ایک کوچہ ہے عشرت کا

جیسا کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا کہ

''دولت کی فراوانی اور فضا نے تعیش اور آزادی کی راہ دکھائی، تماش بینی

① ملخص از صفحہ ۳۹ تا ۴۹: لکھنؤ کا دبستان شاعری: ابواللیث صدیقی.

پر لوگ فخر کرنے لگے۔ شجاع الدولہ کے متعلق فیض بخش نے آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے کہ انہیں فطرتاً عورتوں کی صحبت پسند تھی۔ لہٰذا بازاری عورتیں اور ان کے گانے والے طائفے اس قدر کثرت سے تھے کہ کوئی محلہ یا کوچہ ایسا نہ تھا جہاں وہ موجود نہ ہوں اور مالی اعتبار سے ان کی حالت ایسی اچھی تھی کہ ان میں اکثر ڈیرہ دار تھیں اور ان کے ساتھ دو دو تین تین خیمے رہا کرتے تھے۔ نواب وزیر جب اضلاع کا دورہ کرتے تو ان کے ڈیرے بھی نواب وزیر کے ڈیروں کے ساتھ چلا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے فوجی حکام اور امراء بھی اعلانیہ بلاخوف رسوائی اپنے آقا و حکمرانوں کی نقل کرتے تھے۔ گویا یہ ایک حمام تھا جس میں سب ننگے ہو گئے تھے۔

چنانچہ یہاں کا ابتدائی شعر و ادب کا سرمایہ بھی اسی میلان کا آئینہ دار ہے۔ جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی متانت جو دہلوی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے، یہاں عنقا ہے۔ اس کی جگہ ایک نئے فن نے لے لی جسے معاملہ بندی کا نام دیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس فن میں دِلّی سے آئے ہوئے شیخ قلندر بخش جرأت پیش پیش تھے لیکن ان کے مذاق کی تسکین میں لکھنؤ کی فضا کو بڑا دخل تھا جس کے ماحول نے انہیں اس کا موقع دیا کہ وہ اپنے فطری جذبات اور میلانات کو نظم کریں اور عوام و حکمراں دونوں سے دادِ تحسین بٹوریں۔

اب جرأت کی کچھ جراتیں ملاحظہ ہوں ؎

کل واقفِ راز اپنے سے وہ کہتا تھا یہ بات
جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

اب ذرا رندؔ کی انگڑائیاں بھی دیکھ لیں۔

کھولئے شوق سے بند انگیا کے
لیٹ کے ساتھ نہ شرمایئے آپ

مسیحؔ کی مسیحائی بھی ملاحظہ ہو۔

ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آگئی
آج ہم عنقا کو لائے دام میں

اسی پر بس نہیں کرتے مسیحؔ اور پوری جرات سے ارشاد فرماتے ہیں۔

تیرے پستان پہ نظر آتا ہے عالم نور کا
اے پری روشن ہے گویا قمقمہ بلور کا

اس میدان میں انشاء اللہ خاں انشاؔء بھی کسی سے پیچھے نہ رہے اور فرما گئے۔

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت

امانتؔ کی طرف روئے سخن ہوتا ہے تو وہ بھی اسی گنگا میں ہاتھ دھوتے نظر آتے ہیں۔

مستی میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے
بہکا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا

اور ناسخؔ تو کمال ہی کر گئے۔

لکھوں کیا حال میں دیوانہ اپنی ناتوانی کا
ہوا طوقِ گراں گردن میں وہ چھلّا نشانی کا
دمکتا ہے جو کندن سا بدن ہر ایک حلقے سے

تری جالی کی کرتی میں ہے عالم کا مدانی کا

کس قدر صاف ہے تمہارا پیٹ

صاف آئینہ سا ہے سارا پیٹ

پہنے کرتی اگر وہ جالی کی

کرے ہر حلقہ کو ستارہ پیٹ

یہ ہیں اشعار و خیالات کی وہ جولانیاں جو اودھ کے تمدن کی سفلیت پر گواہی دیتی نظر آتی ہیں۔ اسی سلسلے میں نسائیت کا عنصر بھی شعر و ادب کا جزو بن گیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ

ہندی شاعری میں جذبات کی آگ کو دہکانے کے لئے عشق کا اظہار عورت کی طرف سے کرایا گیا اور قدرتی طور پر زبان اور خیالات عورتوں کے نظم ہوئے۔ اسی کی تقلید میں متقدمین شعرائے اردو نے اپنی داستانِ عشق صنف نازک کی آڑ لے کر ان کی زبان میں بیان کی ہے۔ شجاع الدولہ کے عہد سے حسین اور مہ جبین عورتوں کو سوسائٹی میں بڑا دخل ہوا۔ ادھر عیش و عشرت اور فراغت نے مردانہ جذبات اور خیالات کو کمزور کیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے جذبات و خیالات اور زبان پر نسائیت غالب آگئی۔ ریختہ کے جواب میں ریختی کو ترقی دے کر بے حیائی کی داستانیں بے شرمی سے نظم کی گئیں۔ ریختی کے ان نمونوں میں عورتوں کے جن جذبات کو ان کی زبان میں ان شاعروں نے نظم کیا وہ لکھنؤ کی معاشرت پر داغ بن کر آج بھی موجود ہیں۔

نسائیت یعنی نسوانیت کا اثر صرف ریختی کی صورت ہی ظاہر نہیں ہوا بلکہ عام خیالات، زبان اور محاورہ میں بھی نسائیت آگئی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا

جا سکتا ہے کہ فرہنگ آصفیہ، جو اردو کی ایک مستند لغت ہے، میں جہاں کسی خاص محاورہ کو بیان کیا ہے تو جان صاحب یا کسی ایسے شاعر کے کلام کو سند میں پیش کیا ہے جو عورتوں کے جذبات ان کی زبان میں ادا کرتے تھے۔ جبکہ تصنع اور بناوٹ کا یہ حال تھا کہ گویا پورا لکھنؤ اس کا چلتا پھرتا نمونہ بن چکا تھا جیسا کہ یادوں کی بارات میں جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"لکھنؤ کے وہ رؤسا، علماء، ادباء، شرفاء اور شعراء جو میرے باپ کے پاس آتے یا ان کے ہاں تشریف لے جایا کرتے تھے، اللہ اللہ وہ ان کے لچکیلے سلام، وہ ان کی نشست و برخاست کے پاکیزہ انداز، وہ ان کی تہذیب میں ڈوبی وضع قطع، وہ ان کے لباس کی انوکھی تراش خراش، وہ مسائل علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام، ان کے الفاظ کا ٹھہراؤ، وہ ان کے لہجوں کا کٹاؤ، اثنائے غزل خوانی میں وہ حسب مفہوم شعر، وہ ان کی آنکھوں کا رنگ اور ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ، وہ قہقہوں سے دامن کش، ان کا ہلکا ہلکا تبسم، وہ ان کے انکسار کے سانچہ میں ڈھلا ہوا وقار اور باوجود کمال وہ ان کا ہاتھ جوڑ جوڑ کر اپنی ہیچمدانی کا اعتراف، یہ ساری باتیں دیکھ کر میں نقش بہ دیوار ہو کر رہ گیا"۔①

بقول ڈاکٹر سلیم اختر جوش کی اس نثری نظم کا تجزیہ کریں تو حاصل کچھ نہیں، صرف آدابِ محفل کی بات ہے اور وہ بھی شاعرانہ اسلوب میں۔

الغرض بابِ شاعری کافی طویل ہو چلا جس کے لئے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں لیکن کیا کریں کہ بقول حالی شاعری معاشرے کو اتنا خراب نہیں کرتی جتنا

① صفحہ ۸۹.

معاشرہ شاعری کو خراب کر جاتا ہے۔ اور وہی کچھ درج بالا طویل مبحث میں ہم نے قارئین کو دکھانا چاہا ہے کہ کس طرح لکھنؤ کی بظاہر بڑی پُر تکلف وتہذیب والی لیکن بے راہ معاشرت نے اردو شاعری پر سفلی اثر ڈالا اور اس کو چلمن سے نکال کر انگیا اور چوٹی میں پھنسا کر رکھ دیا۔ اور اس میں بہت کچھ وجہ پُرتعیش زندگی اور حکمرانوں کی حکومتی معاملات سے نظراندازی بھی تھی۔حکومتی معاملات سے فارغ البالی نے جہاں حکمرانوں اور عوام کو شہوت پرستی پر لگایا وہیں شکم پرستی اور زبان کا چٹخارہ بھی لکھنوی تہذیب میں نمایاں ہوکر سامنے آیا۔

لکھنؤ کے رکابدار:

جس زمانے میں لکھنو، فیض آباد اور اودھ کی ریاستیں اپنے معاشرتی و معاشی عروج پر تھیں، اس وقت عیش ونشاط سے لے کر شہر کی تزئین و آرائش تک اور موسیقی ورقص سے لے کر کھانا بنانے تک ہر فن میں لکھنو اور اودھ اپنی ہم عصر ریاستوں سے کافی آگے نظر آتے ہیں۔لکھنو میں کھانا، خوش خوراکی کی سطح سے بلند ہوکر فنِ صنّاعی اور اختراع بن گیا تھا۔آج مغرب میں جس شخص کو ماسٹر شیف کہا جاتا ہے، لکھنو میں وہ رکابدار کہلاتے تھے۔

مسعود حسن رضوی نے لکھنو کے نقوش ماضی میں لکھا ہے کہ

> ''شاہی باورچی خانے کے ایک رکابدار سے جب بادشاہ نے یہ پوچھا کہ تم ارویاں کتنی طرح پکا سکتے ہو تو اس نے جواب دیا کہ اگر عالی جاہ حکم کریں تو سال بھر دونوں وقت ارویاں پکاؤں اور ہر مرتبہ نئی ترکیب یعنی ریسیپی سے بناؤں۔اسی طرح آگے جا کر مسعود حسن رضوی صاحب ایسے رکابدار کا ذکر کرتے ہیں جو مٹھائی کو اناروں کی صورت میں بناتا تھا جو کہ

اس قدر انار سے مشابہ ہوتی تھی کہ اس کو توڑنے پر دانے بھی اصلی اناروں کے سے نکلتے تھے مگر جب کھائیے تو پتہ چلتا کہ چھلکے اور دانے دو مختلف طرح کی خوش ذائقہ مٹھائیاں ہیں۔ ایک دوسرا رکابدار سوہن حلوے کی لوزیں ایسی نرم بناتا تھا کہ چھری سے بآسانی کٹ جاتیں لیکن اگر اسی لوز کو ہتھیلی پر رکھ کر الٹا چمچہ اس پر مار دیا جائے تو شیشے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتی''۔

اسی طرح مرزا جعفر حسین اپنی تحریر بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب، اپنے تہذیبی پس منظر میں لکھتے ہیں کہ

''لکھنو کے نواب سلیمان قدر کے خاندان کا تحفہ ماش کی کھچڑی تھی جس میں بادام کو باریک کاٹ کر چاول اور پستے باریک تراش کر ماش کی دال بنائی جاتی تھی۔ اس طرح یہ کھچڑی جو کہ ماش کی کھچڑی کہلاتی تھی لیکن اصل میں پستے بادام کی کھچڑی ہوتی تھی''۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے عبدالحلیم شرر کی کتاب گزشتہ لکھنو کے مقدمے میں اردو محاورے یہ منہ اور مسور کی دال سے متعلق کافی دلچسپ کہانی نقل کی ہے کہ

''لکھنو کے ایک نواب صاحب نے مسور کی دال پکانے کے لئے ایک رکابدار کو ملازمت پر رکھا۔ جس رات رکابدار نے دال پکا کر دسترخوان پر سجائی تو نواب صاحب نے اپنے تمام احباب کو ضیافت پر مدعو کر لیا۔ سب حضرات نے چٹخارے لے لے کر مسور کی دال کھائی اور خوب تعریفیں کیں۔ جب نواب صاحب نے دال تیار کرنے کے اخراجات کی تفصیل مانگی تو رکابدار نے ہزار ڈیڑھ ہزار روپے بتا دیئے جبکہ اس زمانے میں آنے

کے حساب سے سیروں دال مل جاتی تھی۔ اتنی رقم کا سن کر نواب صاحب قدرے ناراض ہو کر بولے کہ ایک دال پر تم نے اتنی رقم خرچ کر ڈالی۔ اس پر نک چڑھا رکابدار بولا: ہونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔ اللہ ہی جانے کہ یہ واقعہ درست ہے یا صرف محاورے کو غرض و غایت فراہم کرنے کے لئے گھڑا گیا ہے تاہم اس سے اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم لکھنو کے رکابداروں کی فنکاری اور ساتھ ہی نازک مزاجی تو یقیناً واضح ہو جاتی ہے''۔

ڈاکٹر سلیم اختر مزید لکھتے ہیں کہ

''دراصل لکھنو والوں نے خوراک کو اچنبھے کا تماشا بنا دیا تھا۔ جب انہوں نے سنگترے کو رنگترا، کیچڑ کو کیچ، ملائی کو بالائی، دہی کو دیہی اور حقہ کو حسن محفل کہا تو کھانوں کی مانند یہ بھی ایک نوع کا زبان کا چٹخارہ ہی تھا''۔

مرزا جعفر حسین بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب، اپنے تہذیبی پس منظر میں میں لکھتے ہیں کہ

''شہر لکھنو کا پورا ماحول موزونیت اور شعریت میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ہمارے سودا بیچنے والے بھی مسجع نثر یا موزوں نظم میں استعمالی اور خوردنی اشیاء فروخت کیا کرتے تھے۔ مجنوں کی پسلیاں اور لیلی کی انگلیوں والا ترانہ بھی لکھنو کے سبزی فروشوں کی ہی ایجاد ہے''۔

درندوں اور چوپایوں کی لڑائی:

بقول عبدالحلیم شرر جب لوگوں کو ملک گیری و صف آرائی سے فرصت ملی اور میدانِ جنگ میں کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگجوئی کے جذبات نے جانوروں کو لڑا لڑا کے جانبازی و خون ریزی کا تماشا دیکھنے کا مشغلہ پیدا کیا۔ یہ شوق یوں تو تھوڑا بہت

سب جگہ ہے مگر اس میں جس قدر انہماک اہل لکھنؤ کو ہوا اور ان بے نتیجہ بلکہ سنگدلی کی دلچسپیوں کو ان لوگوں نے درجۂ کمال کو پہنچا دیا اور مقامات کے لوگوں کے خواب وخیال میں بھی نہ گزرا تھا اور غور سے دیکھئے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس شوق اور ان مشاغل کے جیسے کرشمے اور دلکش تماشے سوا دلکھنؤ میں دیکھے گئے، دہلی یا ہندوستان کا کوئی دربار درکنار غالباً ساری دنیا کے کسی شہر میں نہ دیکھے گئے ہوں گے۔

اس کے بعد عبدالحلیم شرر گزشتہ لکھنؤ میں شیر کی لڑائی، چیتے کی لڑائی، تیندوے کی لڑائی، ہاتھی کی لڑائی، اونٹ کی لڑائی، گینڈے کی لڑائی، بارہ سنگھے کی لڑائی، مینڈھے کی لڑائی اور طیور کی لڑائی سب کی الگ الگ سرخی قائم کرکے نہایت دلچسپ حالات ومشاہدات قلم بند کرتے ہیں اور ساتھ یہ مرثیہ بھی روتے ہیں کہ لکھنؤ میں انتزاعِ سلطنت کے بعد بھی نواب محسن الدولہ بہادر کو مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔

وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

مرغ بازی:

ساتھ ہی لکھنؤ کی معاشرت میں امراء وعوام سب کے دیگر مشاغل کا ذکر بھی شررؔ مرحوم پورے تزک واحتشام کے ساتھ کرتے ہیں جن میں سرفہرست مرغ بازی ہے جس میں موصوف بتاتے ہیں کہ کس طرح حکمراں اور عوام اپنا پیسے لڑائی کے مرغوں کی پرورش وتربیت پر خرچ کرتے تھے۔ مرغوں کی لڑائی کا شوق لکھنؤ میں نواب شجاع الدولہ کے عہد سے واجد علی شاہ کے عہد تک برابر رہا۔ نواب آصف الدولہ کو مرغ بازی کا بے انتہا شوق تھا۔ یہاں تک کہ نواب سعادت علی خاں باوجود بیدار مغزی کے مرغ بازی کے اس قدر دلدادہ تھے کہ ان کے اس شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ

لکھنؤ کے امرائے دربار درکنار اس زمانے میں جو اہل یورپ یہاں موجود تھے، انہیں بھی یہی شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ جنرل مارٹن جن کی کوٹھی لکھنؤ کی ایک قابل دید عمارت تھی، وہ خود اول درجے کے مرغ باز تھے اور نواب سعادت علی خاں ان سے اپنے مرغ لڑائیاں کرتے تھے۔ یہ شوق واجد علی شاہ کے زمانے تک زوروں پر رہا۔ مٹیا برج میں نواب علی نقی خاں کی کوٹھی میں مرغوں کی پالی ہوتی تھی اور کلکتے سے بعض انگریز اپنے مرغ لڑانے کو لایا کرتے تھے۔

بٹیر بازی:

بٹیر بازی سے متعلق عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں کہ

> یہ شوق پنجاب کی رنڈیاں کے طفیل لکھنؤ میں وارد ہوا۔ پنجاب کے بعض کنچن لوگ جن کی عورتیں عصمت فروشی کا پیشہ کرتی ہیں، نواب سعادت علی خاں کے عہد میں وارد لکھنؤ ہوئے اور گھاگس بٹیر اپنے ساتھ لائے جن کو وہ لڑاتے تھے۔

عبد الحلیم شرر کے زمانے کی نامور رنڈیاں انہی لوگوں کی نسل سے تھیں۔ لکھنؤ میں بٹیر بازی کے شوق نے ایسے باکمال بٹیر باز پیدا کر دیئے تھے جن کی نظیر ملنا مشکل تھی۔ بٹیروں کے نام بھی بڑے شاندار رکھے جاتے تھے جیسے رستم، سہراب، شہرۂ آفاق وغیرہ۔ عبد الحلیم شرر کے زمانے تک میں ایک ایک ہزار روپیہ کی بازیاں لگتی تھیں ان لڑائیوں میں۔ بٹیر بازی کا شوق بھی لکھنؤ کے حکمرانوں میں بدرجہ اتم موجود تھا جس کی بین مثال نصیر الدین حیدر ہیں جو کہ اپنے سامنے میز پر بٹیروں کی لڑائی کروا کر بہت خوش ہوتے تھے۔

کبوتر بازی:

لکھنؤ میں کبوتر بازی اس خاندانِ فرمانروائی کے ابتدائی دور سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ نواب شجاع الدولہ کو کبوتروں کا بڑا شوق تھا۔ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں کو بھی یہ شوق تھا اور غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تو کبوتر بازی اپنی اعلیٰ ترین سطح پر پہنچ چکی تھی۔

الختصر وہ کون سی لذتِ دنیا نہ ہوگی جس سے لکھنوی معاشرہ خالی رہا ہو۔ اور اسی لذتِ دنیا میں ڈوب کر زوال کا کفن اوڑھ لیا گیا۔ منشی پریم چند نے اپنے افسانے شطرنج کے کھلاڑی میں اس زوال شدہ تہذیب کا کیا خوب مرثیہ پڑھا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''نواب واجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ عیش وعشرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے سب رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ کہیں نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں۔ کوئی افیون کی پینک کے مزے لیتا تھا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں رندی و مستی کا زور تھا۔ امورِ سیاست میں، شعروسخن میں، طرزِ معاشرت میں، صنعت وحرفت میں، تجارت وتبادلہ میں سبھی جگہ نفس پرستی کی دہائی تھی۔ اراکینِ سلطنت مے خواری کے غلام ہو رہے تھے۔ شعراء بوس وکنار میں مست، اہل حرفہ کلابتوں اور چکن بنانے میں، اہلِ سیف تیتر بازی میں، اہلِ روزگار سرمہ ومسّی، عطر وتیل کی خرید وفروخت کا دلدادہ، غرض سارا ملک نفس پروری کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ساغر وجام کا نشہ چھایا ہوا تھا۔

دنیا میں کیا ہو رہا ہے، علم وحکمت کن کن ایجادوں میں مصروف ہے، بحر وبر

پر مغربی اقوام کس طرح حاوی ہوتی جاتی ہیں، اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ بٹیر لڑ رہے ہیں، تیتروں میں پالیاں ہو رہی ہیں، کہیں چوسر ہو رہی ہے، پو بارہ کا شور مچا ہوا ہے، کہیں شطرنج کے معرکے چھڑے ہوئے ہیں۔فوجیں زیر و زبر ہو رہی ہیں۔نواب کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ہاں گتوں اور تالوں کی ایجاد ہوتی تھی۔حظِ نفس کے لئے نئے لٹکے نئے نئے نسخے سوچے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ فقراء خیرات کے پیسے پاتے تو روٹیاں خریدنے کے بجائے مدک اور چنڈو کے مزے لیتے تھے۔ رئیس زادے حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اربابِ نشاط سے تلمذ کرتے تھے۔فکر کو جولاں، عقل کو رسا اور ذہن کو تیز کرنے کے لئے شطرنج کیمیا سمجھا جاتا تھا"①۔

مذہبی تشدد پسندی:

اس تمام عیش و نشاط کے باوجود مذہب کے معاملے میں حکمران طبقہ انتہا پسندی پر مائل ہی نظر آتا ہے۔ بقول مؤلفِ گل رعنا مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ:

"نواب آصف الدولہ کے زمانہ کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لہو ولعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں انہوں نے دل سے کوشش کی۔ان کے نائب حسن رضا خاں بھی مذہبی آدمی تھے۔ وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ان کی کوششوں سے ہزاروں خاندان سُنّی سے شیعہ ہو گئے اور ان کو جاگیریں ملیں، جو اپنی ضد پر قائم

① شطرنج کے کھلاڑی صفحہ ۱۷۔

رہے ان کی جاگیریں جو شاہانِ مغلیہ کے وقت سے چلی آتی تھیں ضبط کرلی گئیں۔شاہ اکبر چشتی مودودی کے مشورے اور مُلاّ محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ و جماعت قائم کرکے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کی اقتداء میں ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کی۔ یہ پہلا دن ہے کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علیحدہ کرلئے اور نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے ہاتھ میں زمامِ مذہب دے دی''۔①

اسی بات کی طرف محترم نجم الغنی خان اپنی تالیف مذاہب الاسلام مطبوعہ ۱۹۱۳ میں اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ریاست اودھ جب تک قائم رہی اعلانیہ تشیع میں بڑا غلو رہا۔اس کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ میر حیدر بخش نائب آفرین علی خان نے صحابہ (خلفائے ثلاثہ) کے نام لکھ کر فرش تلے بچھوادیئے تاکہ پائمال ہوں۔امجد علی ثریا جاہ کو مذہب اثنا عشریہ میں نہایت غلو تھا۔ان کے عہد میں مذہبِ شیعہ نے خوب رونق پائی تھی۔سنت جماعت کا شمار ہنود میں تھا (طلسم ہند) اودھ کے پچھلے بادشاہ واجد علی شاہ نے اپنی ایک تالیف کے صفحہ ۲۰۴ میں جس کا نام مجموعہ واجد یہ ہے لکھا اسامی ملعوناں وملعونات کہ تا قیامت برآنہا لعنت باید کرد اور اس کے بعد تین صفحے اصحاب کبار وغیرہ کے ناموں سے بھر دیئے ہیں جن میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، بی بی عائشہ وغیرہ شامل ہیں''۔②

---

① صفحہ ۱۵۳۔ ② صفحہ ۴۷۰۔

الغرض ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ ابتدائیہ کافی طویل ہو چلا جب کہ ہمارا ارادہ اس قدر طوالت کا نہ تھا لیکن کیا کریں کہ شیعیانِ ہند کی داستانیں اس قدر دلپذیر ہیں کہ ایک دفعہ یہ سلسلہ شروع کر دیا جائے تو ختم کرنے کا دل ہی نہیں کرتا۔ خیر اب ہم اپنے قلم کو روکتے ہیں اور قارئین کو دعوت دیتے ہیں کہ کتابِ ہذا میں مندرج آگے آنے والے مقالات کا مطالعہ کریں اور ہندوستان کی تاریخ کو ایک مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا تجربہ حاصل کریں۔

اس کتاب میں ہم نے کوشش کرکے موضوع سے براہ راست تعلق رکھنے والے مقالات کو شامل کیا ہے جو کہ مختلف اہلِ علم کے قلم و تحقیقی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ان مقالات میں سے کچھ بیانات ہم عصر مؤلفین کے بھی ہیں اور کچھ ایسے حضرات کے جو ہم عصر تو نہ تھے تاہم انہوں نے ہم عصر مؤلفین کی کتب سے استفادہ کرکے اپنے مضامین کو مرتب کیا ہے۔ سو اس طرح سے ان تمام مقالات کو ایک استنادی حیثیت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

یہاں ہم اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ ابتداء میں ہمارا ارادہ تھا کہ ان تمام مقالات کو ایک جلد میں سمو کر ہدیۂ قارئین کیا جائے، لیکن اس سے یہ احساس ابھرا کہ شاید کتاب کچھ ضخامت کا شکار ہو جائے جس سے عموماً موجودہ زمانے کے قارئین دِقّت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سو اسی سبب مضامین کی مناسبت سے کتاب کو دو جلدوں میں تقسیم کرکے شائع کیا جا رہا ہے۔

پہلی جلد میں خاص سلطنت اودھ اور وہاں کے سیاسی و مذہبی پس منظر سے مطابقت رکھنے والے مضامین کو یکجا کیا گیا ہے جو کہ دراصل منشی عبدالاحد رابط (متوفی ۱۳۶۸ھ) کی فارسی کتاب وقائع دلپذیر کا اردو ترجمہ ہے۔ منشی عبدالاحد رابط نے یہ کتاب اس زمانے میں تالیف کی تھی جب وہ لکھنؤ ریزیڈنسی کے دفتر میں سررشتہ داری

کے عہدے پر مامور تھے۔ یہ کتاب انہوں نے اپنے افسر بالا مسٹر شیکسپیئر اسسٹنٹ ریزیڈنٹ کے ایما سے ۱۸۳۷ء میں لکھی تھی۔

پورے سو سال کے بعد یعنی ۱۹۳۷ء میں اس کتاب کا فارسی مخطوطہ جناب محمد تقی احمد ایم اے ایل ٹی کو مہاراجہ بلرام پور کے ذاتی کتب خانہ میں دستیاب ہوا تو انہوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بنام بادشاہ بیگم اودھ کر کے شائع کیا۔ بعد میں یہی شائع شدہ کتاب علامہ محمود احمد عباسی رحمہ اللہ کو ملی تو انہوں نے اس کا اردو ترجمہ جناب سراج احمد عثمانی مرحوم سے بنام وقائع دلپذیر۔ بادشاہ بیگم اودھ کے نام سے کروا کے شائع کیا جو کہ آج تک متداول ہے۔ محمود احمد عباسی رحمہ اللہ کا شائع کردہ نسخہ پرانے طرز کی کتابت پر مشتمل ہے جو کہ چھوٹی تقطیع کی کتاب پر الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ سے شائع ہوتا رہا ہے۔

اب چونکہ پرانی طرز کی کتابت والی کتابیں پڑھنے کا رواج ختم ہو چکا ہے، سو اس قیمتی علمی و تاریخی سرمائے کی بازیافتی کی غرض سے اس کو جدید طرز طباعت کے تحت شائع کیا جا رہا ہے اور اسی سلسلے میں یہ کتاب آج آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اسی مضمون سے مناسبت رکھتے کچھ اور مضامین بھی دستیاب ہوئے جو کہ متفرق اور پرانے طرز کی کتابت کے تحت شائع ہوتے رہے ہیں اور آج کل تقریباً ناپید ہیں، جن میں ہندوستان کی مذہبی تاریخ سے متعلق مولانا ایوب قادری کا مضمون، حکیم فیض عالم صدیقی شہید کی کتاب حقیقت مذہب شیعہ، جو کہ عرصہ سے ناپید ہے، کے ہندوستان میں شیعیت کے فروغ سے متعلق مضامین اور شیخ محمد اکرام کی کتاب رودِ کوثر کے متعلقہ مباحث شامل ہیں۔ ان سب مضامین کو یکجا کر کے اسی کتاب کی دوسری جلد میں شامل کیا جا رہا ہے۔

گویا اس طرح پہلی جلد خاص سلطنت اودھ کی مذہبی و سیاسی تاریخ سے بحث کرتی ہے تو جلد دوم ہندوستانی کی مذہبی و سیاسی تاریخ سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ قارئین اس کتاب کی دونوں جلدوں کو ہندوستان کی تاریخ سے متعلق کتب کی فہرست میں ایک گرانقدر اضافہ پائیں گے۔

اس کتاب کی طباعت کے سلسلے میں سب سے اول اس اللہ عز وجل کے حضور شکرگزار ہوں کہ اس مالک نے اس احقر کو اس قابل بنایا کہ وہ یہ کام کر سکے۔ اگر اس کی مدد شاملِ حال نہ ہوتو کوئی کام ممکن نہیں۔ اسی کے کرم سے یہ کام ہوسکا ہے اور اس کام کی ہر اچھائی صرف اسی ذاتِ باری تعالیٰ کے سبب سے ہے۔ اس مالک کُل کے شکریہ کے بعد اپنے عزیز دوست محترم راشد جمال، محمد صہیب نذیر اور بلال احمد راؤ کا شکریہ ادا کروں گا کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچنا ناممکن تھا۔ ان کی ہمت اور ساتھ رہا کہ یہ کام ہوسکا۔ اللہ اس دوستی اور ساتھ کو ہمیشہ بنائے رکھے۔

اسی طرح اس کتاب کی اشاعت میں اور بھی چند احباب کی خصوصی مدد شاملِ حال رہی لیکن کیا کروں ان کی درویشانہ صفت کا کہ انہوں نے اپنے ناموں کا تذکرہ کرنے سے سختی سے منع کر رکھا ہے، اسی لئے ان کا نام لئے بغیر ہی ان کی جناب میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

کسی بھی کام میں کمال صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو ہی سزاوار ہے، مخلوق کا کام تو غلطیوں سے پُر ہوتا ہے۔ پھر بھی اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں کوئی غلطی کوئی کمی نہ رہ جائے، تاہم اس کے باوجود اگر کوئی کمی یا غلطی رہ جائے تو قارئین سے التماس ہے کہ اس بابت مطلع فرمائیں، ان شاء اللہ ایجابی طریق سے آئی ہر تنقید کو سرآنکھوں پر رکھا جائے گا۔

محمد فہد حارث　　　　دبئ، متحدہ عرب امارات

۱۲ جولائی ۲۰۱۹ء بمطابق ۰۹ ذی القعدہ ۱۴۴۰ ہجری

انتساب

اپنے ندیمِ خاص جناب محمد صہیب نذیر کے نام

کہ جن کے ہمت دلانے سے قلم وقرطاس کی دنیا میں قدم رکھنے کی ہمت کر پایا اور زندگی کے اخلاقی شعبوں سے متعلق جن سے بہت کچھ سیکھنا کو ملا۔

وقائع دل پذیر

بادشاہ بیگم اودھ

مُقَدِّمَۃ

ازمحترم محمود احمد عباسی

مصنف و زمانہ تصنیف:

مصنف اس کتاب کے منشی عبدالاحد ① رابط تخلص مرزا نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے پورے دس سالہ عہد حکومت میں جو ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک رہا تھا لکھنؤ ریزیڈنسی کے دفتر میں سرشتہ داری کے عہدے پر مامور رہے تھے اور اس تعلق سے انہیں ان سب حالات وواقعات سے کماحقہ واقفیت تھی جو بادشاہ بیگم اور ان کے سوتیلے بیٹے مرزا نصیر الدین حیدر کے باہمی تنازعات اور محلاتی زندگی کے متعلق اس کتاب میں تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔

فلسفہ تاریخ کے مسلمہ اصول کے اعتبار سے ایک ہم عصر کے بیان کو استناد کا درجہ حاصل ہوتا ہے بادشاہ اور بیگم کے ہم عصر ہونے کے علاوہ مصنف موصوف کو شاہی فرامین ومراسلات اور ان کے متعلقہ تمام ریکارڈ پر دسترس تھا جو دفتر ریزیڈنسی میں ان

① مولوی عبدالاحد رابطؔ ولد مولوی محمد فائق متوفی ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۱ء قصبہ امیٹھی کے متوطن تھے جو اَب ضلع سلطان پور میں شامل ہے ان کے بیٹے منشی تفضّل حسین بزمانہ واجد علی شاہ میر منشی دفتر فارسی ریزیڈنسی تھے۔ واجد علی شاہ اودھ کے زمانہ میں جب اجودھیا کے بیراگیوں نے وہاں تاریخی مسجد کو منہدم کر دیا تھا اسی قصبہ امیٹھی کے صوفی منش مولوی امیر علی رحمہ اللہ نے اپنی مختصر جماعت کے ساتھ جہاد کیا تھا شیعہ بادشاہ اور اس کی حکومت قطعاً بے تعلق رہی تھی مجاہدین کو اپنی قیمتی جانیں حمیت مذہبی میں نثار کرنی پڑیں مولوی امیر علی نے اپنے مقتول ہونے کی تاریخ پہلے سے کہہ دی تھی۔

شنو تاریخ من قبل از شہادت
سر میدان کفن بردوش دارم / ۱۲۵۷ھ

ہی کی تحویل میں رہتا تھا۔ یہ کتاب بھی انہوں نے اپنے افسر بالا مسٹر شیکسپیئر اسسٹنٹ ریزیڈنٹ کے ایما سے ۱۸۳۷ء میں اسی زمانہ میں لکھی تھی جب ریذیڈنسی کے افسروں نے نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے بارے میں بادشاہ بیگم کے غلط اقدام کو ناکام کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ غرض یہ کہ کتاب نوابی عہدی ہی کی تصنیف ہے جو اسی زمانہ میں مستند مان لی گئی تھی۔ بعض ہم عصر مؤلفین قیصر التواریخ وغیرہ نے اخذ مطالب بھی اس سے کیا ہے اور کرنل سلیمن کی کتاب ''سلطنت اودھ کے اندر سفر'' کے بعض مندرجات سے مصنف کے بیان کی تطبیق بھی ہوتی ہے۔

انگریزی ترجمہ اور نام کتاب:

مصنف نے کتاب فارسی میں تصنیف کی تھی جو اس زمانے میں عام طور سے مروج تھی۔ نام ''وقائع دل پذیر'' رکھ کر یہ بھی لکھ دیا تھا کہ مصنف کے نام کا اضافہ کر کے ''وقائع دل پذیر عبدالاحد'' کہا جائے تو بقاعدے ابجد اس سے تکمیل کا سال ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) نکل آئے گا پورے سو سال بعد یعنی ۱۹۳۷ء میں محمد تقی احمد ام۔اے۔ ایل۔ ٹی کو مہاراجہ بلرام پور کے ذاتی کتب خانہ میں جب فارسی مخطوطہ کتاب کا دستیاب ہوا انہوں نے انگریزی ترجمہ اس کا ''تاریخ بادشاہ بیگم'' نام سے شائع کیا۔ اصل نام وقائع دلپذیر شاید اس لیے ترک کر دیا ہو کہ جو حالات وواقعات بیان ہوئے ہیں دل پذیر تو کجا نہایت دل سوز وحیا سوز ہیں۔

ہمیں فارسی نسخہ تو اس کتاب کا دستیاب نہیں ہوا محمد تقی احمد کے انگریزی ترجمہ ہی کو اردو لباس پہنایا گیا ہے البتہ انگریزی کے مترجم نے اپنی دوسری تالیف ''آخری تاجدارِ اودھ'' میں فارسی نسخہ کی وہ عبارت نقل کر دی ہے جس میں بادشاہ اودھ کا اپنے اماموں کے یوم ولادت پر حاملہ عورت کا پارٹ ادا کرنے، بچہ جننے اور چھٹی نہانے

وغیرہ خرافات کا بیان ہے چنانچہ یہ فارسی عبارت یہاں اس غرض سے درج کی جاتی ہے کہ اردو ترجمہ کی عبارت سے مطابقت کر کے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ بعض مترادف الفاظ کے حذف کرنے کے سوائے انگریزی ترجمہ میں نفس مضمون کا کوئی تغیر نہیں کیا گیا۔ وہ فارسی عبارت جس سے مصنف کی علمی قابلیت کا بھی قدرے اندازہ ہوتا ہے حسب ذیل ہے:

''دہرگاہ روز ولادت کدام امام فرخندہ فرجام رسیدے مثل زنانِ باردار خودرابدروزہ وطلق ومخاض ازراہ تصنع مبتلا ساختے وبجائے طفل یک لعبت مرصع پیشش می گذاشتند وخوددرزچہ خانہ می نشتند وپرستاراں مخصوصہ ایں خدمت طعامے راکہ برائے زچہ معین است بکمال احتیاط پختہ می خورانید ندو درآں ایام کسے آنحضرت رامس نمی ساخت وہرگاہ ششم روز می شد آنحضرت غسل می فرمودند وپرستارے آں طفل جواہر نگار رابیک گوشہ بردہ بدست گرفتہ می ایستادد پرستار دیگر سبو چہ آب رادرآنجا فرومی ریخت ایں را بجائے غسل طفل قرار دادہ بودند وقت شب بہ آرایش وپرایش زنانہ آں طفل رادرآغوش گرفتہ

مثل زنان نو زادہ برائے ستارہ بینی کہ رسم اہل ہند است درصحن مکان باکمال شوکت وشان برمی آمدند

وہم چنیں برائے ہریک ازواج مقرری آئمہ احد عشر طفلے ازلعبت زریں وبرائے ازواج دیگر پیشوایانِ دین مبین طفلے ازلعبت سیمیں بحفظ مراتب بود ہرگاہ ایام ولادت دیگر امام زادگاں سوائے ائمہ احدی عشرے رسیدے ازواج مسطورہ برطرفہ معمولی حضرت سلطنت مرتبت آنہارا

زائیدے وبروز فراغ از چھوتھ لباس زنانہ زیب قامت سلطانی ساختہ مثل زنان درمحفہ جواہر نگار نشستہ۔①

بعض دوسرے مؤلفین نے بھی بادشاہ بیگم وشاہ اودھ کی ان خرافات کا تذکرہ (جن کی بدولت انہوں نے مذہب کو بازیچہ اطفال بنا رکھا تھا) مجملاً کیا ہے۔

مولانا شررؔ مرحوم نے اپنے بزرگوں سے چشم دید حالات سن کر ہی لکھا تھا:

''بادشاہ بیگم کی جاہلانہ اور امیرانہ مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں جن کی وجہ سے صرف اسی قدر نہیں ہوا کہ بادشاہوں اور امیروں میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیاں پیدا ہوئیں بلکہ لکھنؤ کی شیعیت ساری دنیا کی شیعیت سے نرالی اور عجیب ہوگئی سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امام (مہدی) صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی۔

ہندوؤں کی جنم اشٹمی کے رسوم کے موافق پورا زچہ خانہ مرتب کیا جاتا اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدوں کی خوبصورت لڑکیاں لے کے ائمہ اثنا عشر کی بیبیاں قرار دی گئیں جن کا نام اچھوتیاں رکھا گیا اور جب وہ اماموں کی بیبیاں تھیں تو پھر ان کے ہاں اماموں کی ولادت بھی ہوتی اور بارہوں اماموں کی ولادت کی تقریبیں بڑے کروفر کے ساتھ منائی جاتیں۔②

بادشاہ نصیر الدین حیدر کے حالات کے ضمن میں مولانا شررؔ نے مزید لکھا ہے جس سے اس کتاب کے بیان کی تائید ہوتی ہے:

---

① وقائع دل پذیر مصنفہ عبد الاحد رابطؔ۔
② گزشتہ لکھنؤ۔

''نصیر الدین حیدر بادشاہ میں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں کا لباس پہنتے۔زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ ائمہ اثنا عشر کی فرضی بیبیاں (اچھوتیاں) اوران کی ولادت کی تقریبیں جو اِن کی ماں نے قائم کی تھیں ان کو اور زیادہ ترقی دی یہاں تک کہ ولادت ائمہ کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کے زچہ خانے میں بیٹھتے۔چہرے اور حرکات سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرتے اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے جس کے لیے ولادت، چھٹی اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے۔ یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انہیں سے فرصت نہیں ملتی تھی سلطنت کی طرف کون توجہ کرتا۔

نصیر الدین حیدر کی نسبت لکھنؤ کے معتبر پرانے لوگوں کا بیان ہے کہ اس زنانہ مزاجی اور طفلانہ حرکتوں کے ساتھ نہایت ہی ظالم بھی تھے لیکن چونکہ ساری زندگی عورتوں میں بسر ہوئی تھی ان کے مظالم کا شکار بھی زیادہ تر عورتیں ہی ہوتیں۔ بیسیوں عورتوں کو ادنیٰ قصور اور معمولی بدگمانی پر دیواروں میں چنوا دیا۔

نصیر الدین حیدر لاولد مرے تھے۔منا جان کو غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر دونوں نے ان کے نسل شاہی ہونے سے انکار کیا تھا اسی بنا پر گورنمنٹ انگریزی نے نواب سعادت علی خاں مرحوم کے بیٹے نصیر الدولہ محمد علی خاں کی تخت نشینی کا پہلے سے بندوبست کر لیا تھا مگر بیگم صاحبہ نے نہ مانا۔ منا جان کو لے کے لال بارہ دری یعنی تخت گاہ میں آ گئیں۔

ریزیڈنٹ نے ہزار روکا اور سمجھایا مگر ایک نہ سنی اور زبردستی مناجان کو تخت پر بٹھا دیا جنہوں نے تخت پر قدم رکھتے ہی نذریں لیں اور اپنے دشمنوں سے فوراً بدلہ لینا بھی شروع کر دیا۔ بہتوں کے گھر لٹوائے بعض کو گرفتار کر لیا بعض قتل ہوئے اور شہر میں ایک ہڑبونگ مچ گیا''۔①

نصیر الدین حیدر نے یہ بدعت بھی شروع کی تھی کہ شیعہ اماموں کی ولادت کی تقریبوں کے علاوہ اماموں کی وفات کے دن ان کے جنازے تیار کرا کے اور نمازِ جنازہ باقاعدہ پڑھ کے دفن کیے جاتے تھے۔ ایک مجتہد نے ایسے جنازے کی نماز پڑھنے سے البتہ انکار کر دیا تھا۔

محمد تقی احمد نے اپنی دوسری کتاب میں ''مبلغ'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

''نصیر الدین حیدر نے امام حسین علیہ السلام کا ایک مصنوعی جنازہ تیار کیا اور حضرت سلطان العلماء کو نماز جنازہ کے لیے طلب فرمایا انہوں نے قطعی انکار کیا اور کہا کہ میری کیا ہمت، امام کی نماز جنازہ امام ہی پڑھ سکتا ہے''۔

الغرض مصنف کتاب نے اودھ کے شاہی خاندان کی مذہبی، اخلاقی اور محلاتی زندگی کا جو مرقع نواب سعادت علی خاں کے زمانے سے نصیر الدین حیدر کے ایام تک کا پیش کیا ہے اور شیعی ذہن کے تراشیدہ مذہبی رسوم اور شیعی مذہب کی تشبیہی و تجسیمی بدعات وخرافات کی تفصیلات تاریخی واقعات کے ضمن میں درج کی ہیں وہ کب سے، کن علل واسباب سے اور کس ماحول کی پیداوار تھے اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے سلطنت اودھ کے بانی مبانی اور سابق حکمرانوں کی اخلاقی و مذہبی کمزوریوں لغزشوں اور بدفعلیوں کے کوائف کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جن کے اثراتِ بد نے اس خراب و نکمّے

① گزشتہ لکھنؤ ص ۵۵، ۵۶۔

ماحول کو جنم دیا تھا۔

رياست اودھ:

بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں سلطنت مغلیہ کے کھنڈروں پر جو چھوٹی بڑی ریاستیں ملک کے مختلف صوبوں اور خطوں میں قائم ہوئیں ان ہی میں یہ ریاست بھی تھی جو تقریباً ایک سو چالیس بیالیس برس قائم رہی۔ دس اشخاص ایک ہی خاندان کے یکے بعد دیگرے فرمانروائے ریاست ہوئے۔

پہلی سو سالہ مدت میں پانچ فرمانروا ہوئے جو''نواب وزیر اودھ'' کہلائے اور آخر کے اکتالیس بیالیس سال میں بھی پانچ ہی حکمران ہوئے جو کہلائے تو بادشاہ مگر تھے حقیقت میں انگریزوں کی بساط سیاست کے شاہ شطرنج کی مانند، پھر ان ہی انگریزوں کے ہاتھوں اس نام کی بادشاہت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔فرمانروایانِ ریاست کی ترتیب اس شجرے میں ملاحظہ ہو جو اسی کتاب میں درج ہے۔

سلطنت اودھ شیعہ سلطنت تھی۔مسٹر ہالسٹر مصنف شیعیان ہند لکھتے ہیں:

''اورنگ زیب (بادشاہ) نے دکن کی شیعہ سلطنتوں کو جب زیر کر لیا تو ایک اور سلطنت شیعہ حکمرانوں کی شمالی علاقے میں قائم ہوئی۔یعنی سلطنت اودھ جس کا دارالخلافہ لکھنؤ رہا اس سلطنت نے شیعیت کے متعلق لاینفک طور سے جو دلچسپی لی نیز مغل سلطنت اور آج کی شیعیت میں اس کا جو رابطہ رہا ان دونوں وجوہ سے شیعیان ہند کی داستان میں اودھ کی شیعیت کا مختصر تذکرہ مناسب ہے''۔①

① شیعانِ ہند ص ۱۵۱.

شجرہ نوابانِ اودھ

۱۷۲۴ء تا ۱۸۵۶ء (۱۳۲ سال)

۱۔ بانی ریاست نواب برہان الملک سعادت خان نیشاپوری

۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۴ء تا ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۹ء (۱۶ سال)

۲۔ نواب صفدر جنگ منصور علی خان شوہر۔ صدر النساء بیگم دختر

۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۹ء تا ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۳ء (۱۶ سال)

۳۔ نواب شجاع الدولہ مرزا جلال الدین حیدر

۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۳ء تا ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۵ء (۲۱ سال)

۴۔ نواب آصف الدولہ مرزا یحییٰ عرف مرزا آمانی

۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۵ء تا ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء (۲۲ سال)

۵۔ نواب① یمین الدولہ مرزا سعادت علی خان پسر شجاع الدولہ

۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء تا ۱۲۲۹ھ/ ۱۸۱۴ء (۱۶ سال)

۶۔ غازی الدین حیدر بادشاہ

۱۲۲۹ھ/ ۱۸۱۱ء تا ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۷ء

۷۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ

۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۷ء تا ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء

۸۔ محمد علی پسر سعادت علی خان

۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء

① آصف الدولہ کے نطفے سے تو کوئی اولاد نہیں تھی ایک غریب علوی کے لڑکے وزیر علی کو متبنیٰ کیا تھا وہی ان کے مرنے کے بعد جانشین ہوا مگر تھوڑے عرصہ بعد معزول کیا گیا۔

۹۔امجد علی شاہ

۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء

۱۰۔واجد علی شاہ

۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء

اب اوّل کے پانچ نوابانِ اودھ کے مختصر حالات اور سیرت وکردار کی مجمل کیفیت ملاحظہ ہو:

۱۔برہان الملک:

محمد امین نام، وطن آبائی نیشاپور (خراسان) مسلکاً شیعہ اور نسباً شیعوں کے ساتویں امام جناب موسیٰ رحمہ اللہ کے ایک فرزند زید کی نسل میں بتایا جاتا ہے①

① برہان الملک جناب موسیٰ یا کسی دوسرے شیعہ امام کی نسل ہوں یا نہ ہوں۔اس کی تائید وتردید ہمارا مقصد نہیں لیکن جو شجرہ نسب ان کا مؤلف تاریخ اودھ نے تحفہ شاہیہ ووزیر نامہ وعماد السعادت وقیصر التواریخ کے حوالہ جات سے درج کیا ہے اور ۲۴ واسطوں سے جناب موسیٰ کے فرزند زید سے سلسلہ نسب ملایا ہے وہ محض غلط اور وضعی ہے۔اول تو زید بن موسیٰ بن جعفر الصادق کو جو زید النار کہلاتے تھے مستند نسابین نے غیر معقب بتایا اور لکھا ہے۔''زيد بن موسى لم يعقب'' (عمدۃ الطالب) یعنی زید بن موسیٰ سے نسل باقی نہیں پھر یہ کہ ان زید کے صرف چار بیٹے حسن وحسین وجعفر وموسیٰ الاصم نام تھے۔ برہان الملک کا شجرہ گھڑنے والے نے زید مذکور کے ایک بیٹے کا نام فخر الدین (یا محی الدین) قرار دے کر اس کے بیٹے اور پوتے کے نام بھی اسی طرز ووضع کے گھڑ لیے یعنی عبدالقادر بن تاج الدین بن فخر الدین (یا محی الدین) بن زید بن موسیٰ رحمہ اللہ الکاظم۔زید مذکور کا زمانہ دوسری تیسری ہجری کا درمیانی زمانہ تھا اس زمانے میں اور اس کے صدیوں بعد تک ہاشمی خاندان تو درکنار کسی دوسرے قریشی وعربی خاندان میں بھی اس وضع کے نام رکھنے کا دستور نہ تھا۔

جناب موسیٰ رحمہ اللہ کثیر الاولاد تھے ۳۷ بیٹیاں اور ۲۳ بیٹے تھے۔بیٹیوں میں پانچ تو لاولد تھے تین کے صرف اولاد دختری تھی۔دوسرے پانچ بیٹوں کی نسل چلنے میں اختلاف ہے ان ہی میں یہ زید بن موسیٰ بھی ہیں جن سے برہان الملک کا سلسلہ نسب ملایا جاتا ہے البتہ دس فرزندانِ موسیٰ رحمہ اللہ کی نسل باقی رہی۔ان میں زید مذکور کا شمول نہیں۔زید کے چار بیٹوں میں سے کسی کا نام فخر الدین یا محی الدین نہ تھا نہ ان کے پوتوں پر دوتوں کے یہ نام تھے برہان الملک کے اور اہل خاندان بھی اس ملک میں متوطن تھے پھر کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ان میں سے کسی کو نہ اپنا سلسلہ نسب صحیح یاد رہا اور نہ کسی ==>

نیشا پور سے وارد ہند ہونے کا زمانہ صحیح طور سے متعین نہیں لیکن ۱۱۲۳ھ /۱۷۱۱ء میں سر بلند خاں فوج دار کی ملازمت میں منسلک تھے پھر فرخ سیر کے عہد میں منصب دار محمد جعفر کے توسل سے نائب کروری مقرر ہوئے اور بصلہ کارگزاری ۱۱۲۳ھ/ ۱۷۱۹ء میں ہندون بیانہ کے فوجدار ہوئے۔ سرکش زمینداروں کی تادیب کے سلسلہ میں خدمات لائقہ انجام دیں اسی زمانہ میں اپنے مربی امیر الامرا حسین علی خاں بارہہ کو بایمائے محمد شاہ بادشاہ قتل کرانے کے صلہ میں سعادت خاں بہادر خطاب اور پنج ہزاری منصب پایا۔

انسائیکلو پیڈیا اوف اسلام کے مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ:

"'برہان الملک یوں تو بھلے آدمی تھے مگر حب جاہ اور خود مطلبی ان میں بے انتہا تھی۔ حسین علی خان جیسے شخص کو جن کے حاشیہ نشین اور موردِ عنایت رہے تھے نہ بخشا باوجود ان کے شیعہ اور سید ہونے کے بھی ان کی جان لیے بغیر نہ چھوڑا''۔①

اس کے بعد تو جلد جلد ترقی کی۔ ۱۱۳۳ھ میں اکبر آباد (آگرے) کے صوبیدار مقرر ہوئے بہادر جنگ خطاب اور باضافہ منصب ماہی مراتب سے سرفراز ہوئے۔ پھر دو سال بعد صوبیداری اودھ پر تقرر ہوا۔ شیخ زادگان لکھنؤ کو بے دردی سے کچلا، فیض آباد ہیڈ کوارٹر بنایا جونپور وغازی پور کے اضلاع بھی ان کی عمل داری

==> نے صحیح طور سے بتایا۔ ان کے رشتے ناطے بھی جیسا کہ کتب تاریخ سے ثابت ہے مغلوں اور ترکمان سے رہے تھے۔ ہندوستان میں جو شیعہ عہد مغلیہ میں وارد ہوتا کسی امام سے اپنا سلسلہ نسب ملا دیتا جو عہدہ ومنصب وجاگیر کے حصول کے لیے سند و پاسپورٹ کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ متعدد مغلیہ بادشاہ بھی شیعہ ونیم شیعہ تھے اور بااختیار امرا میں اکثریت اس فرقے کی تھی جن میں غلبہ ایرانی نژادوں کو حاصل تھا۔

① جلد ا ص ۱۳۳۰۔

میں تھے وہاں کے علماء وشرفا کے وظائف بھی یکلخت ضبط کر لیے۔ یہ سنی علماء درس وتدریس کا شغل رکھتے تھے۔علامہ غلام علی آزاد بلگرامی جو ہم عصر تھے سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں کہ

''برہان الملک کی اس کاروائی سے وہاں کے مدارس جو قدیم سے علم وفضل کے مخزن تھے ویران ہو گئے۔

''وظائف قدیم وجدید یک قلم ضبط شدہ مردماں آنجارا از کسب علم باز داشتہ در پیشہ سپہ گری انداخت ورواج تدریس تحصیل علم برآں وجہ نہ ماند ومدرسے کہ از عہد قدیم درآں علم وفضل بود یک قلم خراب افتاد''

صوبہ کے مالی بندوبست سے محاصل سلطنت میں معتد بہ اضافہ کرنے کے صلہ میں مزید خطاب برہان الملک سے ممتاز ہوئے۔طبعاً بڑے ہوشیار، بہترین منتظم، جری اور تیغ زن تھے۔ ۱۱۴۵ھ میں مرہٹوں کی یورش کا استحصال کیا مگر ان کی پیشانی کردار پر یہ دو اَن مٹ دھبے ہیں ایک تو اپنے محسن ومربی امیر الامرا حسین علی خاں بارہہ کے قتل کی سازش میں شرکت دوسرے اپنے ولی نعمت محمد شاہ بادشاہ سے غداری وبے وفائی۔

شیعہ مورخ غلام حسین طباطبائی نے سیر المتاخرین میں اعتراف کیا کہ

''نادر شاہ کا معتبر پیغامبر اس کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے پہلے برہان الملک کے پاس آیا تھا''۔

یہ کہنا کہ نادر شاہ کو سلطنت مغلیہ کے حالات کی اصلاح کی غرض سے بمشورہ آصف جاہ بلایا تھا صحیح نہیں۔ واقعاتِ بعد سے روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ مرکوز خاطر مغلیہ سلطنت کو نادر شاہ کے دست اختیار میں دے دینا تھا۔ بہرکیف جب نادر شاہ

افشار لاؤ لشکر کے ساتھ یلغار کرتا ہوا کرنال پہنچا محمد شاہ بادشاہ نے مرکزی شاہی فوج کے علاوہ صوبوں کی فوجیں بھی منگوالی تھیں۔ برہان الملک بار بار تقاضے سے فوج لے کر سب سے آخر میں پہنچے اور آدھی رات کو معسکر شاہی میں وارد ہوئے ان کے لشکری طویل منزلیں کر کے خستہ و ماندہ رہے تھے برہان الملک یہ کہہ کر اسی وقت نبرد آزمائی کو اٹھ کھڑے ہوئے کہ نادر شاہ کی ہراولی فوج نے میرے کچھ آدمی مار ڈالے ہیں بادشاہ اور دیگر امرا نے ہر چند سمجھایا کہ کل م سب بہ ہیئت مجموعی مقابلہ کریں گے مگر برہان الملک نے اسی رات میں یا بقول دیگر صبح سویرے لڑائی میں پیش قدمی کر کے اپنے کو بلا مزحمت گرفتار کرالیا۔

شیعہ مؤرخ طباطبائی فرماتے ہیں کہ

''نادری لشکر کے ایک نیشاپوری ''جوان نو خاستہ ترک'' نے برہان الملک کو پہچان لیا اور پکار کر کہا:

''محمد امین دیوانہ شدۂ کے می جنگ و بکدام فوج اعتماد داری''

''یعنی او محمد امین دیوانہ ہوئے ہو کس سے لڑتے ہو اور کس فوج پر اعتماد کرتے ہو''۔

پھر یہ نو خاستہ نیشاپوری ترک ہاتھی کا رسہ پکڑ کر عماری میں جا پہنچا اور ہاتھی ہانک کر لے گیا اور برہان الملک کو حضور نادر شاہ میں پیش کر دیا اس نے قصور معاف کر کے مورد الطاف و عنایات کیا لیکن یہ تو وہی بات ہوئی ''دروغ گورا حافظہ نہ باشد''۔

یہی مورخ بتاتے ہیں کہ

''برہان الملک تیس بتیس برس پہلے سے ہندوستان میں متوطن تھے یعنی اس وقت سے جب یہ جوان نوساختہ ترک نیشاپوری عالم وجود میں بھی نہ آیا تھا پھر وہ انہیں کیسے شناخت کرسکتا تھا''۔

دوسرے مؤلفین کہتے ہیں کہ

''برہان الملک کے بھتیجے شیر جنگ کا ہاتھی ہی ان کے ہاتھی کو ریلتا ہوا نادری لشکر میں لے گیا تھا''۔

یہ سب تاویلات باطلہ ہیں جو بعد میں وضع ہوئیں۔ انہیں نادرشاہ کے پاس پہنچنا تھا کسی نہ کسی طرح پہنچ گئے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے یا بعد میں نظام الملک آصف جاہ کی گفت وشنید کے نتیجے اوراپنے مفتوحہ ممالک کے وقتی حالات کے تقاضے سے نادر شاہ پانچ کروڑ روپیہ بطور تاوان جنگ وصول کرکے کرنال ہی سے واپس جانے کا عزم کرچکا تھا برہان الملک نے اسے یہ ترغیب دی کہ قلعہ شاہ جہان آباد (دہلی میں) خزانہ شاہی حدوحساب سے باہر ہے وہاں تشریف لے جائیں تو نقد وجنس بے شمار اور مفت ہاتھ آجائے۔

''ازگفتن او (برہان الملک) نادرشاہ از میدانِ قتال کرنال بہ بہانہ ضیافت درقلعہ داخل شد دِالّا ارادۂ نادرشاہ چنیں نہ بود''۔①

سعادت خاں برہان الملک ...... نادرشاہ را برفتن دارالخلافۃ شاہ جہاں آباد ترغیب نمودہ دادنمک حرامی ادا کرد وخزائن ودفائن آنجا گوش زد کرد۔②

پھراس ظالم نے جس طرح مغلیہ سلطنت کے خزانہ کولوٹا کھسوٹا اسّی نوے کروڑ کی مالیت کا نقد وجنس وتخت طاؤس لے کر اورخزانے پرجھاڑو پھرواکر نیز امرائے سلطنت

① مفتاح التواریخ۔ ② تاریخ مظفری۔

اور شہر کے مہاجنوں سے بھی بجبر نقد و جنس وصول کر کے ایران لے گیا شہر کے باشندوں کا جو قتل عام ہوا سب کو معلوم ہے۔ برہان الملک تو قتل عام سے ایک دن پہلے ہی مر گئے تھے سرطان کا پھوڑا پھوٹنے سے زہریلا مادہ جسم میں سرایت کر گیا تھا زبانِ خلق پر ان کی اس غداری کا چرچا مدتوں رہا کسی نے ایک عدد کی زیادتی سے تاریخ ہلاکت کہی ۔

بے سعادت نمک حرام بمرد / ۱۱۵۲ھ

برہان الملک کی ہڈیاں حکیم مرزا بجھو نے کربلا لے جا کر پشت روضہ میں دفن کیں حکیم صاحب وہیں مقیم رہے وہابیوں نے جب کربلا میں قتل عام کیا تھا یہ بھی ہلاک ہو گئے تھے۔

برہان الملک متعصب شیعہ ہی نہیں شیعہ گر بھی تھے۔خواجہ موسیٰ خاں جو نقشبندی مشائخ کے خاندان سے اور سنی المذہب تھے ان کی صحبت میں شیعہ ہو گئے تھے مگر بقول طباطبائی بکمال اخفا لیکن ان کے بیٹے جن کو لکھنؤ میں جاگیر ملی تھی کھلے ہوئے شیعہ تھے غرض یہ کہ سلطنت اودھ کے موسس کی سیرت و کردار کی یہ کیفیت تھی جو مجملاً بیان ہوئی۔ برہان الملک کے اولاد نرینہ نہ تھی صرف بیٹیاں تھیں جو بیشتر مغلوں و ترکمانوں کو بیاہی تھیں۔

۲۔صفدر جنگ:

برہان الملک کے بھانجے بھی تھے اور داماد بھی۔ نام کوئی مرزا مستقیم بتاتا ہے کوئی منصور علی خاں۔ آخر الذکر نام زیادہ قرین صحت ہے کیونکہ ان ہی کے پردوتے نواب غازی الدین حیدر اپنے گھرانے کو''منصوری خاندان'' کہا کرتے تھے اور جو پیسہ صفدر جنگ نے چلایا تھا وہ منصوری پیسہ کہلاتا تھا۔قوم سے مغل تھے بعض ترکمان بتاتے ہیں۔ مولف تاریخ اودھ نے فراست نامہ کے حوالے سے ان کے والد کا پیشہ کاسہ سازی بتایا ہے اور لکھا ہے:

''پدر منصور علی خاں کاسہ سازے (بوداج ص ۹۵) اس فقرے میں بھی نام منصور علی خاں ہی تحریر ہے۔ بہت غریب گھرانے کے تھے''۔

مصنف دیباچہ شباب لکھنؤ نے ان کے والدین کو ایسا مفلس بتایا ہے کہ ''خالہ کے دودھ نے جان بچائی، دائی بھی میسر نہ تھی۔ برہان الملک کے اقبال و دولت کی جوانی بھانجے کے شباب سے معاصر ہوئی۔ برہان الملک نے بہن اور بھانجے کو ہندوستان بلا بھیجا اور اپنی بیٹی صدر جہاں سے شادی کر کے عروس سلطنت سے وابستہ کر دیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خانہ داماد سلطنت بنا دیا''۔①

ہندوستان پہنچ کر ماموں کے ظل عاطفت میں امرا کے بچوں کی طرح پل کر جوان ہوئے اور ان ہی کے زیر تربیت ملکی اور انتظامی معاملات سے عملاً واقف ہو کر نائب صوبہ دار کی خدمات انجام دینے لگے برہان الملک نے دربار شاہی سے ''ابوالمنصور خاں صفدر جنگ'' خطاب بھی دلوا دیا، ان کے مرنے کے بعد نادر شاہ افشار نے ۱۱۵۰ھ میں محمد شاہ بادشاہ سے خلعت صوبیداری اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھ ان کے لیے بھجوا دیا اور برہان الملک کا موعودہ دو کروڑ روپیہ بھی ان سے وصول کرا لیا۔

صفدر جنگ میں اپنے ماموں کی سی اولوالعزمی نہ تھی، عالی حوصلہ نیک دل تھے۔ عیاشی اور لہو ولعب سے جو اس زمانہ کے با اختیار امرا کا طغرائے امتیاز تھا ہمیشہ متنفر رہے۔ زمانہ ان کا بڑا پر آشوب تھا۔ سلطنت مغلیہ کو یوں تو محمد شاہ کے زمانے ہی میں گھن لگ گیا تھا، نادر شاہ کے حملے اور برہان الملک کی غداری کی بدولت خزانہ شاہی کی لوٹ کھسوٹ سے چولیں اس کی اور ڈھیلی ہو گئی تھیں بادشاہ کی وفات کے بعد سلطنت کا نام ہی نام باقی رہ گیا تھا۔

① آخری تاجدار اودھ ص ۱۱۔

''سلطنت غیر از نام چیزے ندارد'' ①

نیرنگی زمانہ اور سیاسی انقلابات کی بدولت صفدر جنگ نے اپنے ماموں و مربی کی بہ نسبت زیادہ عروج پایا وزارت پر فائز ہوئے اسی بنا پر نوابانِ اودھ ''نواب وزیر الممالک'' کہلاتے تھے۔

۱۱۵۱ھ سے ۱۱۵۶ھ تک صفدر جنگ نے دار الخلافہ کی پالیٹیکس میں کوئی حصہ نہ لیا اپنے صوبہ میں جس کے حدود بنارس سے الہ آباد تک محیط تھے اپنی حکومت کو مستحکم کرتے رہے۔ ۱۱۵۶ھ میں بادشاہ کی طلبی پر حاضر دربار ہوئے۔ شاہی توپ خانے کا انتظام سپرد ہوا پھر صوبیداری اودھ کے علاوہ صوبہ جات کشمیر و الہ آباد کا انتظام بھی ان ہی کے ذمہ کیا گیا۔

چند سال بعد ۱۱۶۱ھ میں جب احمد شاہ ابدالی نے یلغار کر کے لاہور اور ملتان پر تصرف کر لیا۔ شاہ نواز خاں ناظم لاہور شکست کھا کر بھاگ آئے محمد شاہ بادشاہ نے اس کے مقابلہ کے لیے اپنے ولی عہد شاہزادے احمد کو متعین کیا اور وزیر الممالک اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کو نیز صفدر جنگ اور وزیر موصوف کے بیٹے معین الملک معین الدین ② عرف منو۔ دیگر امرا راجہ ایشر سنگھ وغیرہ کو ولی عہد کے ساتھ بھیجا۔

مقام سرہند پر جب لڑائی کا بازار گرم تھا قمر الدین وزیر اعظم ③ خیمے میں نماز

---

① سیر المتاخرین۔

② کہا جاتا ہے کہ یہ نواب علی محمد خان سردار روہیلہ کے داماد تھے۔ (گزیٹر مراد آباد و سیر المتاخرین)

③ وزیر موصوف خواجہ عبید اللہ احرار نقشبندی فاروقی کی نسل سے تھے۔ ان کے والد محمد امین خاں عہد فرخ سیر کے ہفت ہزاری منصب دار ابتدائے عہد محمد شاہ بادشاہ میں بخطاب اعتماد الدولہ وزیر رہے تھے بڑے راسخ العقیدہ متبع شریعت سنی تھے۔ شیعہ مورخ طباطبائی ان سے سخت ناراض ہیں دشمن اہل بیت سے متہم کر کے لکھا ہے کہ

وہ ''نام یزید و معاویہ وغیرہ'' احترام و تعظیم سے لیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں یہ بھی لکھا ہے کہ ==>

چاشت کی پڑھ رہے تھے توپ کا گولہ لگنے سے راہی ملک بقا ہو گئے صفدر جنگ نے بڑی مستعدی و جانفشانی سے غنیم پر توپ خانہ آتش بار سے گولے برسوائے۔ ہم عصر مورخین نے صراحتاً بیان کیا ہے کہ

==> میر جملہ صوبیدار کی رخصتی ملاقات میں ایک شیعہ دوست نے دیر سے پہنچنے کا سبب جب شرکت ماتم بتایا محمد امین خاں پوچھنے لگے دولت خانہ میں کس کا ماتم تھا کون مر گیا تھا۔ شیعہ نے ترش روئی سے کہا سید الشہدا کا ماتم تھا۔ محمد امین خاں نے اس پر کہا اجی جناب حسین و یزید تو دونوں صاحبزادے تھے۔

''مارا چہ رسد کہ ماتم یکے بگیریم و دیگرے را بد بدانیم''

شیعہ نے جواب دیا:

''صاحبزادۂ ما کشتہ شد ما ماتم اومی گیریم صاحبزادہ شما ظفر یافت شما شادی بکنید'' بات بڑھ گئی۔ میر جملہ نے اٹھ کر بیچ بچاؤ کرا دیا۔ محمد امین خاں کے ۱۱۳۳ء میں فوت ہونے اور نظام الملک کے وزارت سے مستعفی ہو کر دکن چلے جانے کے بعد محمد امین خاں کے یہ فرزند جو اپنے والد کی طرح متبع شریعت راسخ العقیدہ سنی تھے وزیر اعظم ہوئے شیعہ ایرانی امراء وغیرہ کی متعصّبانہ حرکات کا سدباب کرتے رہتے تھے۔

روہیلہ افغانوں کے سردار علی محمد خاں کی مختلف مواقع پر مدد کی ۱۱۵۰ھ میں شیعہ سادات بارہہ کی تادیب کے لیے عظیم اللہ خاں کی سرکردگی میں شاہی دستہ فوج بھیجا علی محمد خاں سردار روہیلہ کو بھی ان کے ساتھ مامور کیا۔ شیعہ مورخ نے سالار فوج کو ''نائب ابی سفیان'' اور شاہی دستہ فوج کو ''فوج شام'' کا نام دے کر کہا ہے کہ ''فوج شام کہ عبارت از جماعہ تورانیہ و علی محمد خاں روہیلہ باشد'' پھر لکھا ہے افاغنہ ملاعنہ...... کہ عبارت از روہیلہ باشد'' سنی مذہب افغانوں (روہیلوں) کے بارے میں شیعہ مورخ کی یہ بدگوئی اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اپنے سردار کی قیادت میں دلیرانہ حملہ کر کے متمردین کا آناً فاناً خاتمہ کر دیا تھا جس کے صلہ میں روہیلہ سردار کو خطاب نوابی اور دو ہزاری منصب عطا ہوا تھا۔ نواب علی محمد خاں کی افغان دوستی اور شجاعت وشہامت کی شہرت جب دور دور پھیل گئی اور بقول مؤرخ مذکور ''ازاں زماں سر اقتدار علی محمد خاں بکیواں رسید......قریب سی چہل ہزار افغان و روہیلہ ملازم رکابش گشتہ (سیر المتاخرین ج ۳ ص ۸۵۵) حافظ رحمت خاں بھی اسی زمانہ میں نواب علی محمد خاں کی ملازمت میں منسلک ہوئے اور خدمات لائقہ بجانے سے ان کے لشکر میں جماعت دار ہو گئے تھے۔

''نواب صفدر جنگ نے موقع کی نزاکت کا پورا احساس کر کے اپنی بروقت جانفشانی سے لڑائی کا رخ یکا یک پلٹ دیا''۔

لڑائی جیتنا:

۲۸ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ کو شاہی فوج کے مورچہ پر جہاں معین الملک بمعیت ولی عہد دادِ شجاعت دے رہے تھے ابدالی لشکر نے زبردست دھاوا کر کے پسپا کرنا شروع کیا۔قریب تھا کہ شاہی فوج کو شکست ہو صفدر جنگ نے یہ حال دیکھ کر اپنی کچھ فوج تو ولی عہد کی مدد کو بھیج دی اور خود پیادہ پا ہو کر بقیہ فوج اور توپ خانہ کے رہکلے بان وجزائل ساتھ لے کر معین الملک اور ابدالی لشکر کے درمیان یکا یک حائل ہو گئے اور تہورانہ جنگ کر کے مسلسل آتش بازی سے ابدالی لشکر میں قیامت مچا دی اور اس طرح ابدالی کو ہزیمت ہوئی۔

''رست خیز قیامت برانگیخت واکثر ہمراہیاں ابدالی رابر خاک میدان خستہ سرو پیکر ریخت انتظام فوجش از ہم پاشیدہ شکست برلشکر افتاد ناچار پشت بمعرکہ کارزار دادہ راہ ادبار پیش گرفت و فتح وظفر نصیب اولیائے دولت پادشاہ ہندوستان گردید''۔①

غرض یہ کہ صفدر جنگ کے حسن تدبیر اور تہورانہ حملہ سے یہ فتح وظفر شاہی فوج کو حاصل ہوئی شاہ ابدالی نے کچھ پیغام شاید دوبارہ جنگ آزمائی کے صفدر جنگ کو رات میں بھیج کر صبح کو نقارۂ کوچ بجوا دیا۔

صفدر جنگ اور ولی عہد کی واپسی:

''بادشاہ نے مژدہ فتح اور جانفشانی وزیر مرحوم نیز ''ترددات نمایاں صفدر

① سیر المتاخرین ج ۳ ص ۸۶۴۔

جنگ ومعین الملک'' سن کر آخر الذکر کو لاہور وملتان کے سابق ناظم شاہنواز خاں کی جگہ جو شاہ ابدالی کے مقابلہ سے فرار ہو گئے تھے ناظم مقرر کر دیا۔ چونکہ بادشاہ کی طبیعت ان دنوں علیل تھی۔ مرض میں جب اشتداد ہوا اور حالت دن بدن خراب ہونے لگی اپنی زندگی میں وزیر مرحوم کے جانشین کا تقرر کرنا چاہا۔صفدر جنگ کے مع ولی عہد بتعجیل واپس آنے کے لیے شقے پر شقے بھجوائے۔

''چوں مرض محمد شاہ بادشاہ دمبدم اشتدادی یافت وآثار رویہ ظاہر گشتہ مرگ خود مشاہدہ می نمود شقے ہائے طلب صفدر جنگ و پسر خود متواتر می فرستاد''۔①

سفر واپسی اور تفویض وزارت:

مگر یہ دونوں صفدر جنگ اور ولی عہد ابھی نواح پانی پت ہی میں پہنچے تھے کہ رات کے وقت بادشاہ کے مرنے کی خبر ملی۔صفدر جنگ نے صبح ہی کو پانی پت میں بعد انفراغ مراسم تعزیت چتر شاہی اور لوازم جلوس آراستہ کر کے ولی عہد کے نذر گزرانا، سلطنت ہند کی مبارک باد دی اور آداب بجالائے۔ نئے بادشاہ احمد شاہ نے فرمایا:

''ہمیں یہ سلطنت، تمہیں اس کی وزارت مبارک''۔

مرآت آفتاب نما وتاریخ اودھ وقیصر التواریخ وسیر المتاخرین ودیگر کتب میں یہی واقعہ بہ تغیر الفاظ بیان کیا گیا ہے۔مفتاح التواریخ میں ہے کہ

''بعد رسیدن خبر وفات محمد شاہ صفدر جنگ در پانی پت یکم جمادی الاول ۱۱۶۱ھ چتر شاہی ولوازم جلوس آراستہ از نذر شاہزادہ گزرانیدہ مبارکباد سلطنت معروض داشت شہزادہ فرمود کہ وزارت بہ شما مبارک است بعد

① سیر المتاخرین ج ۳ ص ۸۶۴۔

ازاں بدہلی تشریف آوردند خلعت وزارت بہ نواب صفدر جنگ ......
مرحمت فرمود‘‘۔

میر تقی میر جو سرہند کے معرکہ میں بذات خود موجود تھے لڑائی کا یہ حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

وزیر قمرالدین خاں کے ہلاک ہوتے ہی ایشر سنگھ تو بس خم زدہ یعنی بھاگ گیا۔ ’’صفدر جنگ و معین الملک کہ پسر وزیر شہید باشد احمد شاہ را سوار کردہ جنگ افغانان زدند من با خان منظور بودم و خدمتہا نمودم ہرگاہ شکست فاحشے برلشکر افغانان افتاد و گریخت معین الملک ناظم لاہور شد......
صفدر جنگ روانہ شہر شد‘‘۔

شہر سے مراد دارالسلطنت دہلی ہے چنانچہ سفر واپسی کے چشم دید حالات اور واقعات اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بر سبیل تذکرہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’قریب پانی پت کے شہریست چہل کردہے شاہ جہاں آباد خبر رسید کہ محمد شاہ بآجہاں خرامید عالمے لکد روزگار خورد (یعنی پائمال شد) صفدر جنگ لکد برابر زدہ (یعنی تفاخر کردہ) چتر و تخت پیش احمد شاہ آدرد، نوبت سلطنت بادرسید با کردفر داخل شہر گشت ...... وقتیکہ نظام الملک آصف جاہ در دکن فوت گشت منصب وزارت بہ صفدر جنگ رسید‘‘۔①

غرض یہ کہ شاہد عینی کے اس بیان ہی سے ثابت ہے کہ شاہ ابدالی کو سرہند میں شکست دے کر اور بادشاہ فردوس آرام گاہ کے مرنے کی خبر سن کر صفدر جنگ نے پانی پت میں ولی عہد کے جلوس و تخت نشینی کا اہتمام کیا اور بقول میر تقی

① ذکر میر۔

''صفدر جنگ لکد برابر زدہ''

بالفاظ دیگر بفخر ومباہات وہمعنان نصرت واقبال نامزد وزیر کی حیثیت سے بمعیت احمد شاہ بادشاہ باکروفر وارد دارالسلطنت دہلی ہوئے۔

معلوم ہے کہ چار برس پہلے ۱۱۵۷ھ میں جب بادشاہ فردوس آرم گاہ نے منصب میر آتشی ان کے سپرد کیا تھا اس عہدے کے فرائض میں چونکہ حراست جان ومال وناموس بادشاہی شامل تھا صفدر جنگ نے اسی وقت سے قلعہ شاہی میں اپنی سکونت واقامت اختیار کرلی تھی۔

ہم عصر مورخ کا بیان ہے کہ بادشاہ مرحوم کو

''اعتمادے برامرائے تورانیہ نہ بود...... حفیظ الدین خاں راازخدمت داروغگی توپ خانہ کہ کار عمدہ وحراست جان ومال وناموس بادشاہ درضمن کاراست معزول نمودہ ......صفدر جنگ رابعنایت خلعت میر آتشی سرفراز فرمودہ ونہایت لطف ومرحمت نمودہ توقعات وفاداری وحقوق نمک خوارگی ازامیر ذکور برزبان آوردہ صفدر جنگ تیش خانہ میر آتشی بقدر شان وشوکت خود درقلعہ آراستہ ازاں بعد اقامت خود درقلعہ مقرر فرمود''۔①

مؤلف تاریخ اودھ نے بھی ضمناً یہی کہا ہے کہ

''صفدر جنگ نے اپنے تیش خانہ جو میر آتش کے لیے ضروری ہوتا ہے قلعہ میں آراستہ کرکے اپنی سکونت وہاں قرار دی تھی''۔②

ان کی فوج کا شمار جس وقت بادشاہ کی طلبی پر اودھ سے دارالسلطنت آئے تھے کم وبیش دس ہزار سوار مغلیہ وہندوستانی تھا۔جس کے ساز وسامان کو یعنی سپاہیوں کی

① سیر المتاخرین ج ۳ ص ۸۵۲۔
② تاریخ اودھ ج ۳ ص ۱۱۳۔

باناتی وردی کو ولایتی گھوڑوں کو جو نقرئی ساز سے آراستہ تھے اور ہاتھیوں کی زری جھولوں اور گنگا جمنی حوضوں کو دیکھ کر بادشاہ بہت محظوظ ہوئے تھے۔ ان کے فوجی وغیرہ تو حویلی دار اشکوہ میں جو برہان الملک کے زمانے سے مقرر تھی مقیم ہوئے اور خود صفدر جنگ اپنے خاص عملے کے ساتھ قلعہ شاہی میں رہتے تھے۔ صفدر جنگ نے اپنی اسی فوج اور شاہی توپ خانہ کے سپاہیوں کی جانبازی سے سرہند میں غنیم کو شکست دی تھی پھر سفر واپسی میں کہ سوائے ان کے کوئی دوسرا امیر کبیر موجود نہ تھا۔ اپنے لشکر کے علاوہ کم وبیش پچاس ہزار فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے دار الخلافہ پہنچے تھے چنانچہ ان کے خطاب وزارت میں لفظ ''سپہ سالار'' شامل ہوا۔

الغرض غیر رسمی طور پر تو منصب وزارت پانی پت ہی میں بوقت جلوس بادشاہ ان کے سپرد ہو گیا تھا اور رسمی طور پر زمام وزارت صفدر جنگ نے اس وقت سنبھالی جب نظام الملک① آصف جاہ نے جن سے بذریعہ شقہ شاہی و مراسلات امرا استمزاج کیا گیا

① آصف جاہ شاہ جہاں بادشاہ کے مشہور وزیر سعد اللہ خاں کے نواسے شہاب الدین سہروردی کی نسل سے تھے۔ شروع عہد محمد شاہی میں وزیر ہوئے مگر بادشاہ کے انہماک لہو ولعب و امور سلطنت سے بے پرواہ دیکھ کر جلد ہی مستعفی ہو گئے اور صوبیداری دکن پر چلے گئے وہاں ۲۵ برس چھ صوبوں پر حکمرانی کی۔ نادر شاہ کے حملے کے وقت بادشاہ کی طلبی پر حاضر دربار ہوئے اس وقت جو خدمت بجا لائے برہان الملک کے واقعہ میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

۱۱۵۶ھ میں جب صفدر جنگ وغیرہ امرائے کبار کو طلب کیا گیا آصف جاہ کو بھی بلایا گیا تھا انہوں نے اس وقت بھی بقول ہم عصر مورخ ''بنا بر ضعف پیری و آسائش و جاہ حکمرانی شش صوبہ دکن'' کہ سلطنت مغلیہ کے تہائی حصہ کی فرمانروائی کے مرادف تھا حاضری دربار سے غدر کیا۔ وہ بڑے مدبر و منتظم تھے ان کی بزرگی کے لحاظ سے اس عہد کے جملہ امرا مراسم و آداب خوردی ان سے بجا لاتے تھے۔ صفدر جنگ نے اس حالت کے پیش نظر کہ بادشاہ مرحوم کی وفات سے سیاسی حالات میں جو کمزوری پیدا ہوئی تھی کہ بقول میر تقی میر ''عالمے لگد روز گار خوردیعنی پائمال شد'' انتظام سلطنت کی باگ سنبھالنے سے قبل آصف جاہ کی رضا و تعاون حاصل کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ۱۰۳ برس کی طویل عمر میں ان کی وفات ہوئی بادشاہ وزیر و آصف جاہ کے ایک ہی سال بتفاوت چند ایام وفات ==>

تھا انہوں نے بعذر ضعف پیری وزارت قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے صفدر جنگ کو لکھا تھا کہ بالفعل نوجوانوں میں تم ہی موزوں ہو جو بہتر سمجھو انتظام سلطنت کرو۔

ہم عصر مورخ نے آصف جاہ کے یہ الفاظ درج کیے ہیں:

''آصف جاہ...... بصفدر جنگ نوشت کہ بالفعل از میاں اطفال شما اقسفالید درآنچہ بہتر واینید وانتظام سلطنت توانید بعمل آرید''۔①

رامپوری مولف تاریخ اودھ نے بھی مرآت آفتاب نما کے حوالے سے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ آصف جاہ نے وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور صفدر جنگ کو لکھا تھا کہ جو بہتر سمجھو کرو اس کے بعد ہی آصف جاہ کی وفات ہوگئی۔ اس وقت صفدر جنگ نے بقول مورخ بخاطر جمع خلعت وزارت زیب تن کیا:

''آں زماں صفدر جنگ بخاطر جمع قامت قابلیت خود را بخلعت وزارت بیاراست''۔②

چنانچہ ۴ رجب ۱۱۶۱ھ کو باضافہ منصب ہشت ہزاری وآٹھ ہزار سوار بخطاب ''جملۃ الملک مدار المہام وزیر الممالک برہان الملک ابوالمنصور خان بہادر صفدر جنگ سپہ سالار'' قلمدان وزارت رسمی طور پر سنبھالا اور ہفتہ عشرہ کے اندر ہی مشیرانِ وزارت بالفاظ دیگر اپنے کابینہ میں اعلیٰ عہدہ داروں کا ردوبدل کر کے وزیر مرحوم کے بڑے بیٹے انتظام الدولہ کو جو کئی برس سے صوبیدار اجمیر تھے وہاں سے تبدیل کر کے بخشی گری

==> پائی۔ وفات پانے کے تاریخ آزاد بلگرامی نے کہی تھی۔

سہ رکن سلطنت ہند از جہاں رفتند
فتاد حیف ۳ دریگانہ از کف دہر
پائے رحلت ایں ہر سہ یافتم تاریخ
نماند شاہ زماں وزیر وآصف دہر ۱۱۶۱ھ

① سیر المتاخرین ج ۳ ص ۸۶۹۔ ② حوالہ مذکورہ۔

دوم کا خلعت دلوایا اور اپنے فرزند شجاع الدولہ کو میر آتشی کی نیابت کا جاوید خاں خواجہ سرا کو نظارت اور سادات خان ذوالفقار جنگ کو بخشی گری اول وامیر الامرائی کا خلعت دلوایا۔ چار پانچ برس ایسی شان وشوکت سے جو بقول میر تقی میر بادشاہ کی بھی نہ تھی وزارت کی:

''امارت وزیر حال بجائے رسید کہ بال وگوپال (یعنی شاہ وشوکت) اور اشاہ ہم نہ داشت''۔①

مگر بعض لغزشوں، کوتاہیوں اور غلط اقدامات کی وجہ سے جن کا ذکر مجملاً آگے آتا ہے، وزیر موصوف کی عزت ووقار کو البتہ ناقابل تلافی صدمہ پہنچا، بادشاہ سے بغاوت کی بدنامی ورسوائی بھی ہوئی اور وزارت بھی چھوڑنی پڑی۔

اس موقع پر ایک بے بنیاد اور محض طبع زاد لغو قصے کی تردید وتکذیب ضروری ہے جو تفویض وزارت کے سلسلے میں گل وگلستان رحمت وغیرہ کے ڈھنڈورچیوں نے نواب صفدر جنگ کی تضحیک اور اپنے ممدوحین کی شخصیتوں کو بانس پر چڑھانے اور اچھالنے کی غرض سے گھڑ کر خاندانی پرتھیوں میں درج کیا تھا کہ جس کی تشہیر بعض موقع شناسوں نے اپنی مصلحتوں سے کر ڈالی ہے۔②

ایک سفیہانہ بہتان طرازی:

کتاب ''حیات حافظ رحمت خاں'' کے بریلوی مولف نے نویں باب کا

① ذکر میر۔

② اس لغو قصے میں چونکہ اول نام نوابانِ رامپور کے مورث نواب علی محمد خاں کا آیا ہے تاریخ اودھ کے رامپوری مؤلف نے کتاب کے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۱۹ء میں نواب مذکور کی سیادت نسبی کے اظہار کے ساتھ بعنوان ''نواب سید علی محمد خاں کی مدد سے صفدر جنگ کو دلی کی وزارت ملنا'' جس طرح درج کیا ہے صاف عیاں ہے کہ کسی خارجی اثر سے ایسا کیا ہے۔

عنوان ہی بحروف جلی ان الفاظ میں قائم کیا ہے۔① ''حافظ الملک کی مدد سے صفدر جنگ کی وزارت''۔ پھر جو عبارت آرائی کی ہے۔ پہلا ہی فقرہ اس کا یہ ہے:

''اس اثنا میں ابوالمنصور خاں صفدر جنگ نے دہلی پہنچ کر مندرجہ ذیل خط نواب صاحب کو بھیجا''۔②

اس فقرے کے خط کشیدہ الفاظ تشریح طلب ہیں:

ا۔''اس اثنا'' کی تشریح اور وضاحت تو خود مؤلف ہی کے دوسرے فقرے سے ہو جاتی ہے جو آٹھویں باب کے آخری پیراگراف کا ہے یعنی مؤلف صاحب فرماتے ہیں کہ

''صفدر جنگ اور شہزادہ احمد شاہ کی سرکردگی میں جب شاہی فوج دہلی

---

① یعنی حافظ رحمت خاں روہیلہ رئیس بریلی جو ابتدائی ایام میں بعض روہیلہ قسمت آزماؤں دوندے خاں ونجیب خاں اور نوابانِ ٹونک کے مورث طالع خان کی طرح نواب علی محمد خاں مورث نوابانِ رامپور کے متبعین ومتوسلین میں شامل رہے تھے۔خدمات لائقہ انجام دینے سے ترقی کرتے گئے بالآخر سردارانِ روہیلہ میں شمار ہوئے۔ بڑے کارگزار، ہوشیار منتظم وشجیع وبہادر شخص تھے بہ نسبت دوسرے روہیلے سرداروں کے حافظ صاحب علم سے بھی بقدر مایحتاج بہرہ مند تھے کہتے ہیں پشتو میں شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

سیر المتاخرین کے ہمعصر مولف نے فیض اللہ خاں پسر نواب علی محمد خاں کے ذکر میں صراحتاً بیان کیا ہے کہ

''پدرش (یعنی علی محمد خاں) درزماں خود آقائے حافظ رحمت ودوندے خاں وغیرہم بود''۔(ج ۴ ص ۹۳۸)

نواب موصوف کی وفات کے بعد بعض دوسرے روہیلہ سرداروں کی سازش سے انہوں نے اپنے آقا زادوں کی موروثی ریاست کا کچھ علاقہ تقسیم کے بہانہ سے غصب کر کے اپنی جدا ریاست قائم کی جو اِن کے مقتول ہو جانے کے ساتھ ہی مٹ گئی۔ان کے کردار پر البتہ یہ ایک اَن مٹ دھبہ ہے ویسے ان میں دیگر صفات حسنہ کی کمی نہ تھی شاید اس زمانہ کے بیشتر روہیلوں کی طبائع میں حرص وطمع کا مادہ زیادہ تھا بقول ہمعصر مورخ:

''روہیلہ عجب قومے شدید الحرص قوی الطمع می باشد''۔(سیر المتاخرین)۔

② ص ۷۰۔

واپس آ رہی تھی تو اثناء راہ میں محمد شاہ کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی اور شاہزادہ احمد شاہ کو سردارانِ فوج نے جانشین کر کے ان کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا''۔①

مندرجہ بالا عبارت سے واضح ہے کہ ''اس اثنا'' سے مؤلف مذکور کی مراد اسی عرصہ چند ایام سے ہے جب صفدر جنگ نے اپنے بادشاہ فردوس آرام گاہ کی وفات کی اطلاع پا کر پانی پت میں جیسا آپ عینی شاہد وغیرہ کے بیان سے ملاحظہ کر چکے ہیں ولی عہد کے جلوس کا اہتمام کیا تھا۔ تنہا انہوں نے ہی کیا تھا ان کے سوائے کوئی بااختیار سردار فوج وہاں موجود نہ تھا پھر وہاں سے فوج شاہی کی سرکردگی میں جس کی تعداد پچاس ہزار سے کم نہ تھی۔ بمعیت احمد شاہ بادشاہ دہلی پہنچے تھے۔

مؤلف نے مندرجہ بالا عبارت میں بسلسلہ تخت نشینی ولی عہد صفدر جنگ کے نام کا اخفا کر کے ''سردارانِ فوج'' بصیغہ جمع لکھا ہے ''وزارت دلوانے'' کے لغو قصے کی بہتان تراشی کے سلسلہ کا یہ پہلا کید (مکر) ہے۔

ایک پرلطف بات یہ بھی ملاحظہ ہو کہ تخت نشینی کے اعلان میں صفدر جنگ کے نام کا اخفا کرنے کے باوجود دو سطر بعد ہی نواب علی محمد خاں کے ذکر میں یہ بھی تحریر کر دیا ہے کہ

''محمد شاہ کے انتقال اور بہ امداد صفدر جنگ احمد شاہ کی تخت نشینی سے امور ملکی میں پیچیدگیاں پیدا ہونے کا امکان تھا''۔②

گویا پہلے تو اعلان تخت نشینی میں ''سردارانِ فوج'' بصیغہ جمع لکھا اور صفدر جنگ کے نام کا اخفا کیا۔ مگر بعد میں ''بہ امداد صفدر جنگ احمد شاہ کی تخت نشینی'' بھی لکھ دیا۔ کیا

① ص ۶۹۔
② حوالہ مذکورہ۔

یہ حافظہ نہ باشد کی مثال تو نہیں! اور کیا جس کی امداد سے بادشاہ کی تخت نشینی ہو وہ اور لوگوں کی امداد کی دریوزہ گری کسی عہدے و منصب کے حصول کے لیے کرتا پھرے گا؟

۲۔''دہلی پہنچ کر'' ان لفظوں سے مطلب و مفہوم ''دہلی پہنچتے ہی'' پہنچنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے نہ دہلی پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد کا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ نواب صفدر جنگ کے معرکہ سرہند سے واپس دہلی پہنچنے کی صحیح تاریخ بحوالہ مستند کتب تاریخ معلوم و متعین کر لی جائے۔

سرہند میں احمد شاہ ابدالی سے پہلا معرکہ قتال و جدال حسب تصریحات کتب تاریخ سیر المتاخرین وغیرہ ۱۵ / لغایت ۲۸ ربیع الاول کو ہوا جس میں بحسن تدبیر صفدر جنگ شاہ ابدالی کو ہزیمت ہوئی۔ پہلے ہفتہ ماہ ربیع الثانی میں معین الملک پسر وزیر قمر الدین خاں تو نظامت لاہور و ملتان پر مقرر ہو کر چلے گئے صفدر جنگ بمعیت ولی عہد بطلب بادشاہ بسر کردگی افواج شاہی دہلی واپس آ رہے تھے کہ ۲۷ ربیع الثانی کو بادشاہ کی دہلی میں وفات ہو گئی جس کی خبر ۲۸ یا ۲۹ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ کو بوقت شب نواح پانی پت اپنے وکیل لچھمی نرائن کے ذریعہ صفدر جنگ کو ملی۔ اب ماہ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ کے واقعات تاریخ وار ملاحظہ ہوں:

یکم جمادی الاول ۱۱۶۱ھ: جلوس و تخت نشینی احمد شاہ بمقام پانی بت بقول مولف مذکور ''بہ امداد صفدر جنگ''۔

۲ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ: ورود احمد شاہ بمعیت صفدر جنگ بہ دہلی و تدفین بادشاہ فردوس آرام گاہ۔

۳ لغایت ۶ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ: جلوس و قیام احمد شاہ بادشاہ در باغ شالا مار دہلی۔

۷ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ: تشریف آوری احمد شاہ و قیام بدولت خانہ شاہی در قلعہ شاہ

جہاں آباد بمعیت صفدر جنگ۔

مندرجہ بالا تاریخوں کے اعتبار سے نواب صفدر جنگ بقول مؤلف مذکور ''دہلی پہنچ کر'' ''وزارت دلوانے'' کی غرض سے کوئی خط بھیجتے تو دوسری تیسری جمادی الاول ۱۱۶۱ھ کو بھیجتے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جب بقول مؤلف مذکور خود احمد شاہ ''بہ امداد صفدر جنگ'' تخت نشین ہوئے تھے، صفدر جنگ ہی افواج شاہی کے سپہ سالار اور میر آتش بھی تھے۔ قلعہ شاہی میں ہی سکونت تھی، قوت اقتدار کے اعتبار سے کوئی امیر ان کے مدمقابل موجود نہ تھا بادشاہ نے خود ہی ان کو وزارت کے لیے نامزد بھی کر دیا تھا تو ان حالات میں ان کو اپنے سے کمتر درجہ کے کسی شخص کو مدد کے لیے پکارنے اور بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ وضعی خط بھیجنے کا یہ لغو قصہ ''وزارت دلوانے'' کی بہتان تراشی کا دوسرا کید ہے۔

(۳) نواب صاحب سے مراد مؤلف مذکور کی نواب علی محمد خاں مورث نوابانِ رامپور سے ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ نواب موصوف اور صفدر جنگ کے مابین عداوت اور دشمنی اس وقت سے برابر قائم تھی جب صفدر جنگ نے بادشاہ فردوس آرام گاہ کو روہیلوں کی بے باکانہ وخودسرانہ چیرہ دستیوں کے پیش نظر ان کے ابھرتے ہوئے سیاسی اقتدار کے استیصال کرنے کی ترغیب دے کر اور نواب علی محمد خاں پر چڑھائی کر کے ان کو گرفتار کرلیا تھا۔

ہم عصر مورخ کے قول کے مطابق نواب علی محمد خاں دشمن حقیقی اپنا صفدر جنگ کو جانتے ہیں رامپوری مورخ نے لکھا ہے کہ

''صفدر جنگ کو نواب علی محمد خاں سے دلی عداوت تھی''۔①

① ج ا ص ۱۶۔

اور خود بریلوی مؤلف بھی وزیر قمر الدین خاں کی موت کو روہیلوں کے وجود کے لیے خطرہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''آئندہ روہیلوں کو ایک ایسے شخص سے واسطہ پڑا جو ان کا قدیمی دشمن تھا اور جس کی زندگی کا مخصوص مشغلہ ہی روہیلوں کی تخریب تھا''۔①

ایسے شخص سے مراد مؤلف مذکور کی صریحاً نواب صفدر جنگ کی ذات سے ہے مگر دیکھئے نواب موصوف کے نام کا مولف نے محض اس مقصد سے اخفا کیا ہے اور نام کے بجائے لفظ ''ایسے شخص'' لکھا ہے کہ اگلے ہی صفحے پر ''وزارت دلوانے'' کی بہتان طرازی کے سلسلہ میں اسی ''قدیمی دشمن'' سے جعلی خط بھجوانے کے لغو قصہ میں نام ان کا لانا ضرور تھا۔ یہ اس سلسلہ بہتان تراشی کا تیسرا کید ہے۔

''مندرجہ ذیل خط''۔ یہ الفاظ کہ ''صفدر جنگ نے مندرجہ ذیل خط نواب صاحب کو بھیجا''۔ کتاب میں لکھ دینے کے بعد بھی مولف مذکور نے ذیل میں کسی صفحے پر مفروضہ خط کی کوئی نقل بمطابق اصل جو یقیناً بزبان فارسی ہوتی کہیں درج نہیں کی۔ جس زمانہ میں اس وضعی خط کا بھیجا جانا بتایا ہے یعنی اب سے سوا دو سو برس پہلے ۱۱۶۱ھ میں بلکہ اس سے ایک صدی بعد تک جملہ سرکاری وغیر سرکاری تحریرات، فرامین ومکتوبات اور نجی خط وکتابت وغیرہ خصوصاً شمالی ہند میں اس عہد کی مروجہ زبان فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔

پس اگر نواب صفدر جنگ کی جانب سے اپنے سے فروتر درجہ کے کسی شخص کے موسومہ کوئی خط لکھا گیا ہوتا خاص کر تفویض وزارت میں امداد کرنے کے لیے یقیناً مروجہ زبان فارسی میں تحریر ہوتا، ان ہی کے قلم سے تحریر ہوتا اور بصیغہ راز سربند مہری

① ص ۶۹.

لفافے میں با حتیاط تمام مکتوب الیہ کو بھیجا گیا ہوتا پھر تو یہ مکتوب اپنی نوعیت کی ایک اہم تاریخی دستاویز ہوسکتی تھی جو مکتوب الیہ کے گھرانے نوابانِ رامپور کے خاندانی ریکارڈ میں بہ احتیاط محفوظ رکھی جاتی اور بوقت ضرورت کام میں لائی جاتی بالخصوص اس زمانے میں جب صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ نے نواب علی محمد خاں کے بیٹوں اور دوسرے روہیلہ سرداروں کے استیصال پر کمر باندھ لی تھی۔

ایسی اہم دستاویز اور نادر مکتوب کی نقل بمطابق اصل بزبان فارسی حاصل کر کے ''مندرجہ ذیل خط'' الفاظ کے بعد کتاب میں بتمام وکمال درج کرنا مؤلف کے لیے لازم تھا مگر نہ فارسی مکتوب کی کوئی نقل بمطابق اصل درج ہے نہ کوئی اقتباس وخلاصہ اس کا فارسی زبان میں ہے، اور نہ اس خط کے وجود ہی کا کوئی ثبوت کوئی حوالہ پیش کیا گیا ہے۔

''وزارت دلوانے'' کے سلسلے کی بہتان تراشی کا یہ چوتھا کید ہے۔

اسی سلسلے میں ایک ذیلی عنوان بہ الفاظ ''صفدر جنگ کا خط'' قائم کر کے مولف نے بجائے فارسی کے ساڑھے سات سطری اردو عبارت بحروف خفی حاشیہ چھوڑ کر بلاحوالہ اور بغیر یہ ظاہر کیے کہ آیا یہ عبارت اصل ہے یا ترجمہ پُرفریب طریقے سے درج کردی تاکہ پڑھنے والے کو اصل عبارت کا دھوکہ ہو۔ پہلا ہی فقرہ یہ ہے یعنی مفروضہ خط کا مضمون بلا القاب وآداب یوں شروع ہوتا ہے:

> ''چونکہ اعتماد الدولہ قمر الدین خان محمد شاہ بادشاہ کی وفات سے قبل احمد شاہ درانی کی جنگ میں قتل ہوگئے تھے اور محمد شاہ بھی عالم بقا کو رحلت فرما چکے وزارت کا معاملہ اس وقت تک مہمل اور معطل پڑا ہے''۔①

ذرا غور سے پڑھیے ہر جملہ ساختگی کی غمازی کر رہا ہے۔ دعویٰ تو یہ کہ دہلی پہنچتے

① ص ۷۰۔

ہی خط بھیجا تھا بالفاظ دیگر بادشاہ احمد شاہ کی تخت نشینی کے دوسرے تیسرے دن مگر خط کشیدہ الفاظ سے تو ظاہر ہے کہ کافی عرصہ کے بعد خط لکھا گیا تھا۔ اس تضاد بیانی کے علاوہ جب صفدر جنگ اور علی محمد خاں ۔ کاتب ومکتوب الیہ۔ ان دونوں کو جنگ درانی کے ان مشہور واقعات وحالات سے بذات خود واسطہ رہا تھا، علی محمد خاں جو سرہند میں چکلہ دار تھے اپنے مربی وزیر قمرالدین خاں کے دوران جنگ قتل ہوتے ہی راجہ ایشر سنگھ جے پوری کی طرح مع اہل وعیال ومتبعین کٹہیر میں اپنی حکومت دوبارہ قائم کرنے کا موقع مناسب دیکھ کر بھاگ آئے تھے تو صفدر جنگ کو مفروضہ خط میں اس تمام کتھا کے دوہرانے کی جس سے مکتوب الیہ خود واقف تھے بھلا کیا ضرورت تھی ۔کہ بادشاہ درانی سے جنگ چھڑی تھی اعتماد الدولہ قمرالدین خاں قتل ہو گئے تھے۔ اور یہ قتل ان کا محمد شاہ بادشاہ کی وفات سے قبل ہوا تھا اس کے بعد بادشاہ کی وفات ہوگئی وزارت کا معاملہ اس وقت تک مہمل اور معطل پڑا ہے، یہ ساری داستان تو کہلوائی لیکن جس بات کا بیان ضروری ولازمی تھا یعنی بعد وفات بادشاہ فردوس آرام گاہ نئے بادشاہ احمد شاہ کی تخت نشینی اور وہ بھی بقول مؤلف مذکور ''بہ امداد صفدر جنگ'' اس بات کو مولف نے ''وزارت دلوانے'' کی بہتان تراشی کے مقصد سے پردۂ اخفا میں رکھنا ضروری سمجھا۔ یہ اس سلسلہ کا پانچواں کید ہے۔

مطلق العنان شہنشاہیت کے زمانے میں بادشاہوں کے نام سرکاری وغیر سرکاری تمام تحریرات ومکتوبات میں ان کے مقررہ القاب کے ساتھ بالعموم لکھے جاتے تھے سلطنت مغلیہ کے عہد میں عام وخاص سب اس دستور کے سختی سے پابند تھے۔ محمد شاہ بادشاہ کی وفات کے بعد لقب ان کا ''فردوس آرام گاہ'' قرار پایا تھا جو مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک تمام مکتوبات میں لکھا جاتا تھا۔

مولف مذکور نے خود ساختہ اردو عبارت میں اور تو اور خود نواب صفدر جنگ ہی کے قلم سے اپنے مربی و محسن بادشاہ کے نام نامی کو جن کے مراحم و الطاف خسروانہ کی بدولت مناصب اعلیٰ سے سرفراز ہو کر سنام عروج پر فائز ہوئے تھے محض ''محمد شاہ'' لکھوا دیا ہے۔ ساختگی کی یہ ایک مکروہ مثال ہے۔ ناممکن ہے کہ صفدر جنگ بغیر کسی تعظیمی لفظ کے اپنے محبوب بادشاہ کا نام یوں لکھتے اور ''وزارت دلوانے'' کے مراسلہ میں جس کے متعلق احتمال تھا کہ مخالفین کے ہاتھوں پڑ کر عامیانہ طرز انشاء کی بنا پر عتاب شاہی کے باعث حصول مقصد کی ناکامی کا موجب ہوتا۔ ''وزارت دلوانے'' کی بہتان تراشی کے سلسلہ کا یہ چھٹا کید ہے۔

اگلے فقرے میں ایک اور لغو بات نواب صفدر جنگ کے قلم سے یہ بھی لکھوائی ہے کہ ''بعض اراکین سلطنت متفقہ طور پر'' انتظام الدولہ پسر قمر الدین خاں کی وزارت چاہتے ہیں اور ''بعض لوگ یہ تمنا رکھتے ہیں کہ یہ خدمت مجھ سے متعلق ہو''۔①

وہاں تو خود ساختہ مویدین انتظام الدولہ کو ''اراکین سلطنت'' بتایا اور صفدر جنگ کی وزارت کی تمنا رکھنے والوں کو صرف ''بعض لوگ'' کہہ کر بادشاہ وقت جیسی گرامی منزلت شخصیت کے نام نامی کا جو وزارت کی نامزدگی بھی کر چکے تھے جس مقصد سے اخفا کیا ہے ''وزارت دلوانے'' کی بہتان تراشی کے سلسلہ کا ساتواں کید ہے۔

اب اسی سلسلہ میں نواب علی محمد خاں اور حافظ رحمت خاں کے آپس کے من گھڑت مشورہ کا ذکر کرتے ہوئے دو سطر بعد مؤلف نے یہ بھی لکھا ہے کہ

> ''ان دونوں کی یہ رائے قرار پائی کہ چونکہ بادشاہ صفدر جنگ کو چاہتے ہیں اس لیے اگر کسی دوسرے کی امداد کی گئی اور وہ وزیر ہو گیا تو اس کی

① ص ۰۷۔

سازگاری زیادہ عرصہ تک بادشاہ سے نہ رہے گی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ صفدر جنگ پھر وزیر ہوجائیں گے اور اس وقت صفدر جنگ کی مخالفت کی تاب لانا دشوار ہوجائے گا لہٰذا اس وقت کے مصالح ملکی کو پیش نظر رکھ کر یہی طے پایا کہ صفدر جنگ کی امداد کی جائے''۔①

مولف نے اس رکیک منافقانہ استدلال سے اپنی طبع زاد قرارداد کو تو نوازا مگر یہ نہ بتایا کہ روہیلہ علی محمد خاں کی دوسو برس پرانی ۱۱۶۱ھ کی تخلیہ کی گفتگو کب کہاں اور کیسے سن پائی جو یوں بلا ثبوت حوالہ قلم کر ڈالی مگر جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے۔

مولف کی عبارت کا پہلا ہی جملہ ''چونکہ بادشاہ صفدر جنگ کی وزارت چاہتے ہیں'' ساختگی و کذب بیانی کی غمازی کر رہا ہے۔ بھلا علی محمد خاں روہیلہ کو جن کا کوئی دور کا تعلق اور واسطہ دربارشاہی سے نہ تھا بلکہ جو اس وقت ایک سرکش باغی کی حیثیت رکھتے تھے۔ نئے بادشاہ احمد شاہ کی اس دلی خواہش کا علم کیسے ہوگیا بحالیکہ ان کے موسومہ جعلی خط تک میں کوئی اشارہ اس بات کا نہ تھا برخلاف اس کے صراحتاً کہا گیا تھا کہ

''بعض ارکان سلطنت متفقہ طور پر'' انتظام الدولہ کی وزارت چاہتے ہیں۔ اور بعض لوگ یہ تمنا رکھتے ہیں کہ یہ خدمت مجھ سے (یعنی صفدر جنگ سے) متعلق ہوجائے''۔②

اس درجہ صراحت کے باوجود علی محمد خاں روہیلہ جنہیں مؤلف نے ''عقیل وشجاع وعالی فہم'' بتایا ہے ''بعض لوگ'' سے مراد بادشاہ سے کیوں لیتے، یا لے سکتے اور اگر بادشاہ وقت ہی وزارت صفدر جنگ کی چاہتے تھے تو کسی اور کی امداد کی پھر ضرورت ہی کیوں ہوتی۔ وزیر کا تقرر تو بادشاہ ہی کی مرضی اور حکم سے ہوتا نہ کسی غیر

① ص ۷۰۔ ② حوالہ مذکورہ۔

متعلق شخص کی امداد سے یہ سب خرافات مولف کی طبع زاد ہے نہ جعلی خط کا کوئی وجود تھا اور نہ وزارت دلوانے کی قرار داد اور اس کے محرکات کا۔ مولف کی ساختگیوں پر سرسری نظر ڈالنے سے دروغ بافی کی شناعت اور واضح ہو جائے گی۔

عینی شاہد اور ہم عصر مورخین کے یہ بیانات آپ پڑھ چکے ہیں کہ صفدر جنگ نے نئے بادشاہ احمد شاہ کی تخت نشینی کا پانی پت میں اہتمام کیا تھا اور سلطنت ہندوستان کی مبارکباد پیش کر کے آداب بجالائے تھے بادشاہ نے فرمایا تھا:

''ہمیں یہ سلطنت، تمہیں اس کی وزارت مبارک''۔

گویا غیر رسمی طور پر تو اسی وقت سے نامزد وزیر ہو گئے تھے۔ مولف نے نواب موصوف کے نام کا اخفا کر کے لکھ دیا کہ

''سرداران فوج'' نے تخت نشینی کا اہتمام و اعلان کیا تھا''۔

پھر جعلی خط میں بادشاہ کے نام کا اخفا کر کے فرمایا کہ

''بعض لوگ'' تمنا ان کی وزارت کی رکھتے ہیں''۔

یوں بار بار کتمان حق نہ کرتے تو یہ دروغ بافیاں وزارت دلوانے کی کیسے کرتے مگر ایک گتھی سلجھانی پھر بھی یہ باقی رہی یعنی علی محمد خاں دشمن حقیقی اپنا صفدر جنگ کو جانتے تھے۔ محمد شاہ کو صفدر جنگ ہی نے علی محمد خاں سردار روہیلہ کے ابھرتے ہوئے سیاسی اقتدار کا استیصال کرنے پر آمادہ کر کے انہیں گرفتار کرا لیا تھا اور خود مولف نے بھی باخفائے نام بتایا ہے کہ صفدر جنگ روہیلوں کے قدیمی دشمن تھے بلکہ ان کی زندگی کا مخصوص مشغلہ ہی روہیلوں کی تخریب تھا ایسی حالت میں یہ روہیلہ سردار علی محمد خاں اپنے محسن و مربی وزیر قمر الدین خاں کے فرزند انتظام الدولہ کے بجائے اپنے حقیقی اور قدیمی دشمن کو خلعت وزارت دلوانے میں مدد کرنے پر کیوں آمادہ ہو سکتے تھے مولف

نے اس گتھی کو مندرجہ بالا رکیک طرز استدلال سے سلجھانے میں نواب علی محمد خاں جیسے صاحب عزم وحوصلہ مرد شجاع کو جن کے دلیرانہ عزم کا اظہار خود مولف ہی نے ان کا یہ قول نقل کرتے ہوئے کیا ہے کہ

''جب محمد شاہ بادشاہ کی وفات ہو جائے تو دہلی پہنچ کر تخت سلطنت پر بیٹھ جائیں''۔

انہیں ایسا ابن الوقت ومنافق وبزدل ظاہر کردیا کہ آئندہ کسی وقت میں صفدر جنگ کی خیالی مخالفت کی تاب نہ لا سکنے کے خوف سے وہ اپنے حقیقی وقدیمی دشمن کی وزارت قائم کرانے میں مدد دینے پر آمادہ ہو گئے یہ اس سلسلہ کا آٹھواں کید ہے۔

اب یہ ہرزہ گوئی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ

''نواب علی محمد خاں کی علالت کی وجہ سے حافظ رحمت خاں وزارت دلوانے کی اس مہم کے خود ذمہ دار بن گئے۔①

اور

''بہت کچھ سامانِ امارت اور بڑی شان وشوکت کے ساتھ ایک ہزار چیدہ اور کار آزمودہ سواروں کو ہمراہ لے کر دہلی کو روانہ ہوئے''۔

گویا نام نہاد خیالی سامان امارت اور بڑی شان وشوکت کے ساتھ جس کا اس وقت کوئی وجود نہ تھا انہیں دہلی میں اپنے دشمن کی مدد کے لیے محاذ جنگ قائم کرنا تھا چنانچہ مزید فرماتے ہیں کہ

''صفدر جنگ نے انہیں بلا کر کہا تھا: ہم خلعت وزارت حاصل کرنے کے لیے قلعہ معلیٰ جائیں گے انتظام الدولہ خانخاناں کے پانچ ہزار تورانی

---

① ص ۷۰.

سپاہی ہمارے قلعہ میں داخل ہونے میں مانع ہوں گے۔ان کا ارادہ ہے
کہ ہم سے پہلے قلعہ میں پہنچ کر جبراً منصب وزارت حاصل کر لیں۔آپ
طلوع آفتاب سے قبل جنگ کے واسطے تیار ہوکر ہمارے پاس آ
جائیں''①۔

اے سبحان اللہ! حصول وزارت کا کیا انوکھا طریقہ تراشا ہے یعنی جو امیدوار حربی قوت سے مخالف پر غلبہ حاصل کر کے اول قلعہ میں گھس جائے وہی ''جبراً منصب وزارت حاصل کرے'' اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کا شاہکار اسے کہیے یا بریلوی چانڈوخانے کی گپ!

واقعات تاریخ شاہد ہیں کہ یہ انتظام الدولہ تو چند سال پہلے سے صوبیدار اجمیر تھے ②اور صوبہ اجمیر کو ہندو ریاستوں کے قرب واتصال کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل تھی۔اول تو بادشاہ کے حکم اور اذن واجازت کے بغیر کوئی عامل وصوبیدار حاضر دربار نہیں ہوسکتا تھا انتظام الدولہ یوں بغیر اجازت آتے اور پانچ ہزار تورانی سپاہی متعینہ صوبہ اجمیر ساتھ لاتے اور اپنے مستقر اور صوبہ کو قسمت آزماؤں کے لیے خالی چھوڑ آتے تو مستوجب سزا وعتاب شاہی ہوتے یا امیدوار وزارت؟ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ صفدر جنگ نے اپنے ابتدائی ایام وزارت انتظام الدولہ کو اجمیر کی صوبیداری سے تبدیل کر کے بخشی دوم کا خلعت دلوایا اور صوبیداری۔مراد آباد کا انتظام ان کے سپرد کیا تھا③ ماسوائے اس کے نواب صفدر جنگ کے قلعہ میں داخل ہونے نہ ہونے کا تو کوئی مسئلہ ہی نہ تھا وہ تو جیسا آپ پچھلے اوراق میں پڑھ چکے ہیں قلعہ معلیٰ ہی میں سکونت

① ص ۲۷۔
② سیر المتاخرین ج ۳ ص ۸۴۸۔
③ ایضاً ج ۳ ص ۸۷۲۔

پذیر تھے مولف کی لغو بیانیوں کا یہ نواں کید ہے۔

اسی سلسلہ کی یہ چڑے چڑیا کی سی طفلانہ کہانی مولف کی زبانی سنیے فرماتے ہیں:

''تورانی لوگ جو پانچ چھ ہزار کی تعداد میں دروازے (قلعہ) پر کھڑے تھے اوراس فکر میں تھے کہ قلعہ کے اندر داخل ہوجائیں...... جب صفدر جنگ کی سواری مع حافظ رحمت خاں قلعہ کے پاس پہنچی تو ہراساں ہو گئے اور مقابلہ کی تاب نہ لاکر نقش دیوار کی طرح اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہے اور صفدر جنگ بغیر روک ٹوک کے دروازہ قلعہ پر پہنچ گئے...... حافظ رحمت خاں اپنی تمام فوج کے ساتھ تورانیوں کے مقابلہ میں قلعہ کے باہر کھڑے رہے ......صفدر جنگ وزارت ہند کا خلعت پہن کر قلعہ سے باہر آئے ...... تیسرے دن (صفدر جنگ) حافظ رحمت خاں کو بادشاہ کے حضور میں لے گئے اور بادشاہ نے ان کو خلعت گراں بہا، نوبت وعلم اور خطاب نواب مکرم الدولہ حافظ الملک بہادر نصیر جنگ عطا فرمایا۔①

عیب کرنے کو بھی ہنر چاہیے۔ اس لغو بیانی سے تو یہ حقیقت بالکل عیاں ہوگئی کہ ساری داستان سرائی اور ابلہ فریبی خود ساختہ خطاب کی خاطر کی گئی ورنہ حافظ رحمت خاں نہ کبھی مکرم الدولہ کہلائے نہ نصیر جنگ اور نہ سلطنت کی کوئی خدمت کر سکے جس کے صلہ میں کوئی اعزاز یا خطاب ملتا۔ یہ اس سلسلہ کا دسواں کید ہے۔

مولف کو اپنی کتاب کی تالیف یا پہلے ایڈیشن کی طباعت کے وقت تک ایسا کوئی قصیدہ و قطعہ تاریخ ہاتھ نہ لگ سکا تھا جس کے اشعار میں ''نواب عالیشان'' و نائب ظل الٰہی'' و ''نواب سخنور'' جیسے الفاظ بلا اظہار نام آئے ہوں تاکہ بآسانی حافظ رحمت خاں

① ص ۲۷.

پر چسپاں کیے جاسکیں۔عرصہ دراز بعد پاکستان میں دوسرا ایڈیشن چھپوا یا کسی مجہول الحال شاعر کا ایک قصیدہ ہفت بند مع قطعہ تاریخ جس میں مندرجہ بالا الفاظ مختلف اشعار میں آئے ہیں یہ کہہ کر درج کر دیا کہ باوجود تلاش بسیار حافظ رحمت خاں کے وابستہ دولت شاعر کا حال معلوم نہ ہوسکے جس نے یہ قصیدہ ان کی تشریف آوری کی تہنیت میں پیش کیا تھا مگر یہ بات بھی تعجب سے خالی نہیں کہ یہ قصیدہ ہفت بند وقطعہ تاریخ حافظ رحمت خاں کے کسی فرد خاندان سے دستیاب نہ ہوا نہ روہیل کھنڈ و بریلی کے کسی کتب خانہ میں ملا نہ کسی دوسرے مولف نے قصیدہ کا کوئی بند کوئی شعر درج کیا۔

مولف کو ہاتھ لگا تو حبیب گنج ضلع علی گڑھ میں نواب صفدر یار جنگ مرحوم کے ذاتی کتب خانہ کے ذخیرہ میں اور اسے شائع بھی کیا تو نواب صاحب موصوف کی وفات کے بعد۔لیکن قطعہ اور قطعہ تاریخ کی اندرونی شہادتوں سے مولف کے اس دعوے کی پوری تکذیب ہو جاتی ہے کہ حافظ رحمت خاں کی واپسی جنگ پانی پت کی تہنیت میں ۱۱۷۴ھ میں پیش کیا گیا تھا۔ حافظ مذکور جو ۱۱۸۸ھ میں بعمر ۶۶ سال مقتول ہوئے تھے۔ ۱۱۷۴ھ میں باون برس کے دراز ریش بزرگ تھے۔ بالوں میں سپیدی نمایاں تھی۔قصیدے کے پہلے ہی یہ دو شعر پڑھ کر غور فرمایئے کہ شاعر شیریں مقال آیا باون برس کے دراز ریش حافظ کی تہنیت میں قصیدہ پیش کر رہا ہے یا اپنے ایک سبزہ آغاز ممدوح کو جو ابھی عالم شباب کی منزل سے گزر رہا ہے۔

وحش اللہ آں نگار ناز پر در میرسد
نوبہار سرود شمشاد وصنوبر میرسد
نگ مرکز دیدۂ صیقل گر آنیہ شد
عارضش از سبزۂ خط باصفا تر میرسد

قصیدہ گو شیعہ مسلک تولائی نواب کی مدح میں کہہ رہا ہے نہ سنی مذہب حافظ کی ثنا وصفت میں کہتا ہے ۔

ہوا دارِ وصی مصطفیٰ کز روی قدر
ذات پاکش نسخہ ناموس اکبر می رسد
زتولای شہ مرداں وصی مصطفیٰ
در جہاں مثلے ندارد ہمچو بوذر مرحبا

روہیل کھنڈ و بریلی میں تشریف آوری کا نہیں آمد کشمیر جنت نظیر کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ۔

نمروقتے میر سدائے گلشن کشمیر ما
گرکنی در یوزہ عمر جاوداں وقتست وقت
رہ نوابِ عالی شاں بسامانِ دگر
خطہ جنت نشاں شد باغِ رضوان دگر

شاعر کا ممدوح فن طب کا بھی ماہر ہے۔ حافظ رحمت تو فن طب کی الف بے سے بھی واقف نہ تھے کہتا ہے ۔

اے حکیم خانِ عالیشان فلاطونِ زماں
گرکنی گستاخ مارا عرضہ خواں وقتست وقت
تا قدم زد آں فلاطون فطرت و بقراط ہوش
خطۂ جنت نشاں گردید یونانِ دگر

غرض یہ کہ یہ قصیدہ سنی مذہب حافظ رحمت کے لیے نہیں کسی شیعہ مسلک تولائی نواب کے بارے میں ہے جنہیں کبھی ''دوستدار ساقی کوثر'' کہتا ہے کبھی ''ہوادوصی

مصطفیٰ''، کبھی''تولائے شہ مرداں''اور کبھی''یا علی مدد''کا نعرہ لگا کر کہتا ہے۔

ہست معنی ''میرزا جویا'' کہ سرفطرتست

ہم معرف ہم مربی ہم ضماں آوردہ ام

بریلوی مولف بتائیں''مرزا جویا''سے مراد کیا حافظ رحمت خاں روہیلہ سے ہے؟

عام دستور ہے کہ قصیدہ کی پیشانی کی عبارت بڑے اہتمام سے لکھی جاتی ہے۔ ممدوح کا نام مع القاب وآداب، قصیدہ پیش کرنے کی تاریخ ومقام درج ہوتا ہے۔

مولف نے نہ صرف قصیدے کی پیشانی کی وہ ساری فارسی عبارت ہی ترک وحذف کر دی جو قصیدہ گو نے عام دستور کے مطابق اپنے ممدوح کی شان میں بصریح نام والقاب یقیناً لکھی تھی بلکہ قصیدے کے تقریباً ہر بند سے وہ شعر بھی حذف کر دیئے جو مولف کے فہم ودانست میں حافظ مذکور کے حالات سے بین طور پر مطابقت نہ رکھتے تھے چنانچہ نتیجہ اس تصرف بے جا کا ہر صاحب ذوق بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ ساتوں بندوں کی تعداد اشعار میں غیر معمولی، بے ترتیبی ہے۔ پہلے بند میں تو ۱۶ شعر ہیں، دوسرے میں ۱۲، تیسرے میں صرف ۱۰، چوتھے میں ۱۳، پانچویں اور چھٹے میں ۱۲، ۱۲ اور ساتویں میں ۱۰۔ تعداد ابیات کا یہ فرق وتبائن و بے ترتیبی مؤلف کے تصرف بے جا کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے۔

مولف کو اپنی فارسی دانی کے محدود ہونے کا اقرار واعتراف ہے شاید یہی وجہ ہے کہ قصیدے کے بعض وہ شعر جن کے متعلق سطور بالا میں گفتگو آ چکی ہے ان کے دست تصرف سے پھر بھی ایسے باقی بچ رہے جو زبان حال سے شہادت سرقہ کی دے رہے ہیں مگر چوری کے ساتھ ذرا یہ سینہ زوری بھی ملاحظہ ہو کہ کسی دوسرے شخص کی تاریخ قدوم کا

قطعہ جس میں ''نواب اور نائب ظل الٰہی'' الفاظ آئے ہیں قصیدے کی طرح مؤلف نے وہ بھی ہتھیا لیا اور عجب بھونڈے طریقے سے اپنے ممدوح حافظ رحمت کے جنگ پانی پت کی واپسی سے متعلق کر دیا۔ شاعر نے تو پیشانی قطعہ کی ''التاریخ قدوم نواب...... مدظلہ السامی'' مع تصریح نام لکھی تھی مولف صاحب نے نام کا اخفا کر کے مہمل لفظ ''سخنور مآب'' بجائے نام کے لکھ دیئے۔ محدود فارسی دانی نے صحیح لفظ ''سخن مآب'' کی مٹی پلید کروانے کے ساتھ ہی بلا اندراج نام ''مدظلہ السامی'' بھی لکھوا دیا پھر ایک اور شرمناک کارستانی یہ کر ڈالی کہ مصرعہ تاریخ میں شاعر نے ''قدوم نواب'' کی رعایت سے لفظ ''آمدہ'' لا کر اور مصرعہ اولیٰ میں لفظ تعجیل کے حرف ت کا تخرجہ کر کے ۱۱۹۳ھ تاریخ نکالی تھی چنانچہ کہا تھا۔

سر برآورد بہ تعجیل وبگفت/ ۱۱۳ آمدہ نایب ظل الٰہی/ ۸۔۱۰۔ ۱۱۹۳ھ

''بہ تعجیل'' بمعنی ''از تعجیل'' اور مراد ''سر برآورد از تعجیل'' سے تعجیل کے حرف کے تخرجہ سے ہے نہ مصرعہ تاریخ کے کسی لفظ یا حرف کے تخرجہ سے۔ بقیہ حروف ع ج ی ل کے عدد ۱۱۳ کو مصرعہ تاریخ ''آمدہ نایب ظل الٰہی'' کے مجموعہ عدد ۱۰۸۰ میں جمع کر کے شاعر نے قدوم ممدوح کا سال ۱۱۹۳ھ نکالا تھا، عقل کے اندھے کے سواء معمولی فہم کا شخص بھی دیکھ سکتا ہے کہ یہ چاروں لفظ مصرعہ تاریخ کے باہم مربوط ہیں اور بگفت کہنے کے بعد تو کسی قاعدے قرینے سے ان لفظوں میں سے کسی لفظ کا تو کیا کسی حرف کا نہ تخرجہ مطلوب ہے اور نہ باعتبار مفہوم ممکن مگر مولف کی دیدہ دلیری دیکھیے مصرعہ تاریخ کے لفظ ''آمدہ'' ہی پر جو تاریخ قدوم کا جزو لاینفک ہے قصائی کی سی اپنی تیز چھری چلا دی اور اس پر فریب طریقہ سے ۱۱۷۴ھ برآمد کر کے کہہ دیا کہ حافظ رحمت خاں کی جنگ پانی پت سے واپسی کے موقع پر شاعر نے یہ قطعہ کہا تھا۔ اب وہ پر فریب طریقہ ملاحظہ ہو۔

سر برآوردہ بہ تعجیل وبگفت/ ۱۱۳   آمدہ نایب ظل الٰہی ۶۱۔ ۱۰/ ۱۱۷۴ھ

غرض یہ کہ ''نائب ظل الٰہی'' تو عیاری سے حافظ مذکور کے لیے کہلوا دیا مگر یہ نہ بتایا کہ حافظ صاحب کب اور کس ''ظل الٰہی'' کے نائب یا وزیر رہے تھے واقعات تاریخ شاہد ہیں کہ حافظ بے چارے کو تو کبھی روشناس شاہی ہونا نصیب نہ ہوا نہ کوئی شاہی منصب یا اعزاز کبھی ملا۔ پھر لطف یہ کہ قطعہ کا کوئی شعر نہ حال پر ان کے چسپاں ہے اور نہ ان اشعار کا کوئی تعلق جنگ پانی پت سے معلوم ہوتا ہے نہ یہ لفظ ''حضرت شہنشاہی'' شاہ ابدالی پر منطبق ہو سکتے ہیں اور نہ شاہ ابدالی یا افغانستان کا کوئی بادشاہ کبھی شہنشاہ کہلایا۔ اب اس قطعہ کے اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

للہ الحمد کہ والا گہرے

آمد از حضرتِ شہنشاہی

آنکہ آوازۂ جود وکرمش

خوب بگرفتہ از مہ تابماہی

از پئے سال قدومش کہ بود

مایۂ شوکت والا جاہی

من سراپا شدہ فکر تاریخ

کہ خبر یافت بریں آگاہی

سر برآورد بہ تعجیل وبگفت

آمدہ نایب ظل الٰہی

آپ نے دیکھا قطعہ تاریخ کے کسی شعر میں نہ جنگ پانی پت کا اشارتاً وکنایتاً کوئی ذکر ہے اور نہ شرکت جنگ سے کسی کے واپس آنے کا بلکہ شاعر تو کسی عالی مرتب

نواب کے جود و کرم کی ستایش کر رہا ہے جو بارگاہ شہنشاہی میں باریاب ہو کر آیا ہے اپنے ممدوح کی سخنوری کا وہ اشارہ تک نہیں کرتا۔

الغرض نواب صفدر جنگ کی وزارت کے سلسلہ میں حافظ رحمت خاں کی شخصیت کو اچھالنے کا یہ شرمناک کید ہے یعنی کسی دوسرے شخص کے قصیدے ہفت بند وقطعہ تاریخ قدوم میں عیارانہ ساختگیوں سے تصرف بے جا کر کے ''نایب ظل الٰہی'' وغیرہ الفاظ ان پر چسپاں کرنے کا نمبر شمار کے اعتبار سے یہ گیارہواں کید ہے۔

مندرجہ بالا گیارہ کیدوں کے ضمن میں جو اٹل حقائق تاریخ بیان ہوئے ہیں ان کی روشنی میں بریلوی مؤلف کی غلط بیانیوں اور لایعنی خرافات کی حقیقت تو بخوبی منکشف ہو چکی اعادہ ان کا مقصود نہیں البتہ ''صفدر جنگ کی احسان فروشی'' کے سفیہانہ عنوان سے جو بدگوئی کی گئی ہے چند لفظ اس بارے میں لکھ کر اس گفتگو کو جو باوجود مختصر بیانی کے قدرے طویل ہوگئی۔ ختم کرتا ہوں۔

مستند کتب تاریخ کی تصریحات سے ثابت ہے کہ نواب صفدر جنگ کی وزارت سے تقریباً تین سال قبل ۱۱۵۸ھ میں روہیلوں کی متمردانہ سرگرمیوں وسرکشیوں کے سد باب کے لیے جو انتظام مملکت کے لیے خطرہ کا موجب ہو رہی تھیں محمد شاہ بادشاہ نے بمشورہ وبمعیت وزیر قمر الدین خاں ودیگر اعیان سلطنت علاقہ کٹھیر میں خود تشریف لا کر سردار روہیلہ نواب علی محمد خاں کو گرفتار کر کے ان کے تمام اموال واسباب وسامان ریاست کو بحق سرکار مغلیہ ضبط کر لیا اور اس طرح روہیلوں کی ابھرتی ہوئی خود مختارانہ سیاسی قوت کا استیصال کرا دیا مگر وزیر موصوف نے از خود اور بعض دوسرے امراء خصوصاً والی فرخ آباد کی عرض معروض پر ان کی جان چھڑانے کی کوشش میں دونوں ہاتھ ان کے باندھ کے عفو تقصیرات کے لیے ۴ جمادی الاولیٰ مذکور کو بادشاہ کے حضور

میں پیش کیا وزیر کی عرض داشت کو بادشاہ نے مراحم خسروانہ سے شرف قبولیت بخشا ہاتھ ان کے کھلوا کر باحتیاط مزید انہیں وزیر ہی کے سپرد کر دیا۔

بادشاہ باسترضائے وزیر حکم کشادن دستہائے او بوزیر دادہ فرمود کہ ایں را حوالہ شما فرمودیم۔①

وزیر موصوف نے کچھ دنوں اپنی نگرانی میں رکھ کر جب سردار روہیلہ علی محمد خاں کے ناصیہ احوال سے آثار وفاداری سلطنت ملاحظہ کر لیے شاہی عمال کے زمرے میں منسلک کر کے فوجداری سرہند پر مامور کر دیا جہاں وہ مع اپنی جماعت روہیلہ کے جن میں ان کے جماعت دار حافظ رحمت بھی شامل تھے۔ اوائل ۱۱۵۹ھ میں پہنچ کر تقریباً دو سال خدمات مفروضہ انجام دیتے رہے مگر روہیل کھنڈ کی حکومت کا خیال ان کے دل سے کبھی نہیں گیا تھا۔

شروع ۱۱۶۱ھ میں جب احمد شاہ ابدالی نے تسخیر ہند کے منصوبہ سے صوبہ پنجاب پر چڑھائی کی شاہی افواج بسرکردگی ولی عہد سلطنت وزیر قمر الدین خاں وصفدر جنگ وغیرہ امرائے مغلیہ مقابلہ کے لیے بھیجی گئیں۔ مقام سرہند پر جیسا تفصیلاً بیان ہوا۔ ۱۵ لغایت ۲۸ ربیع الاول سنہ مذکور جنگ ہوتی رہی ۲۲ ربیع الاول کو وزیر موصوف توپ کا گولہ لگنے سے ہلاک ہو گئے۔ وزیر مرحوم کے مقتول ہوتے ہی راجپوت سرداروں کی طرح جو شاہی فوج کی ہزیمت کا خیال کر کے بھاگ نکلے تھے نواب علی محمد خاں بھی روہیل کھنڈ میں اپنی حکومت دوبارہ قائم کرنے کا موقع مناسب جان کر اور اپنی کثیر جماعت روہیلہ کو ساتھ لے کر میدانِ جنگ سے بجانب روہیل کھنڈ فرار ہو گئے۔

ہم عصر مورخ نے ''گریختن علی محمد خاں روہیلہ از سرہند درسیدن بہ بریلی''

---
① سیر المتاخرین ج ۳ ص ۸۵۵.

کے عنوان سے یہ سب احوال لکھے ہیں اور کہا ہے کہ:

''علی محمد خاں روہیلہ از سرہند کہ بامروز یر حاکم آنجا بود فرصت یافتہ مع سی چہل ہزار نفر افغان و روہیلہ از راہ سہارنپور بوڑیہ و کنجورہ عبور جمنا نمودہ عازم ضلع مراد آباد و بریلی وغیرہ ملک قدیم خود گردید و مراد آباد وغیرہ مسخر کردہ فوجداران خود نشانیدہ عبور گنگا نمود''۔①

نواب علی محمد خاں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وزیر اعظم کی ہلاکت سے شاہی فوج غنیم کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکے گی۔ شکست ہو کر انقلاب سلطنت کا ہو جائے گا۔ علاقہ کٹھیر پر دوبارہ قبضہ کرنے کو سرہند سے بھاگ پڑے تھے مگر وہ جو کہتے ہیں۔

من درچہ خیالیم وفلک درچہ خیال

ابھی حدود روہیل کھنڈ میں بھی نہ پہنچ پائے تھے کہ نواب صفدر جنگ کی بروقت تدبیر اور جانفشانی سے جیسا بیان ہو چکا فتح خدا ساز شاہی فوج کو نصیب ہو گئی تاریخ بھی اس کی فتح خدا ساز/ ۱۱۶۱ھ ہوئی۔ کچھ دن بعد جب بریلی میں سردار روہیلہ کی آمد آمد کی خبریں مشہور ہوئیں۔ سید ہدایت علی خاں اسد جنگ حاکم بریلی کے افغان ملازمین نے بہ بہانہ وصولیابی مطالبات ان کے مکانات واقع قلعہ بریلی کا محاصرہ کر رکھا تھا اور یہ وہ دن تھے جب محمد شاہ کی وفات ہو جانے پر نئے بادشاہ احمد شاہ کی تخت نشینی جنہیں دشمن کے نرغے میں چھوڑ کر بھاگ آئے تھے نواب صفدر جنگ کے اہتمام سے پانی پت میں ہو چکی تھی اور بادشاہ دارالسلطنت پہنچ گئے تھے۔ ان حالات میں علی محمد خاں کو یوں سرہند سے فرار ہو کر علاقہ کٹھیر پر دوبارہ قبضہ کر لینے کے بارے میں خوف و ہراس ہوا۔ مبادا عتاب شاہی میں گرفتار ہو کر مثل سابق استیصال کی نوبت نہ آ جائے اس کا

① سیر المتاخرین ج ۳ ص ۸۶۷۔

اظہار بھی خود انہوں نے حاکم بریلی کے سفارشی قطب الدین ① محمد خاں سے اس وقت کر دیا تھا جب خان مذکور نے حاکم بریلی کی گلوخلاصی اور سفر واپسی دہلی کے بندوبست کے بارے میں گفتگو کی تھی علی محمد خاں نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا تھا اور اپنے عملہ کو سامانِ سفر مہیا کرنے کی تاکید کرتے ہوئے خان مذکور سے بھی وعدہ لے لیا تھا کہ بذاتِ خود وہ دہلی نہ جائیں انہیں اندیشہ تھا کہ پشتینی حاکماں مراد آباد کے یہ خاندانی فرد دہلی پہنچ کر بہ امداد شاہی ان کے استیصال کی تدابیر نہ کرنے لگیں۔

مؤلف سیر المتاخرین منشی غلام حسین طباطبائی جو اپنے والد ہدایت علی خاں حاکم بریلی کے پاس ان ایام میں موجود تھے یہ سب احوال اپنے چشم دید بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> علی محمد خاں ''می ترسید کہ (قطب الدین محمد خاں) بہادر باتفاق امرائے حضور و بادشاہ استمداد نمودہ در فکر استیصال او شوند''۔ ②

ہر خطا وار و مجرم شاہی کی دلی کیفیت یہی ہوتی ہے۔ بریلوی مولف نے روہیلہ سردار کے دوبارہ آمد و تسلط کا عجب بے تال و سر کا راگ الاپا ہے یعنی علی محمد خاں کے ساتھ ان کے جماعت دار حافظ رحمت خاں کو نتھی کر کے کیسی غلط بیانی اور کس ڈھٹائی

---

① یہ بیٹے تھے شیخ عظمت اللہ خاں سابق حاکم مراد آباد کے جن کی سرکار میں خود علی محمد خاں روہیلے ابتدائی ایام میں ملازم رہے تھے۔ فرخ سیر بادشاہ کے زمانہ سے روہیلوں کے غلبہ تک حکومت مراد آباد اسی خاندان میں مسلسل رہی تھی۔ ۱۱۵۸ھ میں جب شاہی فوج نے علی محمد خاں کو گرفتار اور روہیلوں کو خارج البلاد کر کے اس علاقہ میں ان کے اجتماع پر پابندی عائد کر دی تھی فرید الدین خان ولد شیخ عظمت اللہ خاں مذکور حاکم مراد آباد مقرر کیا گیا تھا۔ اور بعد وفات علی محمد خاں جو اِن کے بریلی پہنچنے کے چند ماہ بعد ہو گئی تھی۔ قطب الدین محمد خاں مذکور نے وزیر قمر الدین خاں کے فرزند کلاں خانخاناں انتظام الدولہ سے جنہیں نواب صفدر جنگ کے ابتدائی ایام وزارت میں یہ علاقہ سپرد ہو گیا تھا سند انتظام کی حاصل کر لی تھی مگر روہیلوں سے آویزش میں مقتول ہو گئے تھے۔

② سیر المتاخرین ج ۳ ص ۸۶۸.

سے یہ چرپوز طبع زاد کہانی لکھ ڈالی ہے کہ احمد شاہ درانی کے حملہ کے وقت محمد شاہ بادشاہ ارکانِ سلطنت نے اس اندیشہ سے کہ نواب علی محمد خاں اور حافظ رحمت خاں مبادا بہ سبب ہم قومی حملہ آور سے موافقت پیدا کرلیں۔ یہ رائے قائم کی کہ

''نواب علی محمد خاں کو دوبارہ حکومت روہیل کھنڈ پر سرفراز کر دیا جائے تا کہ وہ سرہند کو جو سرحد افغانستان سے قریب تر ہے چھوڑ کر روہیل کھنڈ روانہ ہو جائیں''۔

علی محمد خاں تو اس وقت ملازمِ سرکار تھے اور بحیثیت فوجدار① جسے مولف نے ابلہ فریبی سے صوبیدار لکھا ہے سرہند میں تعینات تھے ایک فوجدار کی ایسی کیا قوت ہو سکتی تھی اور بادشاہ اور ارکان سلطنت کو اس کی غداری کا ایسا کیا خوف ہوتا؟ کچھ خدشہ ہوتا بھی تو گرفتار کرا کے سزا دی جاتی یا اسی علاقے کی حکومت پھر اس کے سپرد کر دی جاتی جہاں سے تین سال قبل سرکشی کے جرم میں گرفتار ہو کر خارج البلد کر دیا گیا تھا۔

بریلوی مولف نے روہیلہ فوجدار ملازم سرکار مغلیہ اور ابدالی بادشاہ حملہ آور میں بر بنائے ہم قومی موافقت ہو جانے کے گویا ثبوت میں سرہند جیسے بعید تر مقام کو سرحد افغانستان سے قریب تر بتاتے ہیں۔ ذرا دیکھئے کیسی میکیاولی فریب کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔کون نہیں جانتا کہ سرحد افغانستان سے قریب تر مقام تو لنڈی کوتل و جمرود ہیں پھر پشاور و اٹک کے بعد سے مغربی پنجاب کا وسیع رقبہ لاہور تک محیط ہے لاہور کے بعد سے بھارتی علاقے میں امرتسر و جالندھر ولدھیانہ کے بعد کہیں سرہند آتا ہے جو سرحد افغانستان سے کوئی چار سو میل فاصلے پر مشرقی پنجاب کے بھارتی علاقے کے اس حصے

① سرہند تو صوبہ نہیں تھا صوبہ دہلی کے ماتحت تھا اور اس منجملہ ۲۲ سرکاروں یعنی ضلعوں میں سے ایک ضلع تھا۔مولف کی یہ غلط بیانی سردار روہیلہ کی حیثیت بڑھانے کی غرض سے ہے۔

میں واقع ہے جہاں سے پچاس ساٹھ میل مسافت پر بعبور دریا سیدھا راستہ جسے روہیلہ سردار نے بحالت فرار اختیار کیا تھا۔ روہیل کھنڈ جاتا ہے سرہند اور روہیل کھنڈ یہ دونوں تو بتفاوت یک دیگر سرحد افغانستان سے چار پانچ سو میل فاصلے کے بعید تر مقامات ہیں نہ قریب تر۔

غرض یہ کہ طرح طرح کی دروغ بافیوں سے جو نواب صفدر جنگ کو وزارت دلوانے کی خود ساختہ لچر کہانی میں بریلوی مولف نے کی ہیں روہیلہ سرداروں کی شخصیتوں کو ایسا بانس پر چڑھایا ہے کہ مغلیہ اور ابدالی بادشاہ بھی ان کی موافقت حاصل کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔

مغلیہ بادشاہ کے خوف و ہراس کا تو یہ سین کھینچا ہے کہ اپنے ملازم روہیلہ فوجدار کے بربنائے ہم قومی حملہ آور سے مل جانے کے خوف اور ڈر سے حکومت روہیل کھنڈ کا فرمان ہی ''نافذ'' کرادیا اس پر مستزاد یہ کہ ابھی نام نہاد فرمان پہنچا بھی نہ تھا ابدالی بادشاہ کا ایک خط بھی اس مضمون کا بھجوا دیا کہ

''اس وقت تم ہماری مدد کرو تو ان شاء اللہ بوقت حصول سلطنت ہند خدمت وزارت تمہارے سپرد کی جائے گی''۔①

گویا وہ دونوں مغلیہ و ابدالی بادشاہ جن کی افواج کی تعداد علی الترتیب ایک لاکھ ستر ہزار تھی۔ روہیل فوجدار سرہند کی موافقت کے محتاج تھے۔ یہ لچر و چرپوز باتیں جب مؤلف کے ہی دماغ کی پیداوار ہوں حوالہ و ثبوت ہی کیا پیش کرتے۔ اولاد اخلاف رحمت خاں سے جلب منفعت کی خاطر جس کا اظہار خود ہی کر بھی دیا ہے جو چاہا لکھ مارا۔

① ص ٦٨.

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

حکومت روہیل کھنڈ اور وزارت ہند کی پیشکش سے روہیلہ سرداروں کی منزلت تو فہم ناقص میں بڑھائی، مگر معناً انہیں غیر وفادار، منافق وغدار بھی ٹھہرا دیا۔ حقیقت واصلیت جو آپ ملاحظہ کر چکے ہیں صرف اتنی تھی نواب علی محمد خاں اپنی کھوئی ہوئی حکومت روہیل کھنڈ کو دوبارہ حاصل کرنے کے موقع مناسب کی تاک میں تھے۔ سیاسی اقتدار کا جسے بھی ایک مرتبہ چسکا لگ جائے اس کے قائم اور گرفت میں رکھنے کو دھوکہ، فریب، بے وفائی وغداری ہزار جتن کر گزرتا ہے آپ نے دیکھا نواب علی محمد خاں کس نازک وقت میں اپنے ولی نعمت سے بے وفائی کر کے سرہند سے بھاگ کر بجنور کی جانب سے اپنے سابقہ علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ بادشاہ سے بے وفائی کر کے بھاگے تھے عمر نے بھی وفا نہ کی۔ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ کو جب بریلی پہنچے سرطان کے موذی ومہلک مرض میں مبتلا ہو کر چند ماہ بعد شوال ۱۱۶۱ھ میں مر گئے ان کی وفات کے بعد حافظ رحمت خاں اور دوندے خاں نے کہ ان دونوں نے اپنی ایک ایک بیٹی اپنے آقا زادوں فرزندانِ علی محمد خاں کے عقد میں دے رکھی تھی دامادوں کے حصے کے بہانے سردار روہیلہ کے مسخرہ علاقہ کو تقسیم ① کر کے ایک ایک حصے پر خود قابض ومتصرف ہو گئے باقی فرزندانِ علی محمد خاں کی معاش کے لیے چھوڑ دیا۔

بریلوی مولف نے ان واقعات کو جو سردست ہمارے موضوع اور دائرہ بحث

---

① ہم عصر مورخ طباطبائی نے نواب علی محمد وفات کے تذکرے میں حافظ رحمت خاں اور دوندے خاں کے علاقہ تقسیم کرنے کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے:

''واتباع او مثل حافظ رحمت ودوندے خاں وغیرہ کہ ہر یکے پدر زمان یکے از پسران علی محمد خاں بود بیہانہ نام داماد خود ہا ممالک مذکورہ مسخرہ را تقسیم ساختہ بقابوئے خود آور دند برائے دامادہائے خود بقدر معاش انہا جاہا علحدہ کردہ بانہا دادہ باقی را خود قابض وبانہایت جاہ چشم وفوج وغدم بودند''۔ سیر المتاخرین ج ۳ ص ۸۷۳۔

سے خارج ہیں بری طرح مسخ کر کے پیش کیا ہے سن وفات بھی علی محمد خاں کا ۱۱۶۱ھ کے بجائے ایک سال بعد ۱۱۶۲ھ بتایا ہے اور جس مقصد سے بتایا ہے وہ بھی نواب صفدر جنگ کو وزارت دلوانے کی کذب بیانی کے سلسلہ کا کید ہے نمبر شمار کے اعتبار سے بارھواں کید ہے جو حسب ذیل تصریحات سے واضح ہے:

مسٹر الطاف علی بریلوی نے تالیف ''حیات حافظ رحمت خاں'' کے صفحہ نمبر ۸۴ پر بحوالہ کتاب عماد السعادت یہ بتایا ہے کہ

''جس وقت محمد شاہ بادشاہ کی وفات ہوئی نواب علی محمد خاں صاحب فراش ہو رہے تھے''۔

بادشاہ کی وفات ۲۷ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ کو ہوئی تھی۔مصرع تاریخ ہے۔

یائے یائے رفت از جہاں محمد شاہ/ ۱۱۶۱

اس کے دو دن بعد ولی عہد احمد شاہ تخت نشین ہوئے تھے۔تاریخ جلوس ہے۔ سپہر سلطنت افزود جلوہ/ ۱۱۶۱ھ۔

پچھلے اوراق میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ نئے بادشاہ احمد شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی عہدہ وزارت غیر رسمی طور پر نواب صفدر جنگ کے سپرد کر دیا تھا اور رسمی طور پر خلعت وزارت سے وہ (جیسا تفصیلاً بیان ہو چکا ہے) ۴ رجب ۱۱۶۱ھ کو سرفراز ہوئے تھے۔

بریلوی مؤلف نے وزارت دلوانے کی خود ساختہ لچر کہانی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

''نواب صفدر جنگ کے حسب الطلب علی محمد خاں خود بوجہ ''اپنی سخت علالت'' کے (ص ۷۰) دہلی نہ جا سکے تھے حافظ رحمت خاں کو خط دے کر بھیجا جس میں لکھا تھا کہ

''بیماری کے غلبہ کی وجہ سے نہیں آ سکتا ہوں''۔①

مولف ہی کے قول سے ثابت ہے کہ محمد شاہ بادشاہ کی وفات کے زمانے سے جو ۱۱۶۱ھ میں ہوئی تھی نواب صفدر جنگ کے وزیر ہونے کے وقت تک جو ۴ رجب ۱۱۶۱ھ کو خلعت وزارت سے سرفراز ہوئے تھے۔ نواب علی محمد خاں بستر علالت پر پڑے ہوئے تھے۔ پھر ان کی علالت نے ان ایام میں جب وزارت دلوانے کی طبع زاد کہانی کے سلسلے میں حافظ رحمت خاں کو دہلی میں موجود بتایا ہے ایسی شدت اختیار کر لی تھی کہ جینے کی امید باقی نہ رہی تھی۔

خود مؤلف ہی کا بیان ہے کہ

''ہنوز حافظ الملک دہلی میں تھے کہ نواب علی محمد خاں کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ میں قریب المرگ ہوں آپ فوراً آنولہ تشریف لایئے۔ یہ خط صفدر جنگ کو دکھایا اور رخصت حاصل کر کے داخل روہیل کھنڈ ہوئے''۔②

آنولہ پہنچ کر مریض کی جو حالت دیکھی وہ بھی مؤلف ہی کے الفاظ میں پڑھیے فرماتے ہیں:

''جس وقت حافظ الملک نے نواب علی محمد خاں سے ملاقات کی تو اس وقت مرض استسقا نے ان پر پورا غلبہ کر لیا تھا اور زندگی کی تمام امیدیں منقطع ہو چکی تھیں۔ تمام بدن گھل گیا تھا اور ہڈیاں ہی ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں''۔③

جس مریض کی اس درجہ نازک حالت آخر ماہِ رجب یا شروع ماہ شعبان

① ص ۷۱.
② ص ۷۳.
③ ص ۷۴.

۱۱۶۱ھ میں ہوگئی ہو جو مولف نے مندرجہ بالا عبارت میں بیان کی ہے اس کا خاتمہ مرض استسقا سے یا مرض سرطان سے چند دن نہ سہی تو چند ہفتے میں یقیناً ہو گیا ہو گا۔ چنانچہ شاہ حمزہ صاحب نے کشف الاستار میں ان کی تاریخ وفات روز عید شوال ۱۱۶۱ھ لکھی ہے۔ اسی کی تائید دوسرے ہم عصر مورخ طباطبائی کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ

''علی محمد خاں روہیلہ ...... بعد ورود ملک قدیم خود ...... وتشریف آوردن والد مرحوم بشاہجہاں آباد چند ماہ زندگی نمود و بمرض سرطان کہ بر پشت او درہماں ایام بہم رسیدہ بود درگذشت''۔①

غرض یہ کہ ہمعصر مورخین کی تصریحات سے تاریخ وفات ۳ شوال ۱۱۶۱ھ ثابت ہوتی ہے اس کے برخلاف بریلوی مولف نے ۳ ماہ شوال ۱۱۶۲ مطابق ۱۴ ماہ ستمبر ۱۷۴۹ء قرار دے کر مادہ تاریخ بھی ایک عدد کی زیادتی سے ''ہے ہے افغان، ہے'' / ۱۱۶۲ھ درج کر دیا ہے مگر وزارت دلوانے کی خود ساختہ کہانی میں یہ نہ بتایا کہ حافظ صاحب جو ۱۱۶۱ھ میں نواب صفدر جنگ کو وزارت دلوانے دہلی گئے تھے تو ۴ رجب ۱۱۶۱ھ کے بعد جب نواب صاحب موصوف خلعت وزارت سے سرفراز ہو گئے تھے سال سوا سال کی مدت تک صفدر جنگ کے یہاں کیوں اور کس غرض سے مقیم رہے تھے؟ کیا یہ بھی وہی بات نہیں کہ دروغ گورا حافظہ نہ باشد۔

علی محمد خاں کا انتقال چونکہ نواب وزیر کی وزارت شروع ہونے کے چند ہی ہفتے بعد ہو گیا تھا ان کی زندگی میں تو سرکاری طور پر کارروائی اس جرم کی پاداش میں ان کے خلاف نہ کی جا سکی تھی کہ ملازم سرکار ہونے کے باوجود وہ سرہند کے میدان جنگ سے فرار ہو کر پھر اسی علاقے پر ناجائز قبضہ کرنے پہنچ گئے تھے جہاں سے تین سال قبل بجرم خودسری وعدم انقیاد خارج کیے گئے تھے ان کے مرنے سے کوئی ڈیڑھ مہینے کے بعد

① سیر المتاخرین ص ۸۷۲.

وزیر الممالک صفدر جنگ نے روہیلوں سے ناجائز قبضہ چھیننے کے لیے باجرائے فرمان قایم خان بنگش کو متعین کیا تھا۔①

① ہمعصر مورخ طباطبائی نے صراحتاً بیان کیا ہے کہ

''سعد اللہ خاں پسر کلاں (علی محمد خاں) روہیلہ مذکور کہ داماد حافظ رحمت و بجائے پدر مسند آرائے ملک بود (ص ۸۷۴) ان کے دوسرے بھائی کو داماد دوندے خاں بتا کر لکھا ہے کہ حافظ رحمت اور دوندے خاں دونوں نے بہ بہانہ حصہ دامادان علاقہ کو تقسیم کر کے خود قابض ومتصرف ہو گئے تھے۔ تاریخ اودھ کے مولف نے بھی اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہ حافظ رحمت خاں اپنی ابتدائی عمر میں خرداہ فروشی کرتے پھرتے تھے نواب علی محمد خاں کے پاس رہ کر امیر کبیر بن گئے لکھا ہے کہ

''اس کا عوض یہ دیا کہ نواب صاحب کے انتقال کے بعد دوسرے سرداروں سے سازش کر کے روہیل کھنڈ کے بڑے حصہ پر خود قبضہ کرلیا اور زبان بند رکھنے اور وقت سے بچنے کے لیے کچھ حصہ دوسرے سرداروں کو دے دیا اور اپنے ولی نعمت زادوں کو محروم کیا۔ حافظ صاحب کی ریاست کی بربادی کے بعد ان کی اولاد نواب ممدوح کی اولاد کے کارناموں کی کیا بری تصویر کھینچتی ہے''۔ (ص ۲)

یہ اشارہ گل وگلستاں رحمت جیسی خاندانی پوتھیوں کی خود ساختہ کہانیوں کی جانب ہے جو بریلوی مولف کا ماخذ ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس کو انہوں نے بھی نقل کیا ہے مگر خط کشیدہ فقرے افتاد طبیعت سے حذف کر دیئے ہیں۔ سعد اللہ خاں پسر کلاں علی محمد خاں کو صرف آٹھ سال کا نابالغ بتا دیا ہے اور ان کے داماد رحمت خاں ہونے کا بھی اخفا کیا ہے اور ان کے دو چھوٹے بھائیوں عبد اللہ وفیض اللہ خاں کے متعلق یہ مضحکہ خیز دروغ بافی کی ہے کہ احمد شاہ درانی سرہند میں شاہی فوج سے شکست کھا کر بھاگے تو ان دونوں بھائیوں کو جو شاہی فوج میں تھے اپنے ہمراہ ولایت لیتے گئے تھے یہ کذب بیانیاں محض اس مقصد سے کی ہیں کہ حافظ رحمت خاں کی ذات پر غاصب اور خائن ہونے کے جو الزامات ہیں ان سے بریت یہ ظاہر کر کے کی جائے کہ علی محمد خاں نے مرتے وقت انہیں بھی اپنا جانشین کیا تھا۔

جانشینی کی وضعی داستان میں بیان ہوا ہے کہ علی محمد خاں نے مرنے سے دو روز پہلے اپنے سرداروں کے مجمع کے سامنے تقریر کی تھی اس تقریر کو مولف نے نقل کیا ہے جو فصیح وبلیغ اشعار فارسی سے مرصع ہے حالانکہ خود ہی یہ بتایا ہے کہ اس وقت ان کی زندگی کی تمام امیدیں منقطع ہو چکی تھیں تمام بدن گل گیا تھا ہڈیاں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ تقریر میں یہ فقرے ان سے منسوب کیے ہیں کہ حکومت اس شخص کے واسطے مناسب ہے جو ''جامع جمیع صفات حسنہ اور مجمع کل کمالات کاملہ ہو اور یہ تمام==>

''فتح وظفر سعد اللہ خاں و دیگر اخلاف علی محمد خاں گردید''۔ ''سعد اللہ خاں
پسر کلاں علی محمد خاں نے باوجود بے سروسامانی اپنے بھائیوں اور اپنے
والد کے وفادار روہیلہ تیغ زنوں کی مدد سے قائم خانیوں کا مقابلہ کر کے فتح
حاصل کر لی تھی''۔

یہ واقعہ ۱۰ ذی الحجہ ۱۱۶۱ھ کا جو قطعی ثبوت ہے کہ علی محمد خاں اس واقعہ کے وقت بقید حیات نہ تھے مورخ طباطبائی کے اس بیان کی اس واقعہ سے تائید مزید ہوتی ہے کہ سرہند سے روہیل کھنڈ پہنچنے اور علاقے پر قبضہ کرنے کے چند ماہ بعد ہی علی محمد خاں کا انتقال ہو گیا تھا اسی بات کا اعادہ ہم عصر مورخ نے دوسرے موقع پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

''دریں ولا علی محمد خاں بعد مردن قمر الدین خاں و ہنگامہ لشکر کشی احمد ابدالی
در ممالک مسخرۂ قدیمہ خود کہ عبارت از مراد آباد وغیرہ است آمد و مسلط
گشت و بعد سہل مدتے بمرض سرطان در گذشت''۔①

''سہل مدت'' سے مطلب عرصہ قلیل سے ہے یعنی جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ میں بریلی پہنچنے کے چند ہفتے بعد شوال ۱۱۶۱ھ میں مر گئے تھے۔ بریلوی مولف کا ان کی وفات کو ایک سال بعد قرار دینا حافظ رحمت خاں کی شخصیت و منزلت بڑھانے اور نواب صفدر جنگ پر کیچڑ اچھالنے کی دروغ بافیوں کے سلسلہ کا کید ہے جن کا تار پود

==> اوصاف حافظ رحمت خاں کے وجود باوجود اور ان کی ذات بابرکات میں موجود مستور ہیں''۔ (ص ۷۶)۔

پھر علی محمد خاں کی زبان سے مرتے وقت اپنے محسن و مربی اور جمعیۃ رواہل کی کھیڑ میں بنیاد ڈالنے والے اولوالعزم سردار داود خاں کو حافظ مذکور کے باپ کا ''خالہ زاد اور اس خاندان عالی شان کی دولت کا پروردہ'' (ص ۷۷) بھی کھلوا دیا ہے۔ مولف کی اس لغو قصیدہ خوانی کا مقصد ظاہر ہے۔ عیاں راچہ بیاں)

① ج ۳ ص ۸۷۳۔

کتاب سیر المتاخرین کی تصریحات سے جن کے حوالہ جات ان اوراق میں متعدد جگہ آتے ہیں اچھی طرح بکھر گیا ہے۔ بریلوی مولف نے شاید اسی خدشہ سے فاضل مورخ طباطبائی ① کی مبسوط تاریخ سیر المتاخرین کو نامعتبر ظاہر کرنے کے لیے جس بہتان طرازی کا مظاہرہ کیا ہے مولفانہ بددیانتی کی بڑی شرمناک مثال ہے۔

شجاع الدولہ کو عظیم آباد (پٹنہ) اور بکسر کی لڑائیوں میں انگریزوں کی تربیت یافتہ قلیل فوج نے جو شکست دی تھی تاریخ کا ہر طالب علم اس سے واقف ہے۔ مورخ طباطبائی نے پٹنہ کی اسی آویزش کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ

''میرے والد ہدایت علی خاں اسد جنگ جو شاہ عالم بادشاہ کے ایام ولی عہدی سے ان کے معتمد و مشیر خاص تھے ان ایام میں شاہی لشکر میں موجود تھے اور میں بھی ان کے ساتھ رہتا تھا۔

''رفاقت پادشاہ گزیدہ ہمراہ والد مرحوم بسر می برد''۔②

پھر جب شجاع الدولہ نے عظیم آباد سے ہٹ کر بکسر میں چھاؤنی ڈالی اور شاہی لشکر کا پڑاؤ مقام آرہ میں ہوا میرے والد اپنے محلات جاگیر کو لوٹ جانے کا قصد کرتے

---

① یعنی منشی غلام حسین خاں طباطبائی جو عالی منزلت و عالی خاندان فاضل شخص تھے مسلکاً شیعہ اثنا عشریہ نسباً حسنی ابراہیم طباطبا بن اسماعیل الدیباج بن ابراہیم بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علی بن ابی طالب کی نسل سے تھے ان کے والد بخشی الملک نصیر الدولہ سید ہدایت علی خاں اسد جنگ جو نواب صفدر جنگ کے زمانے میں مختلف مقامات کے چکلہ دار رہے تھے آخر میں شاہ عالم بادشاہ کے ایام شہزادگی سے ان کے معتمد و مخلص ترین صلاح کاروں میں سے تھے۔ صوبہ بہار میں ان کی جاگیر تھی مورخ طباطبائی کے بھائی فخر الدولہ علی نقی خاں اور دوسرے عزیز و اقارب بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے خود ان کو بھی امرائے شاہی حاکمان صوبہ و اعیان سلطنت کے علاوہ اس عہد کے متعدد علماء و فضلاء سے ملاقات کے مواقع حاصل رہے تھے۔ بہار و بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز عہدہ داروں سے بھی ان کی واقفیت تھی اپنے زمانہ کے تاریخی واقعات انہوں نے قدرے شرح و بسط سے لکھے ہیں۔

② ج ۲ ص ۷۵۱.

تھے اس کے بعد جو واقعات ان ایام میں ہوئے مورخ موصوف نے جلد دوم ص ۱۵۷ پر ذیل کی عبارت میں انہیں بیان کیا ہے اور یہی وہ عبارت ہے جسے بریلوی مورخ نے بزبان اردو نقل کرتے ہوئے جعل وفریب سے شرمناک بددیانتی کا مظاہرہ کیا ہے۔

مورخ طباطبائی لکھتے ہیں:

''والد از آنجا (مخیم شاہ بمقام آرہ) ارادہ معاددت بحال جاگیر خود مصمم گشت وفقیر اوضاع لشکر وزیر مختل دیدہ بودنِ خود دراں مجمع مناسب ندید چوں از سابق آشنائی با بعض انگلشیاں خصوص یا ڈاکٹر فلرٹن از سفا کی عالی جاہ نجات یافتہ بدر رفت در نہایت مرتبہ بود در جنگ شجاع الدولہ پیغام ومراسلات او بفقیر میرسید وبندہ ہم در جواب بقدر مناسب می نگاشت وڈاکٹر مکرر بفقیر نوشت کہ پادشاہ را باما مردم موافق کردہ تدبیرے باید کرد کہ تا بما برسد بخدمت والہ معروض داشتم کہ اگر ایں صورت میسر آید باعث از دیا اتحاد انگلشیانِ وموجب ممنونی ایشاں خواہد بود واحوال وزیر معلوم است کہ نا منتظم وتوقع ظفر بر انگلشیانِ با اینہمہ بے خبری وعدم التفات باستماع کلمات مشورہ خیر اندیشان نیست رزیں صورت اگر راہے با انگلشیاں درست واسترضائے ایشاں کردہ آید خالی از صلاح نہ خواہد بود ونیز اینہا را خواہش اتفاق پادشاہ است ومکرر مرا نوشتہ بریں ارادۂ خود آگاہی دادہ اند پادشاہ را اگر رفاقت آنہا منظور باشد از امر آگہی دادہ شقہ بروفق رضائے جماعہ مذکور نویسانیدہ باید داد''۔①

''والد کا ارادہ اس جگہ (پڑاؤ شاہی مقام آرہ) سے اپنے محال جاگیر

---

① جلد دوم ص ۱۵۷.

لوٹ جانے کا مصمم ہوا اور فقیر نے بھی لشکر وزیر کے حال پراگندہ① دیکھ کر اس مجمع میں اپنا ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا چوں کہ بعض انگریزوں خصوصاً ڈاکٹر فلرٹن سے جو عالی جاہ کی سفاکی سے نجات پاکر نکل آئے تھے پہلے سے آشنائی نہایت درجہ تھی جنگ شجاع الدولہ کے دوران ان کے پیغام ومراسلات فقیر کو پہنچتے اور بندہ بھی جواب میں بقدر مناسب لکھتا تھا ڈاکٹر نے فقیر کو مکرر لکھا کہ

بادشاہ کو ہم لوگوں سے موافق کر کے یہ تدبیر کرنی چاہیے کہ وہ ہم تک پہنچ سکیں میں نے والد کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر یہ صورت میسر آجائے تو انگریزوں سے اتحاد بڑھنے کا باعث اور ان کی ممنونی کا موجب ہو سکے گا وزیر کے احوال تو معلوم ہیں کہ پراگندہ (نامنتظم) ہیں اور ایسی بے خبری اور خیر خواہوں کی مشورہ کی باتوں کے سننے سے بے توجہی سے انگریزوں پر فتح پانے کی توقع نہیں ہے اس صورت میں انگریزوں سے اگر تعلق درست ہو اور ان کی خواہش پوری کی جائے تو یہ بہبود و بہتری سے خالی نہ ہو گا۔

نیز ان لوگوں کی خواہش بھی بادشاہ سے اتفاق کرنے کی ہے۔ اور مجھے مکرر لکھا ہے اور اپنے اس ارادہ سے مطلع کیا ہے بادشاہ کو بھی اگر رفاقت ان کی منظور ہو تو اس امر سے اطلاع دے کر فرمانِ شاہی جماعت سے مذکور کی خواہش کے مطابق لکھوا کر دے دیا جائے''۔②

---

① انبوہ عوام لشکر میں ہنگامہ لوٹ اس قدر تھا جس کا حساب نہیں۔ درانی خانہ جنگی کرتے جاتے تھے افسروں کا کہا نہیں مانتے ایک دوسرے کا مال چورا لیتے۔ (قیصر التواریخ)

② مولف تاریخ اودھ نے حصہ دوم ص ۹۹ پر تقریباً اسی مضمون کا خلاصہ نقل کیا ہے جو بریلوی مولف کی جعل سازی کا مزید ثبوت ہے۔

ذرا دیکھئے بریلوی مولف نے فاضل مورخ کی مندرجہ بالا فارسی عبارت کا اردو میں کیا حلیہ بگاڑا ہے۔مقدمہ کتاب (ص ۳۵) میں اور (ص ۱۷۹) میں ''جنگ پٹنہ کی ابتداء'' کےعنوان سے بحذف چندالفاظ حاشیہ چھوڑ بقلم خفی عبارت اردو ترجمہ کی اس طرح درج کی ہے گویا مورخ کی کتاب سے اردو میں نقل کررہے ہیں:

''میں نے اپنے آپ کو انگریزوں سے وابستہ کرنے کا تہیہ کرلیا جن سے اس عرصہ میں مجھے انسیت ہوگئی تھی۔میرا ان سے کچھ تعلق بھی پیدا ہوگیا تھا بالخصوص ڈاکٹر فلرٹن اور میرے درمیان کچھ خط وکتابت بھی رہی تھی جس کے ذریعہ اس نے مجھے اطلاع دی تھی کہ بادشاہ (شاہ عالم) دل سے انگریز پارٹی کی طرف جھکے ہوئے ہیں اس طرح اس نے مجھے صلاح دی تھی کہ مجھ کو اپنے اور بادشاہ کے بہت جلد انگریزی کیمپ میں پہنچنے کا انتظام کرنا چاہیے۔اس خبر سے میں نے اپنے والد کو مطلع کیا اور ایک ایسے معاملہ میں جس سے ہمارے خاندان کا استحکام ہو اور وہ انگریز قوم کے شکریہ کا مورد ہوسکے پیش قدمی کرنے پر اصرار کیا''۔①

ملاحظہ فرمایا آپ نے بریلوی مصنف کی اردو عبارت کو اصل سے کوئی نسبت نہیں نہ ترجمہ میں نہ مفہوم نہ مطلب میں اور وہ بھی مورخ ② موصوف کی

---

① سیر المتاخرین جلد دوم۔

② کتاب سیر المتاخرین کے بالاستیعاب مطالعہ سے ہی واضح ہوجائے گا کہ اس کے مصنف کیسے فاضل، عالی ظرف، شریف طبع، منکسر مزاج تھے ایک ذی ثروت وعالی منزلت حامل آثار حسنی خاندان کے فرد ہونے کے باوجود برخلاف مدعیانِ سیادت نسبی کے جو اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے ناموں تک میں جہل ونادانی سے سید وسیدہ کے پرچھلے لگاتے نہیں چوکتے اپنا نام اور ولدیت کا سادہ طور سے ''غلام حسین بن ہدایت علی الطباطبائی الحسنی'' لکھتے اور غایت انکسار سے اپنے کو فقیر ولاشے فی الحقیقۃ کہتے۔ مسلکاً یہ بھی شیعہ اثنا عشریہ تھے اور نواب صفدر جنگ بھی قطع نظر اختلاف عقائد ان دونوں عالی==>

کتاب کا حوالہ دے کر۔

؎ چہ دلا در است دزدے کہ بکف چراغِ دارد

ساری کتاب دیکھ جایئے! کوئی ایک اقتباس بھی اصلی ہو یا نقلی وجعلی فارسی میں نہیں اور اسی لیے نہیں کہ ترجمے کے نام سے تحریف وترمیم کے ساتھ اپنے مطلب کی عبارت گھڑنی تھی۔ یہ عیاری بھی قابل داد ہے کہ نظامی بدایونی کے نام سے کتاب میں جو مقدمہ شامل ہے فارسی اقتباسات کے ترجموں کے بارے میں حسب ذیل الفاظ لکھ دیئے یا لکھوا دیئے جو مطلب سعدی دیگر است کی صاف غمازی کر رہے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:

''جہاں کہیں فارسی عبارتوں کا ترجمہ کرنا پڑا ہے اس ترجمہ میں فارسیت اردو پر اگر غالب نظر آتی ہے تو اس کا صرف یہی سبب ہے کہ مولف نے یہ خیال رکھا کہ ترجمہ بامحاورہ بھی ہو اور فارسی کے اصل مصنف کے فارسی الفاظ بھی حتی الامکان ترجمہ میں آ جائیں اگر وہ یہ عمل کرتے کہ فارسی کتابوں کے اقتباسات صرف اسی زبان میں دے دیتے اور ترجمہ نہ کرتے تو اردو داں ناظرین کے لیے جو فارسی نہیں جانتے باعث زحمت ہوتا۔ یہ ترجمہ ان کو بساغنیمت معلوم ہوں گے''۔①

جی ہاں کیوں نہ ہوں گے، مورخ طباطبائی کے فقرات کا ترجمہ اس اعتبار سے تو ''بساغنیمت'' ہے کہ بریلوی مولف کی افتاد طبیعت کا جیتا جاگتا ثبوت ناظرین کو مل گیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ ترجمہ کے نام سے جو عیاری کی گئی وہ محض اس مقصد سے کہ سیر المتاخرین کی تصریحات سے چونکہ مولف مذکور کو اپنی ساختگیوں اور دروغ بافیوں کے

==> ظرف اشخاص کے کردار پر بریلوی مولف نے جو بہتان تراشے ہیں ان کی تکذیب محض حق وصداقت کی پاس داری کی خاطر کی گئی ہے۔

① ص ۳۲۔

تار و پود بکھر جانے کا خوف و ہراس تھا۔اس کتاب ہی کو نامعتبر ظاہر نے کے لیے اس کے فاضل مصنف پر جنھوں نے اپنے زمانہ کے چشم دید حالات و واقعات بے کم وکاست بیان کیے ہیں اور انہیں تو انگریزوں کے آلہ کار ہونے کا بے بنیاد اور جھوٹا اتہام تھوپ دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ

''ان کی کتاب ہمارے ہمدرد و مورخین کے لیے ایسی سند ہے جس کے غلط ثابت کرنے سے ہمیں قاصر سمجھا جاتا ہے''۔①

قاصر رہنا در کنار تردید کی جسارت بھی نہ کر سکے اور نہ کر سکیں گے۔نواب صفدر جنگ کی نیک طینی سمجھیے کہ دوران تسوید ان اوراق کے محض اتفاقاً بلکہ احیاناً وزارت دلوانے کے خود ساختہ لچر کہانی کے سلسلہ میں بریلوی مولف کے کیدوں کا انکشاف کرنا پڑ گیا۔پوری کتاب پر جو اپنی نوعیت میں کچھ کذب و افترا ہے اور کچھ کذب حق نما نہ تنقید مقصود ہے اور نہ ہمارے موضوع کے اعتبار سے سر دست ضرورت۔نواب صفدر جنگ تو حسن خدمات کے استحقاق اور علوئے مرتبت سے منصب وزارت عظمٰی پر فائز ہوئے تھے نہ کسی کی سعی و سفارش سے اسی حقیقت کو بریلوی کے ہفوات اور کاذیب لایعنی کا پردہ چاک اور اصلیت کو منکشف و مبرہن کرنے میں یہ اوراق صرف کرنے پڑے ہیں۔

وزارت سے معزولی اور وفات:

کوئی پانچ برس اس شان سے وزیر اعظم رہے کہ بقول میر تقی میر

''بال و گوپال او را بادشاہم نہ داشت''۔''یعنی بادشاہ کی بھی وہ شان وشوکت نہ تھی جو وزیر کی تھی''۔

بایں ہمہ بعض غلطیوں اور لغزشوں کی بدولت دشمنوں کو ان کے خلاف بادشاہ

① ص ۳۰.

کے کان بھرنے کا موقع مل گیا وہی بادشاہ جو دم ان کا بھرتے تھے ان ہی کے مخالف ہو گئے ۔ مورخ طباطبائی کا قول ہے کہ صفدر جنگ میں اس فراست اور کیاست کا نقصان تھا جو اس منصب عظیم کے لیے ضروری ہے وہ لکھتے ہیں کہ

''اما حق آنست کہ جرأت و دانشے کہ برائے چنیں ریاست باید نہ داشت وچناں سرداران کہ بارکار ہائے بزرگ بردار ندواز عہدۂ تمشیت آں برآیند بنا بر نقصان فراست وکیاست کہ داشت بہم نہ رسانید''۔ ①

ان کے زمانے میں مرہٹے اور انگریز یہ دو غیر مسلم قوتیں ابھر رہی تھیں ۔ غیر مسلموں کا زور توڑنے کو مقدم رکھنے کے بجائے وہ مسلم قبیلوں بنگش افغانوں اور روہیلوں کی سرکشیوں اور چیرہ دستیوں کا قلع قمع کرنے میں الجھ گئے احمد خاں بنگش کے مقابلہ میں تو غیر متوقع شکست کی ذلت بھی اٹھانی پڑی پھر دوآبے کے علاقہ میں اسی سلسلے میں مرہٹوں کو مسلط کرا دینے سے مسلمان رعایا کو بے حد مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف شاہی دربار میں جاوید خاں خواجہ سرا کو جو بادشاہ کی ماں اودہم بائی کا منظور نظر تھا بخطاب نواب بہادر ایسا اقتدار ہوا کہ امور سلطنت میں دخیل ہو گیا۔

''اختیار سلطنت بدست اوافتاد''②

بادشاہ کا ماموں مان خاں تو ال شش ہزاری منصب دار ادر معتقد الدولہ کا خطاب یافتہ ہوکر امرائے عظام سے ہم چشمی کرنے لگا۔ وزیر الممالک ان حالات سے بہت دل تنگ ہوئے جاوید خان کو بہانے سے بلا کر مروا ڈالا۔ نظام الملک آصف جاہ کے پوتے غازی الدین خاں عماد الملک عجب فتنہ انگیز طینت کے تھے نواب صفدر جنگ نے ان کے باپ کے مرنے پر ان کی تربیت کر کے امیر الامرائی کا موروثی منصب دلا

① ج ۳ ص ۸۹۱.

② ذکر میر۔

دیا تھا۔جاوید خاں کے واقعہ پر اپنے ماموں انتظام الدولہ سے مل کر بادشاہ اوران کی ماں اودہم بائی کو صفدر جنگ کی مخالفت پر برانگیختہ کیا۔صفدر جنگ نے ان کی احسان فراموشی وحق ناشناسی پرہی تو یہ مصرع پڑھا تھا۔

طفیل دامن گیرآخر گریبان گیرشد

غازی الدین خاں وغیرہ نے بادشاہ کو باور کرادیا کہ صفدر جنگ سلطان بلند اختر برادرخرد محمد شاہ کو جو مسلکاً شیعہ تھے تخت نشین کرنا چاہتے ہیں اس پر بادشاہ نے عہدہ میر آتشی ان کے ہاتھ سے نکال لینا چاہا۔اب بادشاہ اور وزیر میں مخالفت بڑھتی گئی۔بادشاہ نے انتظام الدولہ کو صفدر جنگ کی جگہ وزیر مقرر کردیا امرائے فتنہ جو نے اختلاف مذہب کا شاخسانہ پیدا کردیا محمدی جھنڈا کھڑا کر کے کہا کہ

''صفدر جنگ رافضی ہے خلیفہ زماں سے باغی ہے''۔

نجیب خاں روہیلہ داماد دوندے خاں جو بعد میں امیر الامراء نجیب الدولہ ہوئے اس میں پیش پیش تھے۔سنی شیعوں میں بھی دھینگا مشتی شروع ہوگئی۔سنی دم چار یار اور شیعہ دم پنجتن کے نعرے لگانے لگے کوئی چھ مہینے بادشاہ اور وزیر کے طرف داروں کی لڑائی ٹھنی رہی۔فریقین کے طرفداروں میں ہندو جاٹ اور مرہٹے بھی بلائے گئے تھے بالآخر راجہ مادھوسنگھ سوائی والی جے پور کی کوششوں سے صلح ہوگئی۔سناتھ سنگھ بیدار نے تاریخ صلح کہی۔

شکر اللہ کہ جاٹ وصفدر جنگ
صلح کردند با وزیر شاہ
ہاتف غیب سال تاریخش
گفت الصلح خیر قال اللہ

محرم ۱۱۶۷ھ میں اپنے صوبہ اودھ کو چلے گئے ان کے جانے کے چند ماہ بعد احمد شاہ بادشاہ غازی الدین خاں سے جنہوں نے بعد میں بادشاہ اوران کی ماں اودہم بائی دونوں کو قید کر کے آنکھیں بھی ان کی پھوڑوا دی تھیں اور انتظام الدولہ کو بھی وزارت سے برطرف کر کے مرواڈالا تھا ایسے بے زار ہوئے کہ بمشورہ خیر خواہوں کے صفدر جنگ کو بلانے کا ارادہ کیا۔

بعض کہتے ہیں:

''کئی شقے عنایتی مضامین کے ان کی طلبی میں بھیجے مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ ان کے پشت پا میں سرطانی مادہ کا نکلا پھوڑا تھا جو جلدی اتنا بڑھ گیا کہ لاعلاج ہوگیا۔ ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ کو راہی ملک بقا ہوئے۔ گلاب باڑی فیض آباد میں سپرد خاک ہوئے بعد میں ان کی ہڈیاں دہلی لے جا کر اس مقام پر دفن ہوئیں جہاں ان کا عالیشان خوبصورت مقبرہ بنا ہوا ہے''۔

نواب صفدر جنگ بقول تاریخ مظفری سیر چشمی اور دوسرے مراتب امارت میں اپنے زمانہ میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ آٹھ ہزار پیادہ وسوار ہمیشہ ان کی رکاب میں حاضر رہتے تھے شاہ حمزہ کشف الاستار میں لکھتے ہیں کہ

''وہ بہت بھاری آدمی تھے ان کی مجلس بالکل لہو ولعب سے خالی تھی۔ وہ شریف طبیعت اور نیک طینت کے تھے قصبہ مارہرہ (ضلع ایٹہ) کو جب ان کے فوجیوں نے غلط فہمی کی بنا پر لوٹ لیا تھا۔ شرفا کی عورتیں بچے پکڑ لیے تھے یہ حالات معلوم ہو کر نیک دل وزیر کی جو کیفیت ہوئی تھی ہمعصر مورخ سے سنیے لکھتے ہیں کہ

''تمام شب وزیر بریں ماجرا ملول واکثر زار زار گریاں بود وطعام

نخورد''۔①

مگر ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ تعصّبات سے خالی نہ تھے۔

تاریخ اودھ کے مولف محمد نجم الغنی خاں فرماتے ہیں کہ

صفدر جنگ نے محض تعصب مذہبی کی بنا پر اودھ کے شاہ ولایت② مخدوم شاہ مینا کی درگاہ کی جاگیر ضبط کر لی تھی۔مزار اور درگاہ کی متعلقہ یہ جاگیر بڑی آمدنی کی تھی صفدر جنگ کے زمانہ میں گنبد اور خانقاہ کی عمارتیں موجود رہیں جو ان کے جانشینوں کے زمانہ میں یا بقول دیگر غدر کے زمانے میں ڈھا دی گئیں ۔ صفدر جنگ نے بھی اپنے زمانہ میں بہت سی املاک ووظائف ضبط کر لیے تھے جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

---

① ج ۳ ص ۷۷۸.

② مخدوم شاہ مینا متوفی ۸۸۸ھ کو جن کا مزار لکھنؤ میں زیارت گاہ ہے مولف تاریخ اودھ نے حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کی اولاد میں بتایا ہے جو صحیح نہیں۔حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہ بزمانہ خلافت امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ جہاد سمرقند میں مقتول ہو گئے تھے ان سے نسل باقی نہیں۔''لیس له عقب'' (کتاب نسب قریش) مخدوم صاحب کا سلسلہ نسب بروایت صحیحہ راامین الرشیدین بن خلیفہ ہارون الرشید رحمہ اللہ سے متصل ہوتا ہے ان ہی کے بنی اعمام میں حاجی ابوالمکارم مینا تھے جن کا مزار قصبہ کرسی میں ہے۔مولف تاریخ اودھ نے مزید لکھا ہے کہ

'''مخدوم شاہ مینا رحمہ اللہ کے دادا لکھنؤ میں آکر حاجی قیام الدین عباسی رحمہ اللہ معروف بہ حاجی الحرمین کے پاس مقیم ہوئے تھے ان کی شادی صدیقیوں میں ہوئی ان کے دو بیٹے شیخ محمد وشیخ احمد ہوئے جو صدیقیوں کے نواسے تھے اول الذکر مخدوم شاہ مینا تھے اور ثانی الذکر کی اولاد میں مینائی خاندان ہے جن میں منشی امیر احمد مینائی مشہور شاعر تھے''۔

مولف مذکور مزید لکھتے ہیں کہ

''بعض اہل سیر نے صدیقی النسب اس بنا پر لکھ دیا ہے کہ ان حضرات کے رشتہ ناطے بیشتر صدیقیوں میں ہوتے رہے تھے''۔

شجاع الدولہ:

صفدر جنگ کے بیٹے برہان الملک کے نواسے جلال الدین حیدر نام ۱۱۴۴ھ میں پیدا ہوئے، پندرہ سولہ کی عمر تھی کہ محمد شاہ بادشاہ کی منہ بولی بیٹی امۃ الزہرا بیگم دختر موتمن الدولہ اسحاق خان شوستری سے شادی ہوئی اور ایسی دھوم سے ہوئی کہ ۴۶ لاکھ روپیہ صفدر جنگ نے بیٹے کی شادی پر صرف کیا۔

۱۱۶۷ھ میں بعد وفات پدر بزرگوار کہ ۲۳۔ ۲۴ برس کے نوجوان تھے مسند وزارت پر بیٹھے ہر چند کہ لاابالی اور مضطرب طبیعت کے تھے اپنے صوبہ کے انتظامی امور سے غفلت نہ برتتے۔ شراب نوشی کے عادی نہ تھے البتہ لہو ولعب، صحبت نسواں اور دیگر افعال مذمومہ کے ارتکاب میں بے باک تھے۔

شاہ عالم بادشاہ نے وزیر الممالک کا منصب عطا کیا تھا اس لیے اپنے خاندان میں دوسرے وزیر الممالک ہوئے اولوالعزم اور سیر چشم بھی تھے مگر دغا وفریب، بدعہدی، ظلم وتعدی، بے رحمی وقساوت سے بھی باز نہ رہتے۔

بدعہدی اور ظلم وقساوت کے چند واقعات ہمعصر مورخ نے لکھے ہیں:

شرمناک بدعہدی:

قاسم علی خاں عالی جاہ ناظم بنگالہ انگریزوں سے شکست کھا کر مع اپنی بچی کھچی فوج اور کثیر مقدار زر وجواہر وقیمتی اشیاء کے ان کے پاس اس غرض سے آئے تھے کہ ان کی مدد سے پھر قسمت آزمائی کریں انہوں نے ہر طرح کے عہد و پیمان کلام اللہ اور اللہ اور اس کے رسول عترت طاہرہ اور حضرت عباس بن علی کے نام کی قسمیں کھا کر حفظ جان ومال وآبرو کا تحریری معاہدہ اپنے مہر و دستخط سے کر دیا پھر عالی جاہ کو ساتھ لے کر عظیم آباد وبکسر میں جیسا مجملاً ذکر ہو چکا انگریزوں سے لڑائیاں لڑیں مگر شکست کھا کر

ایسی بدحواسی سے بھاگے تھے کہ اپنا صوبہ اور دارالحکومت چھوڑ کر مع اہل وعیال اور خزانہ کے، پہلے بریلی پھر فرخ آباد جا کر دم لیا۔ اس کے بعد خود ہی انگریزوں سے صلح صفائی کر کے معاہدہ بھی کر لیا جس سے انگریزوں کے سیاسی اقتدار کی جڑیں مضبوط ہو کر برطانوی حکومت کا گویا آغاز ہو گیا کسی نے تاریخ بھی لکھ ڈالی تھی۔ درہندا میر شد فرنگی ۱۱۷۸ھ۔ مگر قاسم علی خاں سے بعد میں ایسی بدعہدی اور شرمناک دغا کی کہ اس پناہ گیر کے سارے زر وجواہر اور قیمتی ساز وسامان سب ضبط کر کے ایک تنکا بھی ان کے لیے نہ چھوڑا اور اس امیر مقتدر کو گدائے محتاج کر دیا۔

روہیلوں پر مظالم:

سعد اللہ خاں پسر علی محمد خاں روہیلہ وعنایت خاں پسر حافظ رحمت خاں سے ان کا جو رابطہ اتحاد ودوستی تھا۔ اس کو فراموش کر کے روہیلہ افغانوں کے خاندانوں کے نام ونشان مٹا دینے میں ظلم وبے رحمی وقساوت کا کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ مرہٹوں نے جب گنگا پار کر کے ضابطہ خان ولد نجیب الدولہ کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ حافظ رحمت خاں نے بھی مضطرب ہو کر شجاع الدولہ سے جو اس وقت مع انگریز افسر کے شاہ آباد میں مقیم تھے یہ معاہدہ کیا اور اقرار نامہ اس مضمون کا لکھ دیا کہ شجاع الدولہ لڑ کر یا صلح کر کے مرہٹوں کو روہیل کھنڈ سے نکال دیں تو اس کے عوض میں روہیلے سردار چالیس لاکھ روپیہ چار قسطوں میں ان کو ادا کریں گے۔ پختگی کے لیے انگریز آفیسر کے دستخط بھی شہادت میں ثبت کرا لیے تھے۔

مرہٹے جب نکل گئے۔ شجاع الدولہ نے ۱۱۸۸ھ میں ادائیگی رقم کا تقاضہ کیا اقرار نامہ چونکہ بغیر مشورہ دیگر سردارانِ روہیلہ کیا گیا تھا ادائیگی کی ذمہ داری تنہا حافظ رحمت خاں پر ڈالنے سے روہیلہ سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ عدم ادائیگی کی بنا

پر جنگ چھڑی انگریزی فوج کے علاوہ روہیلہ اور پٹھان سرداروں میں ضابطہ خان، مظفر جنگ بنگش وغیرہ شجاع الدولہ کے ساتھ ہوئے۔ حافظ رحمت خاں کے بعض ساتھی تو پہلے سے دغا دے گئے تھے بہت سے انگریزی توپ خانے کی گولہ باری سے بھاگ گئے حافظ صاحب مع اپنے تھوڑے سے ساتھیوں کے آخر تک ڈٹے رہے توپ کا ایک گولہ ان کے پہلو ① کے برابر سے گزرا تھا جس کا نیلگوں داغ ان کی جلد پر بھی پڑ گیا اسی کے صدمے سے گر کر ہلاک ہو گئے ایک روہیلہ ہی سر کاٹ کر شجاع الدولہ کے پاس لے آیا تھا۔

شجاع الدولہ کی جیت حافظ رحمت کی ہلاکت کا واقعہ ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ کا ہے کسی نے تاریخ کہی تھی۔

چو از لفظ ظفر تاریخ جستند (۱۱۸۷)
پے باقی سر حافظ بریدند (ح ۸، ۱۱۸۷ھ)

سوداؔ کا قصیدہ تو گویا جنگ کی مختصر سی تاریخ ہے جس کے آخر میں کہا تھا۔

حافظ نے سر دیا نہ دیا زر ہوئی ہے یہ
تاریخ اس کے فوت کی کر کے عدد شمار
تاریخ فتح عرض کی سوداؔ نے یوں کہ ہو/۱۱
یہ فتح نو مبارک نواب نامدار ۱۱۷۷، ۱۱، ۱۱۸۸ھ

بعد فتح روہیلے خاندانوں کی املاک کو خاص کر حافظ صاحب کی ریاست کو جو اپنے آقا زادوں کے علاقہ کو غصب کر کے قائم کی تھی آخر میں مٹنا تھا مٹ گئی۔

① رحمت خانی ڈھنڈورچی فرماتے ہیں کہ گولہ ان کے سینے سے ٹکرا کر زمین پر جا گرا اور ایسی آواز ہوئی گویا وہ گولہ کسی پہاڑ سے ٹکرایا سینہ میں نہ کوئی شگاف ہوا نہ کوئی ہڈی ٹوٹی نہ جلد میں سوختگی کا کوئی اثر ہوا۔ (حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۸)۔

بقول ہمعصر مورخ:

''روہیلوں نے سابق میں جو ظلم مقیم ومسافر اور دیگر بندگانِ خدا پر کیے تھے لوٹ مار سے دولت اکٹھی کی تھی بالآخر قہر الٰہی شجاع الدولہ کی فوج کی صورت میں ان پر نازل ہوا لیکن جس بے رحمی وقساوت سے ان کے اہل وعیال کو ستایا گیا قید وبند کے مصائب میں ڈالا گیا اور برباد کیا گیا عام رعایا پر جو ظلم توڑے گئے ہزاروں اپنے گھروں سے بے گھر ہوئے۔ مدرسوں، خانقاہوں، مسجدوں کی جو بے حرمتی کی گئی گاؤں جلا دیئے گئے بے شمار آدمی قتل ہوئے اس کے بیان سے قلم کا سینہ چاک ہوتا ہے''۔

ضبطی جائیداد واملاک:

صوبہ اودھ کے قدیم خانوادوں خصوصاً جونپور، غازی پور وکڑہ مانک پور وغیرہ کے علماء ومشائخ کی معافیات کی ضبطی کا سلسلہ تو برہان الملک ہی کے زمانہ سے شروع ہو گیا تھا۔ پچھلے اوراق میں ضمناً اس کا ذکر علامہ آزاد بلگرامی جیسے بلند پایہ عالم اور ہمعصر مورخ کی کتاب سبحۃ المرجان کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ

''ان خاندانوں کے وظیفے واملاک ومدد معاش یک قلم ضبط کر لی گئیں اہل کمال کی انجمنیں منتشر ہو گئیں حصول معاش کی پریشانی نے تحصیل علم سے شائقین کو باز رکھا جو مدرسے قدیم سے علم وفضل کے معدن ومرکز تھے سب ہی پر تباہی آ گئی''۔

تاثر الکرام (ص ۲۲۲) میں مزید لکھتے ہیں:

''وبعد ارتحال برہان الملک نوبت حکومت بہ خواہر زادہ اوابوالمنصور خاں

صفدر جنگ رسید و وظائف و اقطعات بدستور ضبط ماند و در اواخر عہد محمد شاہ ۱۱۵۹ھ صوبہ داری الہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد و تتمہ وظائف آن صوبہ کہ تا حال از آفت ضبط محفوظ ماندہ بود درآمد و در عہد احمد شاہ صفدر جنگ بہ بایہ فدارت اعلیٰ صعود نمود و نائب صوبہ شد کار پر ارباب وظائف تنگ تر گرفت تاحین تحریر کتاب این دیار پامال حوادث روزگار است''۔

''برہان الملک کی وفات کے بعد ان کے بھانجے ابوالمنصور خاں صفدر جنگ مسند حکومت پر بیٹھے وظیفے واملاک بدستور ضبط رہے محمد شاہ بادشاہ کے آخر عہد ۱۱۵۹ھ میں الہ آباد کی صوبہ داری بھی صفدر جنگ کو دی گئی اس صوبہ کے وظائف جو اس وقت تک ضبط ہونے کی بلا سے محفوظ تھے ضبط کر لیے گئے احمد شاہ کے عہد میں صفدر جنگ وزارتِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے اور نائب صوبہ بنے ارباب وظائف پر اور بھی تباہی آئی اور اس کتاب کی تحریر کے وقت تک یہ علاقہ حوادث روزگار سے پامال ہے''۔

شجاع الدولہ نے بفحوائے پدر نتواند پسر تمام کند وظائف واملاک مدد معاش ومعافیات کی ضبطی کا دائرہ وسیع کر دیا۔ان کے زمانے تک شمالی ہند میں شیعہ خال خال تھے۔خود ایک شیعہ مصنف ومورخ جسٹس امیر علی نے اپنی کتاب جامع الاحکام فی فقہ الاسلام میں لکھا ہے کہ

''ہمایوں بادشاہ کے زمانہ تک شیعہ مذہب دکن کی ریاست بیجاپور گول کنڈہ پر محدود تھا سلاطین بہمنی وعادل شاہیہ شیعہ تھے ہمایوں بادشاہ جب شاہ ایران سے مدد لے کر واپس لوٹے ان کے ساتھ جو شیعہ آئے انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور مذہب شیعہ شائع ہونا شروع ہوا بادشاہ وقت سنی تھا

اگر چہ شاہ جہاں کا ایک بیٹا شاہ شجاع شیعہ تھا شاہانِ اودھ نے اس مذہب کو اودھ میں بہت رونق دی۔ (ملخصاً)

غرض یہ کہ یہ قدیم خانوادے جن کی معافیات ضبط ہوئیں سب سنی تھے۔ ضبطی جائیداد کے بارے میں شیعہ مورخ طباطبائی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

''ممکن است کہ دہ بیس کس از مشایخ مرتکب بعضے امور ناشایستہ کہ موجب سوءظن بافرقہ مذکورہ تواند شدہ باشند اگر تنبیہہ آن جماعہ منظور داشت بایستے کہ تخصیص و تحقیق دریں خصوص بعمل می آورد''۔①

تحقیق و تخصیص کیا کی جاتی جب ضبطی جائیداد میں عام جذبہ غصب مال کے علاوہ تعصب مذہبی کارفرما تھا۔ مخدوم شاہ مینا عباسی رحمۃ اللہ کے قدیم خانوادہ کی املاک باپ نے ضبط کیں بیٹے نے شاہ اجمل عباسی رحمۃ اللہ کے قدیم خانوادۂ رشد و ہدایت کی معافیات کو جو شاہجہاں کے زمانہ سے عہد فرخ سیری تک ۳۲ مواضعات کی تعداد میں عطا ہوئی تھیں اور ہزاروں طلبا و علما کی وجہ کفاف تھیں یک قلم ضبط کر لیں۔

شاہ صاحب نے واگذاشت کے سلسلہ میں لکھنؤ کے ناکام سفر میں تائید الٰہی کی طلب میں کہا تھا۔

ناکام و نامرادم فریاد رس الٰہی
ہے ہے کجا فنا دم فریاد رس الٰہی
از شہر خویش دورم در زندگی بگورم
حاصل نما امورم فریاد رس الٰہی
نشنیدنی شنیدم نادیدنی بدیدم

① ج ۳ ص ۹۴۰۔

در رنج وغم تپیدم فریاد رس الٰہی

جب واگذاشت کی کوششوں میں ناکام رہے شجاع الدولہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

اے ضبط نمودہ تو دیہات مرا
ہم ضبط شود دولتست از قہر خدا
زیں شیوۂ ناصواب باز آ باز آ
ورنہ تو سزائے خویش یابی بخدا

عبرتناک انجام:

جائیدادوں کی ضبطی اور روہیلہ پٹھانوں کی بربادی کے نو مہینے بعد اور شاہ اجمل عباسی رحمۃ اللہ کی مندرجہ بالا رباعی کے ذریعہ قہر خدا سے ڈرانے کے تین مہینے بعد کہ بلفوائے۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درحق بہر استقبال می آید

شجاع الدولہ نے ۲۵ ذی قعد ۱۱۸۸ھ کو اس عالم میں دم توڑا① کسامتا کی ماری ماں گریہ وزاری کرتی سرہانے کھڑی سمجھا رہی تھی کہ مخلوق خدا جو مصائب میں مبتلا ہے ضبطی جائیداد سے لوگ نان شبینہ کو محتاج ہیں روہیلوں پٹھانوں کے اہل وعیال جو قید میں پڑے ہیں سب بددعا کر رہے ہیں انہیں چھوڑ دو، روزینے کھول دو مگر سنگ دل بیٹا

① سرطانی مادہ دنبل جوران کی جڑ میں نکلا تھا آخر میں مواد کی ایسی زیادتی ہوئی کہ سرین کی طرف منہ کر لیا تھا پیپ اور لہو براز کے شامل آنے لگا انگریزوں اور ہندوستانی معالج سب عاجز رہے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

یہی کہتا رہا کہ اب اگر ایسا کروں تو لوگ کہیں گے کہ موت سے ڈر کر عاجزی کر رہا ہوں شجاعت اور حمیت سے ایسا کرنا بعید جانتا ہوں۔ بالآخر اسی حالت میں مر گئے۔

۴۴ سال کی عمر پائی، ۱۸ سال حکومت کی، ریاست کا رقبہ مزروع وغیر مزروع ۱۴ کروڑ پختہ بیگہ تھا۔ کئی کروڑ سالانہ آمدنی تھی، لاکھوں روپیہ صرف کر کے جس فوج کو بقول خود اس مقصد سے تیار کیا تھا اور سامانِ حرب مہیا کیا تھا کہ حریفوں کو ہندوستان سے نکال کر تاج شاہی زیب تن کریں گے اس کی نوبت نہ آئی۔

بقول علامہ آزاد بلگرامی ۔

تاج خود را بر زمین از گریہ وزاری فگند

یوں تو بے شمار حکمران نیک نام و بدنام دنیا سے گئے مگر شجاع الدولہ کے بارے میں شیعہ مورخ ہی لکھتے ہیں کہ اعمال بد کی سزا پائی۔

''دوسہ کار در کمال زشتی از اد سرزد کہ ایزد تعالیٰ در انتقام ہماں عملہا اور ابادل پُر از حسرت در عین جوانی در زماں برخوردن از دولت وکامرانی محروم و مایوس ساختہ بدار آخرت باہزاراں افسوس رہگرا گردانید''① ۔

مورخ موصوف نے جن اعمال زشت کا اشارہ کیا ہے ان کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ شجاع الدولہ اپنے خاندان کے پہلے شخص تھے جنہوں نے اخلاقی گراوٹوں کی نہایت قبیح مثالیں چھوڑیں جو اِن کے جانشینوں نے اکثر و بیشتر اختیار کیں۔

شجاع الدولہ کی غیر معمولی رغبت صحبت ومباشرت نسواں کا ذکر سب ہی مولفین نے کیا ہے دیونفس سے وہ اس درجہ عاجز تھے کہ سواری پر جاتے جاتے راستہ میں خواہش نفسانی سے بے تاب ہو کر عورت سے صحبت کر لیتے جو اسی غرض سے ہر وقت اور

① ج ۳ ص ۹۴۰.

ہر جگہ ان کے لیے مہیا رکھی جاتیں۔ چند کٹنیاں مقرر تھیں جو جگہ جگہ پھر کر اور ہزاروں روپیہ صرف کر کے خوبصورت عورتیں تلاش کر کے لاتیں۔

کھتری قوم کی ہندو دوشیزہ کا قصہ بہت مشہور ہے جسے راستہ چلتے دیکھتے ہی اس کے حسن و رعنائی سے ایسے گھائل ہوئے کہ رات میں اس کے گھر سے اٹھوا منگوایا رعایا کی بیٹی پر فرمانروا کے اس طرح ہاتھ ڈالنے سے کھتری قوم میں سخت اضطراب پیدا ہوا، جلاوطنی پر آمادہ ہو گئے شجاع الدولہ کی والدہ نے قضیہ کو بمشکل رفع دفع کیا۔ کسبیوں کے علاوہ ان کی مدخولہ متاعی وغیر متاعی عورتوں کی تعداد دو ہزار بتائی گئی ہے۔

دارالحکومت فیض آباد میں جس کی آبادی اور تزئین پر لاکھوں روپیہ صرف کیا تھا۔ رنڈیوں کی وہ کثرت ہو گئی تھی کوئی محلہ کوئی کوچہ ان سے خالی نہ تھا۔ سفر کی حالت میں بھی نواب کے پیش خیمے کے ساتھ ساتھ رنڈیوں کے پیش خیمے بھی چلتے جن کے ساتھ دس دس بارہ بارہ خاصہ بردار بھی ہوتے۔ شجاع الدولہ اور ان کے امرا اور حالی موالی کی عیاشی و فحاشی کے اثراتِ بد سماج کے اکثر طبقوں میں سرایت کرتے گئے ان کے بعض جانشینوں کے زمانہ میں جو کیفیت ہوئی ضمناً اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

وفات اور اولاد:

۱۱۸۸ھ میں جیسا ذکر ہو چکا ہے بعمر ۴۴۔۴۵ سال فوت ہوئے۔ مرض موت سرطانی مادے کے دنبل کا پھوٹنا بتایا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آتشک کا مادہ تھا۔ واللہ اعلم۔ بیاہتا بیوی سے اکلوتے بیٹے مرزا یحییٰ تھے۔ مدخولہ عورتوں سے پچاس اولادیں ہوئیں ۲۵ بیٹے اور ۲۵ ہی بیٹیاں۔

آصف الدولہ:

شجاع الدولہ کے یہی بڑے بیٹے مرزا یحییٰ عرف مرزا امانی نواب آصف الدولہ کہلائے۔ نقشہ چہرے کا کسی قدر باپ کے چہرے سے ملتا جلتا تھا۔ خوش قامت نہ تھے۔ اوپر کا دھڑ تو نسبتاً بڑا تھا اور تلے کا دھڑ کمر سے پاؤں تک اتنا چھوٹا کہ گھوڑے کی سواری نہیں کر سکتے تھے۔ اس جسمانی خرابی کے ساتھ مزاج میں سفلہ پن حد درجہ تھا، بچپن ہی سے بدوضع خواجہ سراؤں کی صحبت میں ایسی بری عادتوں اور بدفعلیوں کے خوگر تھے کہ ان کی دادی نواب عالیہ بجائے ان کے اپنے دوسرے پوتے سعادت علی خاں کی جو لائق نوجوان کنیز کے بطن سے تھے مسند نشینی چاہتی تھیں۔

بہو بیگم ان کی ماں البتہ مامتا کی ماری ان کی طرف دار تھیں۔ اور خود انہوں نے بھی مراسم مسند نشینی ایسی غیر معمولی عجلت سے ادا کروائے کہ جنازہ باپ کا لوگ ابھی قبرستان لے جا رہے تھے اپنے دونوں ماموؤں کو مشایعت جنازے سے باصرار تمام راستہ ہی سے لوٹا لیا۔ محرم اسرار لوگوں اور کمپنی کے دو انگریزوں کی موجودگی میں دستار ریاست اپنے سر پر اس حالت میں بندھوالی کہ محل سرائے سے باپ کی میت نکلنے پر آہ و بکا کی آوازیں تو ادھر بلند ہو رہی تھیں اور ادھر صاحبزادے کی مسند نشینی کی شادمانی اور تہنیت کا غلغلہ مچ رہا تھا۔

بوقت مسند نشینی ۲۶ / ۲۷ برس کی عمر تھی۔ دو کروڑ سالانہ آمدنی کی ریاست جس کا رقبہ صوبہ اودھ کے علاوہ تمام روہیل کھنڈ و صوبہ الہ آباد اور چکلہ کوڑا و چکلہ اٹاوہ نیز سرکار بنارس و اضلاع جونپور و غازی پور پر مشتمل تھا ترکہ پدری سے ہاتھ آئی تھی نااہلیت سے ۲۳ لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کے اضلاع جونپور و غازی پور و بنارس تو شروع ہی میں انگریز کمپنی کے حوالے کر دیئے، انتظامی امور اپنے نائبوں کو سونپ

دیئے۔خود بدولت امور ملکی سے آنکھ بند کر کے شراب نوشی، ناچ رنگ، کھیل تماشوں اور بدوضع رذیل وسفلے مصاحبین وہم نشینوں کی صحبت میں وقت گزارنے لگے۔ان میں اکثر ادنیٰ ذات کے ہندو تھے جنہیں عہدے اور منصب اور راجہ کے خطاب عطا کیے۔

فضول خرچیوں کے واسطے ماں اور دادی پر جبر کر کے باپ دادا کا اندوختہ سرمایا خود بھی چھینتے اور انگریزوں سے بھی چھنواتے رہے ان ہی بیگمات نواب صدر النساء بیگم اور بہو بیگم کے مصائب کی جانب ہی تو سرجآدوناتھ سرکار نے کتاب ہذا کے مقدمہ میں اشارہ کیا ہے۔ بہو بیگم کو اپنے اس اکلوتے بیٹے (آصف الدولہ) سے بعد میں ایسی نفرت پیدا ہوگئی تھی کہ نام لینا بھی گوارا نہ تھا،کسی ضرورت سے خط لکھواتیں۔ لفافے پر ''برخوردار نور چشم'' الفاظ کے بجائے صرف آصف الدولہ لکھواتیں۔

کہا گیا ہے کہ

''ایک کروڑ سے زیادہ کی رقم اپنی دادی اور ماں سے بدفعات اور بہ جبر وصول کر کے روز وشب کے لہو ولعب، شراب نوشی، چوپڑ بازی، ہاتھیوں کی جنگ، کبوتر بازی، مرغوں کی لڑائی، پتنگ بازی،کھیل تماشوں اور سیر وتفریح کے علاوہ صرف ہولی اور بسنت کے جشنوں میں کہ سالانہ تیس لاکھ روپیہ ان ہی جشنوں پر صرف کرتے تھے تھوڑے عرصہ میں نہ صرف یہ سب رقم پھونک دی بلکہ جنگی فوج کو موقوف کر کے جو رقم بچی وہ بھی ان کاموں اور عمارتوں کی تعمیر میں صرف کر ڈالی۔ ماں اور دادی سے علیحدگی کی بنا پر فیض آباد کے بجائے لکھنؤ دارالحکومت بنایا''۔

مورخ طبا طبائی کو لکھنؤ میں دو مرتبہ ان سے خلوت وجلوت میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا وہ لکھتے ہیں کہ

''آصف الدولہ گو بظاہر فہم وشعور سے بے بہرہ تو نہ تھے مگر نہایت درجہ صحبت اراذل و پواج سے رکھتے تھے''۔

بقول مولف تاریخ اودھ:

''اس قدر بے حجابی ، نامشروع اور خارج از غیرت وحیا کاموں میں اختیار کی کہ پواج اور بازاری آدمی بھی مات ہو گئے وہ بھی ایسے کاموں کو سن سن کر شرمندہ ہوتے'' تھے①۔

کتاب ''شیعان ہند'' کے مولف کا یہ قول مطابق واقعہ ہے کہ

''آصف الدولہ ہی کی غفلت وکاہلی وعیاشی سے امور مملکت میں فتور پڑنا شروع ہو گیا تھا انگریز ریزیڈنٹ کو ہر ایک کلی وجزوی امور سلطنت پر حاوی ہونے کا موقع مل گیا تھا مگر باوجود طرح طرح کے لایعنی مشاغل فضول خرچیوں اور بداعمالیوں کے انہماک کے آصف الدولہ نے شیعیت کو فروغ اور شیعی مسلک کی اشاعت کے کاموں میں دل سے کوشش کی''۔

اس سلسلہ میں بعض تاریخی حالات اور واقعات ذیل میں مختصراً پیش کیے جاتے ہیں:

بحالی معافیات اورفروغ شیعیت:

صاحب نزہۃ الخواطر مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنی ایک تالیف ''گل رعنا'' میں ایک موقع پر ضمناً لکھا ہے کہ:

''نواب آصف الدولہ کے زمانے کا یہ کارنامہ بھی یادرکھنے کے قابل ہے کہ لہو ولعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں

① ج ۳ ص ۱۴۱.

انہوں نے دل سے کوشش کی، ان کے نائب حسن رضا خاں بھی مذہبی آدمی تھے وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ان کی کوششوں سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہو گئے اور ان کو جاگیریں ملیں اور جو اپنی ضد پر قائم رہے ان کی جاگیریں جو شاہانِ مغلیہ کے وقت سے چلی آتی تھیں ضبط کی گئیں''۔①

شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے ہمعصر عالم مقتدائے وقت مولانا شاہ اجمل عباسی الہ آبادی رحمہ اللہ کے بیان سے جن کا ذکر گذشتہ اوراق میں آیا ہے مندرجہ بالا قول کی حرف بحرف تائید ہوتی ہے نوابانِ اودھ کی فرمانروائی میں معاشی جبر وتعدی سے تبدیلی مذہب کا بازار کیسا گرم رہا تھا۔ شاہ صاحب موصوف نے ایک طویل نظم میں بیان کیا ہے جس کے چند اشعار آپ بھی سنیے: فرماتے ہیں کہ

''دو رے رسیدہ است کہ ابنائے روزگار
دارند از طریقہ آبائے خویش عار
کردہ ہمہ طریقہ اسلاف خویش گم
ہر یک نمودہ است دگر مذہب اختیار
یارانِ گذاشتند ہمہ راہِ ماسبق
بیجا روند راہ وندارند ننگ وعار
دین راد ہند از پے دنیا ہمہ بہ باد
ہرگز بیک طریقہ نباشند استوار
زاہل جاہ ہر کہ بیک مذہبے رسید

① ص ۱۵۳.

کردند خویش راہماں مذہب اشکار
ایں ناکساں حمیت وغیرت از خود تمام
یکبارہ دادہ انداز پے دنیا امیدوار
افتادہ اند درپے دونانِ دوں مزاج
ہیہات کردہ اندہمہ ننگ دوی شعار
گوید کسے کہ سید عالی نسب منم
گوید کسے کہ مومنم از اہل روزگار
کس گویدا ینکہ شیعہ بیشک وریب ما
ہستیم میکینم تبسرا ہزار بار
زیں نوع ہر کدام فروشند دین خویش
درپیش ہر کدام بہر شہر وہر دیار
بیچارگاں ذلیل شدند دنیا فتند
دین ہم فروختند دگر ہیچ اعتبار
بیہودہ دین فروشی خود می کنند وائے
حاصل نمی شود سخنے غیر ننگ وعار
اے دوستاں ز صحبت رافیضاں حذر
خواہیم تا شویم ازیں خلق ودرکنار
ایں جا چو مرداں ہمہ گشتند شیعیاں
اظہار می کنند تشیع چوں بے شمار“

شیعہ فرمانرواؤں نے ضبطی وبحالی جائیداد ہی کوفروغ شیعیت کا آلہ کار بنایا

اسی کا اشارہ مندرجہ بالا اشعار میں ''دین فروشی'' سے کیا گیا ہے۔

علامہ آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ نے اودھ کے ان چار شیعہ فرمانرواؤں برہان الملک وصفدر جنگ وشجاع الدولہ وآصف الدولہ کے زمانے دیکھے تھے انہوں نے اپنی تالیفات میں جن کے دو فقرے پچھلے اوراق میں درج ہیں علماء وفضلائے بلگرام کے حالات لکھے ہیں خصوصاً ماثر الکرام میں جسے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے ترتیب دے کر شائع کیا تھا مقدمہ کتاب میں ڈاکٹر مرحوم نے اسی تاریخی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرے میں خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ ان علماء وفضلائے بلگرام میں جن کا اس میں ذکر ہے ایک بھی اہل تشیع میں سے نہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب شیعہ نے وہاں بعد کے زمانہ میں رواج پایا......
>
> یہ امر واقعی ہے کہ اودھ کی سلطنت نے خاص کر آس پاس کے اضلاع وقصبات پر اور بعض اوقات دور دراز کے مقامات پر بھی مذہبی لحاظ سے خاص اثر ڈالا ہے چنانچہ جونپور ودیگر مضافات لکھنؤ وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایہ تیقن کو پہنچ جاتا ہے۔ جب مذہب کی پشتی پر حکومت ہوتی ہے تو حالت اندیشہ ناک ہو جاتی ہے میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ سلطنت اودھ نے مذہب کے مقابلے میں کبھی جبر وتعدی سے کام لیا بلکہ بات یہ ہے کہ جاہ طلبی اکثر لوگوں کی نیت کو جو اعتقاد کے کچے ہوتے ہیں ڈانواں ڈول کر دیتی ہے ایسا ہی ہر جگہ ہوا ہے''۔

جائیداد املاک کی ضبطی کے بعد واگذاشت وبحالی کے لیے تبدیلی مذہب کا لالچ

جبر وتعدی ہی شمار کیا جائے گا۔

روہیل کھنڈ پر نوابانِ اودھ کی حکومت کل اٹھائیس برس رہی تھی یعنی ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء سے ۱۲۱۶ھ/ ۱۸۰۱ء تک اس مدت میں بھی آصف الدولہ کی فرمانروائی ۲۴ برس رہی اور سعادت علی خاں کی صرف چار برس۔ یہاں بھی شیعہ حکومت نے مذہبی لحاظ سے اثر ڈالا اور شیعیت کی تبلیغ وتحریص میں بحالی جائیداد کو آلہ کار بنایا۔ روہیل کھنڈ کے بعض شہروں کے تاریخی حالات کے ضمن میں مولفین نے اس کا بھی ذکر کیا ہے[1]۔

راقم الحروف نے ''تاریخ امروہیہ'' جلد اول مطبوعہ ۱۹۳۰ء میں شیعہ سنی کی تفریق مذہب کی ابتداء کے سلسلہ میں سو سوا سو برس پرانی تالیف ''آئینہ عباسی'' مولفہ مولوی محب علی خاں عباسی سے جنہوں نے امروہہ میں شیعہ مذہب کی ترویج کا ابتدائی زمانہ بچشم خود دیکھا تھا حسب ذیل فقرہ نقل کیا تھا:

''اس شہر میں بعد سالار غازی کہ آٹھ سو برس ہوئے ہوں گے اہل اسلام سادات وشرفا بود وباش رکھتے ہیں۔ سب کا ایک مذہب حق اہل سنت والجماعت تھا جیسا کہ آثار واطوار وتصانیف واخبار سے بخوبی ثابت ہے۔ اب عرصہ ۷۵ برس سے بوجہ آنے عمل داری نواب وزیر اودھ کی وہی اس مذہب ...... کا موجد ہندوستان میں ہے بفحوائے اَلنَّاسُ علی دِینِ مُلُوْکھِم بعض بعض نے بطمع نفسانی اپنے بزرگوں کا مذہب حق چھوڑ کر تشیع

[1] محمد ایوب صاحب قادری ایم اے نے اپنے مقدمہ کتاب ''فضائل صحابہ واہل بیت'' میں جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی چند رسائل کا مجموعہ ہے۔ شمالی ہند میں شیعیت کی ترویج واشاعت کے حالات تفصیلاً لکھے ہیں اور روہیل کھنڈ کے مختلف شہروں وقصبوں میں نوابان اودھ کے اثرات سے تبدیلی مذہب کے واقعات بیان کیے ہیں جو حضرات اس بحث سے دلچسپی رکھتے انہیں قادری صاحب کا مقدمہ ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

اختیار کیا۔ اب ہمارے سامنے اس مذہب کو ترقی ہوئی''۔

امروہہ ہی کے دوسرے مورخ اور سنی عالم مولوی آل حسن مودودی مولف ''نخبۃ التواریخ'' کے بیان سے بھی تائید مزید ہوتی ہے انہوں نے خود اپنے ہی پردادا علی احمد مودودی جاگیردار کے تبدیل مذہب کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''محال جاگیران کے نواب آصف الدولہ نے جب ضبط کر لیے واگذاشت واستخلاص کی خاطر لکھنؤ میں کچھ عرصہ مقیم رہے شیعہ معاونین کے اثرات سے وہیں شیعہ ہو گئے ورنہ ان سے پہلے اس خاندان میں کوئی بھی شیعہ نہ تھا۔ ''پیش آزاد دریں سلسلہ کسے مہتمم بشیعت نشدہ''①

یہی حالت وکیفیت دوسرے علوی وحسینی خاندانوں میں خصوصاً عہد اکبری کے مشہور میر عدل اور گورنر بھکر (سندھ) یعنی سید محمد میر② عدل اور ان کے عزیزوں کے

---

① ص ۳۵۔

② مولانا سید محمد میر عدل اپنے زمانہ کے ممتاز علمائے اہل سنت والجماعت سے اور سہروردی سلسلہ کے بزرگ شاہ شرف الدین حسن شاہ ولایت امروہہ کے اخلاف میں سے تھے جن کا سلسلہ نسب بواسطہ جعفر بن علی (النقی) سولہ سترہ پشتوں سے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے متصل ہوتا ہے میر عدل موصوف اسی نسبت سے اور ان کے اہل خاندان ہمیشہ سے اظہارِ نسب میں اپنے کو حسینی کہتے اور لکھتے تھے۔ دستاویزات پر ان کے دستخط ان الفاظ میں ثبت ملتے ہیں:

''شهد علی اقراره محمد بن منتجب الحسینی وحرر بانامله حامدا ومصلیا'' نوابان اودھ کی عملداری میں اس خاندان میں جب شیعیت کا آغاز ہوا حسینی کے بجائے رفتہ رفتہ شیعہ حضرات اپنے کو نقوی کہنے اور لکھنے لگے پھر جو چند سنی ان میں ہیں وہ بھی شیعہ رشتہ داروں کی تقلید میں حسینی کی بجائے اپنے کو نقوی کہتے ہیں۔ اپنے دسویں امام علی بن محمد بن علی الرضا کے جو بروایت اصح خلیفہ مامون الرشید کے نواسے تھے شیعوں نے زمانہ بعد میں دس گیارہ القاب جو اِن کے تجویز کیے ان میں ہادی ونقی لقب بھی ہیں۔ ان علی نقی کے دو بیٹے تھے حسن اور جعفر۔ ان حسن کو شیعہ عسکری کے لقب سے اپنایا گیارھواں امام مانتے ہیں یہ لاولد فوت ہو گئے تھے ان کے بھائی جعفر نے ترکہ کا دعویٰ کیا حسن عسکری کی ایک کنیز نے حاملہ ہونے کا ادعا کیا مگر بعد میں یہ حمل جھوٹا پڑ گیا حسن مذکور بے اولاد ثابت ہوئے جعفر نے میراث لے لی شیعہ حسن عسکری کو امام غائب کا والد مانتے اور کہتے ہیں ان کے ==>

گھرانوں میں آغاز شیعیت کی ہوئی۔ نوابانِ اودھ کی عملداری سے پہلے ایک متنفس بھی ان میں شیعہ نہ تھا۔ بڑے بڑے جاگیردار و معافی دار متعدد تھے اعتقاد کے ان میں جو کچے تھے واگذاشت جائیداد کے لالچ میں شیعہ ہو گئے مگر جو پکے عقیدے کے تھے یا آصف الدولہ کے زمانہ سے پہلے ترک وطن کر کے دوسرے مقامات پر جا بسے تھے وہ سب بلا استثنیٰ اپنے آبائی مذہب پر برابر قائم رہے چنانچہ ان کی اولاد و اخلاف اب تک مسلک اہل سنت والجماعت کی متبع ہیں۔ ①

شیعہ سلطنت کے زمانہ میں تبدیل مذہب کی ایک واضح مثال امروہہ کے بہت قدیم صدیقی خاندان یعنی قاضی نظام الدین قریشی بعہد خلجی کی نسل کی ایک شاخ کی ہے جو بروایت صحیحہ ہمایوں ② بادشاہ کے زمانہ میں بعطائے املاک ملک اودھ میں جا بسی تھی

==> مرنے سے پہلے یا بعد محمد نام فرزند پیدا ہوا تھا وہ دشمنوں کے خوف سے غار میں چھپ گیا وہ ہی امام غائب ہیں اس لیے جعفر کو کذاب کہتے ہیں۔ یہ جعفر کثیر الاولاد تھے۔ امروہہ اور دوسرے مقامات کے نقوی سب ان ہی کی نسل سے ہیں۔

① ان میں جو حضرات بدایوں ومرادآباد وغیرہ میں جا بسے تھے ان کے اخلاف میں محترم ظفر حسن واسطی ایڈوکیٹ کراچی ومحترم سبط بنی نقوی ڈائریکٹر محکمہ موسمیات وغیرہ ہیں جو سب سنی ہیں۔ ان صحیح النسب سنی نقویوں کے علاوہ چند جدید نقوی بھی کراچی میں ہیں بعض امروہہ کے ترکمان خاندان سے ہیں جو ٹرپگہ کہلاتے تھے اور بعض وہیں کے داڑھی رنگے شیخوں میں سے ہیں جو پہلے اپنے کو صدیقی کہتے تھے اب نقوی بتاتے ہیں۔

② ۔ ۱۹۱۶ء کے سالانہ اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں جائنٹ سیکرٹری کانفرنس کی جو رپورٹ پیش ہوئی تھی اس کا وہ جزو جو مسلمانانِ اودھ کے تعلیمی واقتصادی اعداد وشمار اور ان کی خاندانی ونسبی حالات پر مشتمل تھا اہلکار کانفرنس کی حیثیت سے راقم الحروف کا مرتب کردہ تھا ضلع سیتاپور کے تذکرے میں راجہ صاحب محمودآباد کے خاندان کے متعلق یہ بیان کہ ان کے جد القبیلہ بعہد سلطان شہاب الدین غوری امروہہ آئے اور بعہد سلطان محمد بن تغلق شاہ ان میں سے قاضی نصرت اللہ نے اودھ پر فوج کشی کی تھی عدم مبالاۃ کی بنا پر غلط تحریر ہو گیا تھا جو رپورٹ مذکورہ میں جداگانہ بھی چھپ گیا تھا کوئی بیس برس بعد ۱۹۳۰ء میں ''تاریخ امروہہ'' کے دوران تالیف اس صدیقی خاندان کے جو راقم الحروف کا ننھیالی خاندان بھی ہے کہنہ و دیرینہ کاغذات ودستاویزات واندراجات شجرہ ==>

ان کی اکثریت نے جن میں راجہ محمود آباد وتعلقہ داران بلہرہ وہٹوامئو وغیرہ کے گھرانے شامل ہیں نوابانِ اودھ کی عملداری میں شیعہ مذہب اختیار کرلیا ان کے ہم نسب وہم جد صدیقیاں امروہہ جہاں سے ان کا نکاس ہوا اباً عن جداً مسلک اہل سنت والجماعت کے متبع ہیں۔

روہیل کھنڈ کے جاگیرداروں کے علاوہ فرخ آباد کے نوابان بنگش تو سب سنی مسلک کے تھے اور ایسے دلیر وشجیع کہ باوجود قلیل حربی قوت کے نواب احمد خاں بنگش نے وزیراعظم صفدر جنگ کے زبردست فوج کو شکست دے دی تھی مگر گردش ایام سے ان ہی کا ڈرپوک ونوعمر بیٹا نام کا دلیر ہمت (مظفر جنگ) بالآخر سلطنت اودھ کا باج گزار ہوکر بہ طمع دنیوی شجاع الدولہ کی صحبت میں شیعہ ہوگیا۔

مولف تاریخ اودھ نے ضلع علی گڑھ کے سفر میں شجاع الدولہ کے ہمراہ مظفر جنگ کے شیعہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''اس سال محرم کی رسومات اسی ضلع کے قصبہ جلالی میں جو کہ شیعوں کی بستی ہے انجام دیئے گئے۔ایک حکایت یہ ہے کہ نواب مظفر جنگ اسی موقع پر شیعہ ہوگیا۔(ج ۲ ص ۲۲۴)''۔①

==> نسب وغیرہ کے تجسس وتحقیق نیز مہاراجہ سرعلی محمد خاں بالقابہ آف محمود آباد کے خاندانی تحریرات کے مطالعہ سے جو موصوف نے عنایت فرمادی تھیں اس خاندان کے بعد فیروز شاہ خلجی امروہہ میں متوطن ہونے پھر وہاں سے ایک شاخ اولاد قاضی نصرت اللہ عرف قاضی لتھن کے اودھ میں مسکن گزیں ہونے کا ذکر راقم الحروف کی دوسری تالیف تذکرۃ الکرام (ص ۳۴۔۲۳۳) مطبوعہ ۱۹۳۲ء بزمرۂ ترجمہ قاضی الطام قریشی مذکور کیا گیا ہے)

① مولف تاریخ اودھ کے اس فقرے کو مسٹر الطاف علی بریلوی نے ''حیات حافظ رحمت خاں'' کے ص ۲۵۸ طبع ثانی پر نقل کرتے ہوئے ''شیعہ ہوگیا'' کو ''شیعہ ہوئے'' سے احتراماً تبدیل کرکے شیعہ ہونے کا سبب مقتل حسین پر روضہ خوانی وآہ وبکا کا گویا معجزہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''جلالی کے ایک بزرگ زبدۃ السالکین وقدوۃ العارفین حکیم سید شاہ خیرات ==>

مظفر جنگ رئیس فرخ آباد کی طرح رامپوری رئیس نواب محمد علی خاں بھی جو ۱۴۰۹ھ میں اپنے باپ نواب فیض اللہ خاں کے مرنے پر مسند نشین ہوئے تھے آصف الدولہ کے اثر سے شیعہ ہو گئے۔

قیصر التواریخ کے شیعہ مولف فرماتے ہیں کہ

''رامپوری نواب جب بتقریب شادی وزیر علی پسر متبنّٰی آصف الدولہ لکھنؤ آئے تھے جناب عالی (آصف الدولہ) نے ان پر بہت عنایت فرما کر اپنا بیٹا بنایا اور ہدایت دین حق فرمائی تھی''۔①

کہتے ہیں:

''تبدیلی مذہب پر کسی پٹھان نے انہیں قتل کر دیا تھا۔ان کے علاوہ متعدد نوابان رامپور شیعہ مسلک کے پیرو رہے اور بقول مولف کتاب ''مذاہب اسلام'' روہیلہ پٹھانوں کا یہ خاندان ابتداء شیعہ نہ تھا نوابان اودھ ہی کے اثرات سے شیعہ ہوئے تھے''۔②

==> علی سے نواب (شجاع الدولہ) موصوف کو عقیدت تھی ایام عزا میں ایک شب سخت آندھی آئی جس سے خیام اڑ گئے، چراغ گل ہو گئے مگر وہ چراغ جس کے سامنے بزرگ موصوف روضہ خوانی وآہ وبکا میں مصروف تھے روشن رہا اس واقعہ سے متاثر ہو کر نواب مظفر جنگ شیعہ ہو گئے''

بریلوی مولف نے یہ لغو کہانی تاریخ اودھ کے مندرجہ بالا فقرے کے بعد ہی بلا حوالہ کچھ اس طرح لکھ دی ہے جس سے یہ امر مشتبہ ہی رہتا ہے کہ گھڑی ہوئی کس کی ہے۔مولف تاریخ اودھ نے تو اس کی تصریح بھی کر دی ہے کہ مظفر جنگ اس وقت ۱۴، ۱۵ برس کا نوعمر تھا اور حافظ رحمت خاں نے اس کے شجاع الدولہ کے خراج گزار ہونے اور اطاعت کرنے پر لعنت ملامت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''تم نے پٹھانوں کا نام ڈبو دیا کاش تمہاری جگہ نواب احمد خاں کے لڑکی پیدا ہوئی ہوتی''۔(ج ۲ ص ۴۲۵.

① ص ۱۰۸ ج ۱۔

② شیعانِ ہند ص ۱۸۴.

دارالحکومت لکھنؤ شیعیت کا گڑھ:

نواب برہان الملک وصفدر جنگ وشجاع الدولہ کے عہد میں دارالحکومت ان کا فیض آباد رہا۔ کوئی پینتالیس برس بعد آصف الدولہ نے کچھ تو اس وجہ سے فیض آباد انہیں پسند نہ تھا اور زیادہ تر اس بنا پر کہ ماں اور دادی ان کی بدفعلیوں اور فضول خرچیوں سے جس کے لیے بار بار ان سے روپیہ اینٹھتے رہتے تھے سخت متنفر تھیں فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہوئے اس وقت سے لکھنؤ دارالحکومت ہوا اور تبلیغ وترویج شیعیت کا مرکز بھی بنا۔

صفدر جنگ اور شجاع الدولہ لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے زیادہ قیام نہ کرتے تھے ان کے بعض شیعہ عمال اور دستہ فوج کا البتہ لکھنؤ میں قیام رہتا تھا جن کی وجہ سے محرم میں بعض اوقات فساد ہو جاتا۔ ان کے علاوہ باشندگان شہر سب سنی تھے۔ جن میں اکثر وبیشتر شیخ زادگان اولاد واحفاد شیخ عبدالرحیم منصب دار عہد اکبری تھے جو ضلع بجنور (روہیل کھنڈ) سے بعطائے جاگیر یہاں آباد ہوئے تھے نیز شیوخ بنہرہ دیگر افراد خاندان ملک زادگان وقاضی زادگان وبلخیاں وپنڈ وائیاں وشیوخ انصاریان اولاد ملا نظام الدین ① خلف اکبر ملا قطب الدین سہالوی خلیفہ شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمہ اللہ نیز

① شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ملا نظام الدین نے جنہیں بواسطہ خواجہ عبداللہ انصاری حضرت ایوب انصاری کی نسل سے بتایا جاتا ہے قصبہ سہال (نزد لکھنؤ) میں رہنا چاہا ان کے پورے خاندان کی سکونت کے لیے مغلیہ حکومت نے ایک فرانسیسی تاجر کے چار مکانات جو ضبط کر لیے گئے تھے دے دیئے جو فرنگی محل کہلائے۔ یہی وہ ملا نظام الدین تھے جن کا مرتب کیا ہوا نصابِ تعلیم نظامیہ مشہور ہے اور دینی مدارس میں آج تک رائج ہے۔ اسی خاندان کی دوسری شاخ میں مفتی محمد یعقوب انصاری کا گھرانا تھا ان میں نسلاً بعد نسلٍ شہر لکھنؤ کے مفتی ہوتے رہے یعنی مفتی یعقوب کے بعد ان کے فرزند حافظ احمد ابو رحم پھر ان کے بیٹے مفتی محمد اصغر اِن کے بعد مفتی محمد یوسف انصاری مفتی تھے۔ ان کے مکانات بھی جو فرنگی محل سے باہر تھے دیگر علماء کے مکانات کے ساتھ منہدم کرا دیئے گئے۔

مولف توضیح السعادات لکھتے ہیں :==>

بعض پٹھان خاندان بھی قدیم سے یہاں رہتے بستے تھے۔

قدیم باشندوں میں کوئی شیعہ نہ تھا۔ آصف الدولہ کے قیام کے بعد سے فیض آباد اور دوسرے مقامات سے لوگ آ آ کر یہاں بستے گئے۔ نئے آنے والوں میں اکثر شیعہ تھے۔ نواب موصوف کے نائب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں حرف شناس بھی نہ تھے مگر غالی شیعہ تھے۔

ایک شیعہ مورخ ہی کا بیان ہے کہ

''حسن رضا خاں ہر صبح کو نواب آصف الدولہ کے سلام کو دربار جاتے باقی اپنے گھر میں مشغول مصاحبان خاص یا مصروف امور دینی وعزاداری سید الشہداء علیہ السلام رہا کرتے''۔ ① امور دینی سے مراد بقول مولف گل رعنا: ترویج شیعیت ہی ہے۔

اسلامی آثار قدیمہ شہر لکھنؤ میں ایک تو شہنشاہ اورنگ زیب کی تعمیر کرائی ہوئی مسجد تھی جو پیر محمد کے ٹیلے والی مشہور ہوئی پھر مزار حاجی الحرمین وخانقاہ ومزار شاہ مینا عباسی رحمہ اللہ شاہ ولایت لکھنؤ اور درگاہ پیر غیب تھی۔ شیعہ جب آباد ہی نہ تھے ان کا کوئی امام باڑہ وکربلا بھی نہ تھی۔ نواب

==> ''شیخ زادہائے لکھنؤ وشیخ زادگان بجنوریاں کہ از اولاد واجداد ملک العلماء فخر الاسلام والمسلمین شیخ فخر الدین ثانی بجنوری ہستند ودیگر شیوخ انصاریاں وبلخیاں کہ مکانا تش نواب معتمد ولہ بہادر در عہد سلطنت غازی الدین حیدر بادشاہ کند ایندہ آنہا جا بجا متفرق وپریشان گشتند وبعض جلا دوطن شدند''

مولف موصوف نے لکھنؤ کے اطراف وجوانب ودیہات وقصبات جوار ودیار کے خاندانوں میں قدیم خاندان قدوائی کا ذکر کیا ہے اور بتایا کہ ان کی آبادی کے ۵۲ مواضعات مضافات لکھنؤ یعنی باری بنکی وغیرہ اضلاع میں تھے ان کے علاوہ دوسرے علوی عباسی وفاروقی وصدیقی خاندان قرب وجوار میں آباد رہے ہیں جن میں کوئی بھی شیعہ نہ تھا۔

① ص ۱۰۳ ج ۱۔

آصف الدولہ کو عمارتیں بنوانے کا طبعاً شوق تھا حسن رضا خاں کی ترغیب سے بڑے امام باڑے کی مشہور عمارت بنوائی جس کی تعمیر دس سال میں تمام ہوئی اور بروایت قیصر التواریخ پچاس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔①

اس امام باڑے اور دوسری عمارتوں کی تعمیر کے لیے بقول ابوطالب مولف تفضیح الغافلین کہ عہد آصف الدولہ کی تالیف ہے:

''لوگوں کے مکانات معاوضہ دیئے بغیر منہدم کرا دیئے اور اکثر اس حالت میں منہدم کیے گئے اموال واسباب نکال کرلے جانے کا موقع بھی مالکوں کو نہ دیا گیا۔ میٹریل کا کچھ حصہ حاصل کرنے کی خاطر پورے مکان ڈھا دیئے گئے''۔②③

① ص ۱۱۱۲ ج ۱.
② شیعان ہند ص ۱۵۸.
③ شاہ اجمل عباسی الہ آبادی نے ایک فارسی تحریر میں لکھا ہے کہ

''آصف الدولہ الہ آباد آکر قلعہ میں ٹھہرے تھے پھر ایک دن دائرے میں تشریف لائے وہاں درگاہ شاہ افضل الہ آبادی متوفی ۱۱۲۴ھ کی تیاری کے لیے سنگی دالانوں کے اجزا اور سرخ پتھر پڑے تھے ایک خواص کی زبانی کہلا بھیجا کہ یہ سب سامان ہمیں دے دو۔ شاہ صاحب نے جواب میں کہلا دیا کہ یہ مقام اولیاء اللہ کا مدفن ہے پتھر کے بجائے وہ اگر اینٹوں سے بنیا دیں اٹھوالیں''۔

پھر لکھا ہے کہ ''بوقت شبہا کہ چشم بخواب آشنائی نمی کرد بے اختیار مصرع ہائے پے در پے بزبان میرسیدند .... نمی دانم کدام مصرعہ یا بیت در بارگاہ الٰہی حسن قبولیت یافتہ کہ سنگ درگاہِ محفوظ ماند'' یہ چند شعر انہیں کے ہیں:

شد خانقہ خراب وعمارات دل شکست
دلہائے پاک مجمع علیا مدد کنید
اے دربلاد رنج گرفتار آمدہ
از آہ سرد و شورش دلہا مدد کنید
مردانِ غیب بہر خداوند کارساز
بہر بے کسی اجملؔ تنہا مدد کنید

سر سید نے آثار الصنادید میں دہلی کے ایک مقبرے کا ذکر کیا ہے جس کا سرخ پتھر جو لکھنؤ واودھ میں میسر نہ تھا آصف الدولہ نے اپنے امام باڑے اور مسجد کے لیے اس پر سے اتروا منگوایا تھا۔

یہ سب مکانات اہل سنت والجماعت کے مملوکہ ومسکونہ تھے مکانوں کے علاوہ مقابر ودرگاہ وخانقاہ اور مساجد بھی منہدم کرا دی گئیں۔ آصف الدولہ کے ہمعصر پیر طریقت اور ممتاز عالم شاہ اجمل عباسی رحمہ اللہ ان کی مزاجی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے متذکرہ بالا تحریر میں فرماتے ہیں کہ

> ''مزاج ایں وزیر شہرۂ آفاق است کہ ہرچہ برزبانش آمد ہماں می کند کسے عدول حکمی نمی تواند کرد چنانچہ بسیارے از مقابر ودرگاہ اہل اللہ بہ بلدہ لکھنؤ مثل درگاہ حاجی الحرمین کہ پیر شاہ مینا لکھنوی رحمہ اللہ بودند خراب کردہ داخل سنگین محل نو دنمودہ ومساجد وبقاع اہل کمالان را بخاک برابر ساختند وداخل عمارات خود نمودند''۔①

سنیوں کی عمارتیں خصوصاً مکانات مسکونہ ودرسگاہ ومساجد علمائے اہل سنت والجماعت کے انہدام کا سلسلہ آصف الدولہ کے بعض جانشینوں کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔②

مولف ''توضیح السعادت'' نے خود اپنے اور اپنے عزیزوں کے مکانات اور سنیوں کے محلوں کے انہدام کا ذکر قدرے تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

---

① معارف نمبر ۶ جلد ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء۔
② یعنی سید محمد مخدوم حسینی حنفی بجنوری ثم لکھنوی ابن مولانا سید ظہیر الدین حسینی کہ بزرگ ان کے ضلع بجنور (روہیل کھنڈ) سے کسی زمانے میں اٹھ کر قصبہ بجنور پاسیاں (نزد لکھنؤ) آبسے تھے پھر وہاں سے لکھنؤ میں مسکن گزیں ہوئے نسباً زیدی از اولاد واحفاد ابی الفراس بن ابی الفرح الواسطی ہجد زیدیان سکنہ نہٹور ضلع بجنور (روہیل کھنڈ) نسل سے زید بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب تھے خود لکھتے ہیں:
''قلیل تعداد ان کے خاندان کی اہل سنت والجماعت ہے لکھنؤ میں ان کے بزرگ درس وتدریس کا شغل رکھتے تھے اور سید واڑی ٹولہ عقب مکانات نواب ابراہیم علی خاں داروغہ داغ تصیحہ ان کے مسکونہ مکانات تھے جو سب منہدم کردیئے گئے''۔

''الحال بعد غارت گری ناحق کوشاں جملہ ریاست آبائی سیدواڑی محلہ از قسم مکانات ومسجد ومدرسہ قدیم حضرت بحر العلوم جناب مولانا سید مخدوم حسینی نور اللہ مضجعہ از بیخ دین کندیدہ بمیدان ڈھس ووسٹرک مچھی بھون کہ قلعہ قرار یافتہ است بکارسرکار آمدہ وہم در آن محلہ متصل مسجد بحر العلوم مکان شیخ عبدالرحیم نبیرۂ شیخ محمد لائق ہمشیرزادہ بحر العلوم وچند قطعات مکانات مولوی محمد یوسف ابن مولوی محمد اصغر مرحوم ابن مولوی حافظ احمد ابورحم ابن مولانا محمد یعقوب انصاری مفتی شہر بیت السلطنت لکھنؤ زیر دیوار کوٹھی نواب روشن الدولہ بہادر ومکانات مولوی شیخ قدرت اللہ مرحوم متصل لال مسجد عقب درگاہ پیر غیب واقعہ محلہ بنہرہ وہمانجا محلہ اونچی منڈی عقب امام باڑہ عتیق اللہ حجام متصل تھانہ اسماعیل گنج کہ آنجا مکانات نانہانی ابن احقر سید محمد یعنی مکانات شیخ رفعت اللہ وشیخ شجاعت اللہ مرحوم وچند قطعہ مکانات مسکونہ جناب شیخ حسین بخش مرحوم ابن شیخ محمد حسن کمیداں مغفور از خاص بازار ودر دولت شاہی تارومی دروازہ وچوک ہزارہا محلات لکھنؤ از دست غارت گراں بغاوت رفتند وبرباد گشتند انحال نشان آں محلات ومکانات وعمارات عظیم الشان باقی نیست ونماندہ''۔①

بڑے امام باڑے کے علاوہ جس کی آرائش وزیبائش چار پانچ لاکھ روپیہ سالانہ صرف ہوتا تھا ''درگاہ حضرت عباس'' بھی عہد آصفی کی یادگار ہے۔

مولف تاریخ اودھ لکھتے ہیں کہ:

① کتاب توضیح السعادات نسخہ مخطوطہ۔

''مرزا فقیر نام ایک شخص نواب آصف الدولہ کے عہد میں تھا۔ اس نے ایک عَلَم دریائے گومتی کے کنارے پوشیدہ دفن کر دیا اور شہر کے لوگوں سے یہ بات ظاہر کی کہ مجھ کو خواب میں یہ الہام ہوا ہے کہ حضرت عباس کے ہاتھ میں جو عَلَم معرکہ کربلا میں تھا وہ فلاں مقام پر دفن ہے تو اس کو نکال لے اور اپنے طریق کے چند رفیق جمع کر کے اس مقام پر گیا اور جگہ کھود کر وہ عَلَم نکالا جو بھرت کا سہ شاخہ تھا اور گھر میں کہ رستم نگر میں واقع تھا نہایت تعظیم کے ساتھ رکھا''۔①

ضعیف الاعتقاد عوام میں شہرت اس کی ہوگئی نواب آصف الدولہ کے خدمت گار نے باتوں باتوں میں انہیں بھی عَلَم کی برکتوں کا یقین دلا دیا نواب نے فقیرا کو ایک ہزار روپیہ عطا کیا اینٹوں کا گنبد بنوا کر زیارت کو بھی آنے لگے پھر تو بقول مولف مذکور نوچندی جمعرات کو مصنوعی درگاہ میں ہزاروں تماشائی اور شہر کی پری پیکر طوائفیں بن ٹھن کر جمع ہونے لگیں آصف الدولہ کے جانشینوں نے اس کو اور بھی رونق دی۔ نواب سعادت علی خاں کو ایسی عقیدت تھی کہ بقول مولف قیصر التواریخ:

بعد غسل صحت بڑے جلوس سواری سے درگاہ میں آئے مرض الموت میں بار بار کہتے:

''یا حضرت عباس! میری اس وقت مدد کرو مجھے اب کی بچالو''۔②

ان کے بیٹے کا شیعہ مورخ قیصر التواریخ کے بیان کے مطابق:

''اکثر دسترخوان درگاہ حضرت عباس علیہ السلام میں ہوتا تھا اور اکثر خود ہی زیارت کو جاتے تھے آراستگی بھی بہت خوب کی تھی جلو خانہ بہت وسیع بنوایا

① ص ۳۰۰ ج ۲۔ ② ص ۲۰۰ ج ۱۔

تھا''۔①

پہلوئے درگاہ میں نواب محبت خاں فرزند حافظ رحمت خاں کی اولاد رہتی تھی اکثرمحرم میں فساد ہوجایا کرتا تھا نواب غازی الدین حیدر نے ان لوگوں کو ہٹا کر یہاں عباس گنج آباد کرنے کی تجویز کی مگر موت نے مہلت نہ دی۔

آصف الدولہ کے علاوہ ان کے جانشینوں میں تقریباً ہر ایک نے اور ان کے امرانے امام باڑے بھی بنوائے اور نام نہاد کربلائیں بھی شیعہ مورخ ہی کا بیان ہے کہ

''میر خدا بخش نے جنہیں تعصب اور غلو مذہب اثنا عشریہ میں از حد تھا کربلا بنوائی تھی محرم میں تعزیہ داری بہت زور وشور و ہنگامہ الفاظ جہال سے کی تھی روز عشرۂ محرم قریب کربلا کشت وخون بھی ہوا تھا اسی جہت سے ایک پلٹن نجیب بحکم سرکار نوکر رکھی تھی جس میں سب شیعہ مذہب بھرتی ہوئے''۔②

مجالس محرم اور تبرا:

لکھنؤ کی مجالس عشرہ محرم میں تبرا کہنے کا سلسلہ تو شجاع الدولہ کے شیعہ عمال ہی نے شروع کر دیا تھا جس کی بنا پر جھگڑے اور فساد بھی ہوتے تھے اسی بنا پر مولانا عبدالعلی③ محمد فرنگی محل متوفی ۱۲۲۵ھ نیز ملا محمد حسن فرنگی محلی متوفی ۱۱۹۹ھ کو جلاوطن بھی

① ص ۲۳۸ ج ا۔

② قیصر التواریخ ص ۲۳۹ ج ا۔

③ یعنی ملا نظام الدین انصاری سہالوی کے لائق فرزند کی ۱۱۴۴ھ میں ولادت ہوئی فراغت تحصیل علوم کے بعد لکھنؤ میں درس وتدریس کا شغل رہا۔ ہندوستان اور بیرون ہند سے طالبان علم کا ہجوم رہتا، سنی شیعہ تنازعہ کی بنا اور شیعہ حکومت کے تبرائیوں کی پشت پناہی کی وجہ سے جلاوطن ہونا پڑا۔لکھنؤ سے نکل کر بیس برس شاہجہاں پور چار برس رامپور میں فیوض علمیہ سے طلب کو مستفیض کرتے رہے پھر نواب کرناٹک والد جاہ محمد علی خاں کے اصرار پر قدیم باشندے گو یا مئو کے تھے مع چار سو طلبہ کے مدراس چلے گئے پھر وہاں سے پلٹ کر لکھنؤ نہ آئے ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ کو وہیں منزل آخرت طے کی۔

ہونا پڑا تھا یہ غیرت مند سنی علماء اسی بستی میں نہ رہنا چاہتے تھے جہاں خلفائے اسلام وصحابہ کرام پر حکومت کی پشت پناہی سے سب وشتم کیا جاتا ہو آصف الدولہ اور ان جانشینوں کے زمانہ کی مجالس عزا میں تبرا کا معمول ہی ہو گیا تھا۔

قیصر التواریخ کے شیعہ مولف کمال الدین حیدر حسن الحسینی زائر نے نواب معتمد الدولہ کے یہاں عشرہ محرم کی مجالس کے ذکر میں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ

''دہلی کے مغل شہزادے عباس مرزا جو لکھنؤ میں رہتے تھے اور مسلکاً سنی تھے عشرہ محرم میں ۸ تاریخ کو نواب معتمد الدولہ کی مجلس میں تشریف لے گئے۔ موافق معمول کے مجلس میں تبرا ہوا، بہت ناگوار گذرا خفا ہو کر مجلس سے اٹھ کر چلے آئے''۔①

مولف مذکور نے مزید لکھا ہے کہ

''حکمراں اودھ کو جب یہ حال معلوم ہوا کہ تبرا نہ سن سکنے کی بنا پر مجلس سے اٹھ کر چلے گئے وظیفہ ان کا ایک ہزار ماہوار کا سرکار شاہی سے موقوف کرا دیا''۔

تبرایوں کی پشت پناہی بہر حال شیعہ حکمرانوں کے لیے مذہباً بھی ضروری تھا بایں ہمہ انہوں نے تو یہ قانون بھی بنا رکھا تھا کہ سنی کا شیعہ قاتل لکھنؤ میں پھانسی کی سزا نہیں پا سکتا۔ میجر جرنل سلیمن نے جو ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۶ء تک لکھنؤ میں ریزیڈنٹ رہے تھے اور جنہیں لارڈ لہوزی نے سلطنت اودھ کے نظم ونسق پر تفصیلی رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی تھی اپنی رپورٹ میں عدل وانصاف اور نفاذ قانون کے سلسلہ میں ایک ناظم علاقہ (کمشنر) کا ذکر کیا ہے جو شیعہ تفضیلیہ تھا اور سید بھی اور خونریزی کا مجرم

① ص ۱۷۵ ج ا۔

بھی وہ سزا سے بچنے کے لیے بھاگ کر لکھنؤ آ گیا تھا۔

مسٹر سلیمن لکھتے ہیں کہ:

''لکھنؤ میں کوئی شیعہ قتل کرنے کے جرم میں خواہ کسی سنی ہی کو کیوں نہ قتل کیا ہو۔ ہندو کا تو ذکر ہی کیا موت کی سزا نہیں پا سکتا۔ اگر کوئی ہندو کسی ہندو کو قتل کر دے اور مسلمان ہو جائے وہ بھی موت کی سزا نہیں پا سکتا اور حکم سنا دینے کے بعد بھی مسلمان ہو جائے تو اس حکم کا نفاذ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نوعیت قانون کی ہے اور روزمرہ کا عمل درآمد بھی ہے''۔①

لکھنؤ کے شیعہ عوام کے لیے شیعہ حکومت کی پشت پناہی اور متذکرہ بالا قانون سے جو فضا پیدا ہوئی وہ تبرا بازی اور عظمائے اسلام کی بدگوئی ودشنام دہی کے لیے بہت سازگار تھی۔

مولانا شرر نے اپنی کتاب ''گذشتہ لکھنؤ'' میں ہزل گوئی کے سلسلہ میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ

''یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ میں شیعہ سلطنت قائم ہوئی تو شیعیت نے اپنے اصلی رنگ کو قائم رکھ کے کمال آزادی کے ساتھ اپنے ہر اصول میں ترقی کی۔ مذہب شیعہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ایک تولاّ یعنی خاندان نبوت کے ساتھ اظہارِ محبت اور دوسرا تبرا یعنی اس خاندان محترم کے دشمنوں سے اپنی برأت ظاہر کرنا جس نے باہمی رقابت وتعصب کے بڑھنے سے سب وشتم کی صورت اختیار کر لی۔

پہلے تینوں جانشینان رسالت کو اہل سنت افضل الناس بعد انبیاء ورسل اور

---

① شیعیانِ ہند ص ۱۶۳ بحوالہ رپورٹ سلیمن۔

سچے جانشینان رسالت مانتے ہیں اور شیعہ ان کو غاصب وظالم بتاتے ہیں۔
عوام شیعہ اپنے مذہب کے مطابق ان پر زبان سب وشتم دراز کرنے لگے اور یہی چیز سنی شیعوں میں باہمی تعصب کی بنا قرار پا گئی۔
عہد شاہی میں اس پر تلواریں نکل پڑا کرتی تھیں اور انگریزی میں بھی آج تک کبھی کبھی فوجداریاں اور مقدمہ بازیاں ہو جایا کرتی ہیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہرزیہ اور ہرزیہ خوانی (یعنی منظوم تبرا دست وشتم صحابہ کرام) کو مکانوں کی چاردیواری سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی''۔①

لکھنؤ سے تبرا و دشنام دہی صحابہ وخلفاء کی وبا رفتہ رفتہ سارے ملک کے شیعوں کی مجالس عزا ہی کی نہیں بلکہ شیعوں کے مذہبی کتابوں اور شیعہ مبلغین ومقررین کی تقریروں کی امتیازی خصوصیت ہو گئی۔ اور ایسی مذموم کہ زمانہ حال کے ایک شیعہ مورخ کو اپنی قوم سے احتجاج کرنا پڑا۔

وہ لکھتے ہیں کہ

''اسلام کی آسمانی کتاب کسی مذہب کے بزرگوں کو خواہ وہ کیسے ہی ہوں برا کہنے کی اجازت نہیں دیتی۔ مذہبی احکام سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو عقلاً اخلاقاً بھی کوئی ضمیر دوسرے کی توہین کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا فریقین سنی وشیعہ کے درمیان نزاعی واختلافی مسئلہ صرف خلافت کا ہے۔
سنیوں کے خیال میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے عبدالمجید خاں مرحوم معزول سلطان ترکی تک جن کی مجموعی تعداد چورانوے ہوتی ہے۔ سب امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین ہیں۔ سنی اگرچہ ائمہ اہل بیت کی خلافت کے

① ص ۱۰۸.

قائل نہیں تاہم ان کا احترام کرتے ہیں، شیعہ بھی سنیوں کے خلفا کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ ان کا احترام۔ کیونکہ ان کو ملوک وسلاطین سے زیادہ نہیں سمجھتے۔

خیر یہاں تک تو مضائقہ نہ تھا نہ سنیوں کی دل آزاری تھی نہ ان کو وجہ شکایت مگر ان لوگوں (شیعہ تبرائیوں) نے تو وہ طریقہ اختیار کرلیا جو اِن کے مذہب مصفّا کے دامن کو داغدار بنانے کی حد تک پہنچ گیا اور دشمنانِ خدا ورسول ومخالفانِ اہل بیت سے ان کو اتنی کاوش نہیں جتنی خلفائے ثلاثہ سے ہے جن کو مسلمانوں کا سواد اعظم رسول اللہ کے بعد تمام دنیا سے افضل واشرف سمجھتا ہے اپنی اس غیر دانش مندانہ حرکت کی بدولت یہ لوگ ہمیشہ مغلوب ومقہور رہے۔

سیاسی ومذہبی نقصان اٹھاتے طرح طرح کی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلیں بلکہ اب تک بھی وہ طرح طرح کے خساروں میں مبتلا اور دوسروں کی نظر میں حقیر وقابل نفرت ہی ہیں تاہم اپنی ضد پر جمے ہوئے ہیں اور خود کو مومن کہتے ہیں مگر یہ خبر نہیں کہ مومنین کی جو خاص صفات قرآن مجید میں بیان فرمائی گئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے:

﴿هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾

''وہ (یعنی مومن) بے ہودہ باتوں سے پرہیز کرتے ہیں''۔

زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے بہت ممکن ہے کہ آئندہ کسی وقت میں شیعوں کی اس رسم کو جسے وہ اپنا مذہبی فریضہ اور حق سمجھتے ہیں دوسروں کے لیے مذہبی توہین اور باعث دل آزاری بلکہ موجب نقض امن قرار دے کر جبراً وحکماً

روکا جائے۔①

نماز جمعہ و جماعت شیعہ کی ابتداء:

آصف الدولہ ہی کے زمانہ میں نمازِ جمعہ و جماعت شیعہ کی ابتداء ۱۲۰۰ھ میں لکھنؤ سے ہوئی اس سے پہلے ہندوستان کے کسی خطہ وشہر میں شیعوں کی نماز جمعہ و جماعت جداگانہ ہوتی تھی نہ کہیں ان کی مخصوص مسجدیں تھیں کوئی شیعہ جماعت سے اگر نماز پڑھتا تو عام مساجد میں سنی امام کے پیچھے تقیہ سے پڑھ لیتا کیونکہ شیعہ مذہب میں سنی امام کے پیچھے تقیہ سے نماز پڑھنے کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی ہو۔②

اور تقیہ تو بقول ایک شیعہ امام کے مذہب شیعہ کی گویا جان ہے③۔

جناب جعفر صادق رحمہ اللہ سے یہ قول منسوب ہے کہ

''تسعة اعشار الدين في التقية ولا دين لمن لا تقية له'' (یعنی دین کے

---

① ص ۲۳۴ جلد اول مجاہد اعظم مولفہ شاکر حسین نقوی۔

② امامیہ کے مجتہد اعظم ابن بابویہ قمی متوفی ۳۸۱ھ نے کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں اپنے امام کا یہ قول نقل کیا ہے:

''من صلى معهم في الصف الاول كان كمن صلى خلف رسول الله في الصف الاول''

(یعنی جس (شیعی) نے صف اول میں سنی امام کے پیچھے نماز پڑھی وہ ایسا ہی ہے جیسے رسول اللہ کے پیچھے صف اول میں پڑھی ہو''۔

③ قرآن مجید کی مشہور آیت ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ ''اللہ کے نزدیک تم میں وہی زیادہ شریف ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے''۔ کے متعلق شیعہ اپنے ان ہی امام سے یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ ''اتقاکم'' سے مراد زیادہ تقیہ کرنے والے سے ہے''۔ (شیعیان ہند ص ۵۳)

اور ملا باقر مجلسی نے حیات القلوب میں یہ بھی لکھ مارا ہے کہ

''جب تک سورۃ المائدہ کی آیت ﴿وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ ''اے رسول! اللہ تمہیں لوگوں سے محفوظ رکھے گا'' نازل نہیں ہوئی تھی رسول اللہ ﷺ بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) تقیہ کیا کرتے تھے''۔

دس حصوں میں سے نو حصوں میں دین تقیہ میں ہے اور جو (شیعہ) تقیہ نہ
کرے اس کا کوئی دین ہی نہیں۔①

لیکن شیعہ حکمرانانِ اودھ کے دور اقتدار میں تقیہ کی کچھ ضرورت ہی باقی نہ رہی تھی اس لیے بقول شیعہ مولف عماد السعادت آصف الدولہ کے نایب مرزا حسن رضا خاں نے شیعیان لکھنؤ کی نمازِ جمعہ و جماعت کا علیحدہ انتظام کر دیا وہ لکھتے ہیں:

''بانی جمعہ و جماعت در اثنا عشریاں اور لکھنؤ او (حسن رضا خاں) بودہ است۔ در ہیچ شہرے از شہر ہائے ہندوستان نماز جمعہ و جماعت در مذہب امامیہ رائج نہ بود بلکہ کسے گماں ایں ہم نہ بود کہ در ایران و بلاد عرب از جمعہ و جماعت در عشریان گزاردہ می شود''۔

''لکھنؤ کے امامیہ اثنا عشریہ میں نماز جمعہ و جماعت کے بانی حسن رضا خاں تھے۔ ہندوستان کے شہروں میں سے کسی شہر میں بھی مذہب امامیہ میں نماز جمعہ و جماعت رائج نہ تھی بلکہ کسی کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ ایران اور عرب میں بھی اثنا عشریوں کی نماز جمعہ و جماعت ہوتی ہو''۔

لکھنؤ میں اقامت نماز جمعہ و جماعت شیعیان جس ماحول میں شروع ہوئی۔قیصر التواریخ کے شیعہ مولف ہی نے اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''لکھنؤ میں مومنین برائے نام شیعہ تھے اور اپنی عدم واقفیت سے اعمال خلاف عوام بھی کرتے تھے۔اس قدر ضروریات مذہب سے آگاہ نہ تھے اور بعض جو از راہِ علم واقف تھے طریقہ ہدایت پند و وعظ و جماعت نماز علی رؤس الاشہاد نہ کہہ سکتے تھے''۔②

---

① اصول کافی۔ ② ص ۱۱۳ ج ۱.

شیعہ مؤرخ کے بیان سے اس بات کی تائید مزید ہوتی ہے کہ آصف الدولہ کے عہد حکومت کے ابتدائی زمانہ تک لکھنو میں شیعہ آبادی کا عنصر برائے نام تھا، نہ کوئی مجتہد اِن کی رہنمائی کو موجود تھے نہ نماز باجماعت ہوتی تھی۔ نہ شیعوں کی کوئی درسگاہ ومسجد جداگانہ تھی۔ لکھنؤ کے مشہور خاندان اجتہاد کے بانی مولوی دلدار ① علی نصیر آبادی نے بھی جن کا آبائی مذہب قدیم الایام سے اہل سنت والجماعت تھا۔ ابتدائی تعلیم دارالعلوم فرنگی محل میں سنی اساتذہ سے حاصل کی پھر مرزا احسن رضا خاں مذکور کے جو حرف شناس بھی نہ تھے پیش نماز اوران کے بیٹے کے معلم رہے کچھ دن بعد مرزا مذکور نے اپنے صرف سے انہیں عراق اس غرض سے بھیج دیا کہ علمائے کربلا ونجف سے استفادہ کرکے سنداجتہاد لے کرآئیں۔

مولانا شرر نے ''گزشتہ لکھنؤ'' میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

① مولوی دلدار علی نصیر آباد جائس (ضلع رائے بریلی) کے رہنے والے تھے سلسلہ نسب ۲۲ واسطوں سے جعفر ثانی بن علی بن محمد بن علی الرضا سے ملتا ہے جنہیں امامیہ دسواں امام مانتے اور علی نقی کہتے ہیں۔ ان جعفر ثانی کو شیعہ امامیہ کذاب سے اس بنا پر ملقب کرتے ہیں کہ اپنے حقیقی بھائی اور امامیہ کے گیارہویں امام حسن عسکری کے لاولد مرجانے سے میراث اپنے متوفی بھائی کی لے لی تھی امامیہ نے یہ وضعی قول بھی رسول اللہ ﷺ سے منسوب کررکھا ہے کہ فرزند جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب پیدا ہولقب اس کا صادق رکھنا کیونکہ اس کی اولاد میں ایک ہم نام اس کا دعویٰ امامت کا کرے گا وہ کذاب ہوگا۔ مولوی دلدار علی کے خاندان کے علاوہ جولوگ بھی نقوی کہلاتے ہیں وہ سب ان ہی جعفر کی نسل ہیں۔ سید محمد مخدوم حسینی مولف توضیح السعادت مولوی دلدار علی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''از نسل جعفر کذاب در قصبہ نصیر آباد وقصبہ جائس اکثرے حی وتمام موجود اند......مولوی دلدار علی کہ از قدیم الایام آبائی مذہب اہل سنت وجماعت داشتند ودرعہد حکومت نواب آصف الدولہ بہادر وبعد نیابت مرزا احسن رضا خاں باوجود کم علمی اولاً پیش امام مرزا احسن رضا خاں شدند وبعد چندے دعویٰ اجتہاد ونمودہ مجتہد مذہب امامیہ شدند بعد فوتش بخطاب مجتہد العصر غفران مآب مقلب شدند وپسران مولوی دلدار علی مولوی سید محمد ومولوی میرن را امر دمان معتقدین مجتہد العصر والزماں میگویند وبالفعل خود را نائب مہدی آخر الزماں قرار دادہ اند''۔

''مجتہدین شیعہ کا آغاز بھی فرنگی محل سے ہوا۔ لکھنؤ کے پہلے مجتہد مولوی دلدار علی صاحب نے ابتداءً کتب درسیہ فرنگی محل ہی میں پڑھی تھیں پھر عراق میں جا کے علمائے کربلا و نجف کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور واپس آ کے خود فرنگی محل والوں کی تصدیق و تقریب سے مجتہد اور شیعہ فرمانروایانِ وقت کے مقتدا قرار پائے''۔①

کتاب تذکرۃ العلماء شیعی کے مولف سید مہدی بن سید نجف رضوی نے بھی مولوی دلدار علی کو پہلا ہندوستانی مجتہد بتایا ہے اور لکھا ہے کہ

''آں جناب اول کسے بودہ اند کہ در بلاد ہندوستان بمرتبہ اجتہاد رسیدہ و بنائے اقامت نماز جمعہ و جماعت بطریقہ حقہ امامہ دریں دیار گذاشتہ اند''۔

اور خود مولوی دلدار علی نے جو ''رسالہ اجازہ'' اپنے فرزند اکبر مولوی سید محمد کے لیے تحریر کیا تھا اس میں اپنے عراق جانے وہاں کے شیعہ علماء سے مستفیض ہو کر واپس آنے اور لکھنؤ میں مقیم ہونے کے سب حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''جب میرے ولی نعمت (مرزا حسن رضا خاں) نے لکھنؤ میں نماز جمعہ و جماعت ''برطبق مذہب اہل بیت علیہم السلام'' قائم کرنے کا پختہ ارادہ کر کے مجھ سے باصرار بسیار اقامت نماز کے لیے کہا اگر چہ بہ بسبب حق نعمت گنجائش انکار کی نہ تھی مگر دو وجہ سے چاہتا تھا کہ مجھے اس سے معاف رکھیں ایک تو یہ کہ یہ منصب بزرگ و جلیل القدر ہے اور میرا مرتبہ علماء و کملاء حقہ میں قاصر اور کمتر ہے دوسرے یہ کہ بہ سبب تسلط اہل خلاف و شوکت اہل

① ص ۱۲۴۔

طغیان واعتساف ان شہروں میں امامیہ کی نماز جمعہ و جماعت گذشتہ زمانہ میں نہیں ہوتی تھی۔

لہٰذا نئی بات سے لوگوں میں استعجاب واستغراب کا اور بعضے ''مخالفین بدکردار'' کی جانب سے خلل اندازی کا احتمال تھا مگر یہ جان کر کہ رئیس مملکت (آصف الدولہ) چونکہ ترویج دین مبین میں نیک صادق رکھتے ہیں اور مذہب ائمہ معصومین کو برتری وفوقیت دینے میں ہمت ان کی مصروف ہے اس لیے میں نے بھی ہمت کا دامن مضبوط تھام لیا اور حق تعالیٰ کی استعانت سے اقامت جمعہ و جماعت کا آغاز ۱۳ رجب المرجب ۱۲۰۰ھ کو کیا کہ وہ روز میلاد حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہے اور دولت خانہ ولی نعمت مرزا حسن رضا خاں میں بصحابت آنحضرت ﷺ خورشید منزلت جناب نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر جماعت مومنین کے ساتھ ظہر وعصر ادا کی اور اسی مہینے کی ۲۷ کو کہ روز مبعث حضرت سید المرسلین ہے نماز جمعہ کی سعادت حاصل کی''۔ (ملخصاً)

مجتہد موصوف کے اس بیان میں الفاظ ''اہل خلاف'' و''اہل طغیان واعتساف'' و''مخالفین بدکردار'' سے ظاہر ہے مراد مسلمانوں کے سوادِ اعظم اہل سنت والجماعت ہی سے ہے مگر سنیوں کو شیعوں کے نماز جمعہ و جماعت پڑھنے سے نہ کوئی وجہ مخالفت یا خلل اندازی کی تھی نہ ہوسکتی تھی۔ اور نہ ہوئی البتہ جب غالی فرقہ شیعہ نے کلمات اذان میں حضرات خلفائے ثلاثہ کے غاصب خلافت ہونے کی بدگوئی کے اضافے وقتاً فوقتاً کیے اور بالاعلان کہنا چاہا یہ فعل موجب فساد ہوسکتا تھا اور رہوا۔ اور لکھنؤ کے اہل سنت نے جیسا آگے بیان آتا ہے بدگوئی کے ان الفاظ کو برداشت نہ کیا۔

شیعہ اذان اور خلفائے ثلاثہ کی بدگوئی:

مسجدوں میں اذانیں تو محض اوقات نماز کی اطلاع کے لیے دی جاتی ہیں اور یہ طریقہ اطلاع کا اواخر ا ھ سے یعنی اس وقت سے جاری ہوا جب مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد مشورہ اس کا ہوا کہ اطلاع اوقات نماز کی کس طرح دی جائے لوگوں نے اپنے اپنے خیال کا اظہار کیا کسی نے آگ روشن کرنے کی صلاح دی کسی نے ناقوس بجانے کی، کسی نے ڈھول پیٹنے کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں نہ ایک آدمی مقرر کر دیا جائے جو الصلوٰۃ الصلوٰۃ پکار دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رائے پسند فرما کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور فرمایا:

''قم یا بلال فناد بالصلوۃ''

(اے بلال اٹھو اور نماز کی اطلاع پکار دو)①

الصلوٰۃ کی یہ اطلاع واعلان اور پکار اسلام کے بنیادی اصول توحید ورسالت کے اعلان کے ساتھ جن کلمات سے کی گئی وہی عہد رسالت سے آج تک دنیا کے گوشہ گوشہ میں موذن کہتے ہیں اور جیسا ہر مسلمان جانتا ہے وہ کلمات یہ ہیں:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ (چار مرتبہ) پھر اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (دومرتبہ) پھر اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ (دومرتبہ) پھر حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ (دو دو مرتبہ) اس کے بعد دو مرتبہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اور آخر میں ایک مرتبہ کلمہ توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔

مستند کتب احادیث وسیر وتاریخ کی تصریحات سے ثابت ہے کہ صرف یہی وہ کلمات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے موذن خاص حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اذان میں کہلوائے اور یہی کلمات دوسرے موذن حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں،

① صحیح بخاری.

حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ مسجد حرام مکہ میں اور حضرت سعد القرظ رضی اللہ عنہ مسجد قبا (حوالی مدینہ) میں بعہد رسالت اذانوں میں کہتے تھے۔ فتح مکہ ۸ ھ میں خانہ کعبہ کی چھت سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان میں صرف یہی کلمات کہے تھے۔ پھر زمانہ خلافت راشدہ علیٰ منہاج نبوت میں جو حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم ہوا یہی کلمات کہے جاتے تھے اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایام خلافت میں بھی یہی اذان رائج رہی پھر تمام مدت خلافت بنی امیہ و بنی عباس سے کہ زمانہ ان کا سات سو برس سے زائد رہا۔

پھر ترکی خلافت کے زمانے سے آج تک وہی کلمات اذان کے کہے جاتے ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائے تھے۔ غالی شیعہ راویوں نے امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ذات کے جذبہ عناد میں کلمات اذان کے سلسلہ میں اپنے ایک امام جناب جعفر سے دو روائتیں منسوب کر ڈالی ہیں۔ اگرچہ کلمات اذان ان میں بھی وہی ہیں جو اسلامی اذان کے ہیں۔

شیعہ امامیہ کے مجتہد اعظم ابن بابویہ قمی الصدوق نے اپنی کتاب من لا یحضرہ الفقیہ کے باب الاذان میں جبرئیل فرشتہ سے یہی کلمات معراج کی اذان میں کہلوائے ہیں اور ملا باقر مجلسی نے اپنی کتاب حیوۃ القلوب کا چوبیسواں باب پورے کا پورا جو ۳۷ صفحات پر مشتمل ہے معراج جسمانی کی وضعی روایتوں سے بھرپور کرتے ہوئے یہی کلمات اذان درج کیے ہیں یعنی کلمہ توحید و رسالت کے دو دو مرتبہ کہنے کے بعد حضرت جبرئیل سے یہ کلمات کہلوائے تھے:

''پس جبرئیل گفت حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ ۔حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ ، حَیَّ عَلَی الْفَلاَح۔حَیَّ عَلَی الْفَلاَح۔

ملائکہ گفتند در صدا است کہ بیک دگر مقرونند محمد برپا میشود و بعلی میرسند

بفلاح درست گاری''①۔

''پس جبرئیل نے کہا: حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة۔ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة، حَيَّ عَلَى الْفَلَاح۔ حَيَّ عَلَى الْفَلَاح ملائکہ نے (یہ سن کر) کہا یہ دو صدائیں ہیں جو ایک دوسرے سے مقروں و مربوط ہیں (نماز) محمد ﷺ سے برپا ہوتی ہے اور علی تک ساتھ فلاح و درست گاری کے پہنچتی ہیں''۔

گویا ملا باقر مجلسی نے بروایت جناب جعفر رحمہ اللہ جبرئیل فرشتہ کی اذان میں صرف یہ دو ہی صدائیں بتائی ہیں تیسری وضعی صدا حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ نہیں بتائی۔

اذان کی ایک دلچسپ روایت مجتہد اعظم ابن بابویہ الصدوق نے ان ہی جناب جعفر رحمہ اللہ سے یہ بھی منسوب کی ہے کہ جبرائیل فرشتہ نے اذان کا نزول جب رسول اللہ ﷺ پر کیا اس وقت آپ کا سر مبارک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گود میں تھا فرشتہ اٹھ کر چلا گیا تو آپ نے حضرت علی سے پوچھا تم نے اذان سن لی؟ کہا سن لی فرمایا: یاد کر لی؟ کہا: یاد کر لی؟۔ کہا یاد کر لی۔ فرمایا: بلاؤ بلال کو چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلا کر اذان سکھا دی گئی۔②

اس وضعی روایت سے بھی ثابت ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو وہی کلمات اذان کے سکھائے گئے تھے اور وہی کلمات وہ کہا کرتے تھے جو مسلمانانِ عالم میں رائج ہیں جن میں حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ وغیرہ کلمات ہرگز شامل نہ تھے۔ اگر شامل ہوتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے زمانہ خلافت میں ان زائد کلمات کے اذانوں میں کہلوانے سے کس کا خوف مانع ہوسکتا تھا۔

---

① ج ۲ ص ۹۷ ۲ مطبوعہ تہران ۱۳۷۴۔
② من لا یحضرہ الفقیہ ص ۷۶ مطبوعہ ۱۳۷۶۔

تاریخی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ تیسری چوتھی صدی ہجری میں وقتاً فوقتاً شیعوں کے غالی فرقوں نے بعض کلمات وضع کر کے اذانوں میں شامل کیے۔عبیدیوں کے سپہ سالار جوہر نے جب مصر پر قبضہ کر لیا۔حَیَّ عَلٰی خَیرَ الْعَمَلِ الفاظ اذانوں میں کہلوائے۔①

عبیدیوں کے زیر تسلط علاقہ شام کی اذانوں میں بھی یہ کلمات کہے جانے لگے۔② امیر المومنین المقتدی باللہ عباسی رحمہ اللہ کے زمانہ میں عبیدیوں کو ملک شام میں ملک الاقسیس نے شکست دے کر وہاں رفض کا خاتمہ کر دیا تو اذان کے اصل کلمات پھر کہے جانے لگے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ ملک موصوف کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''ازل الرفض عن اهل الشام وابطل الاذان بحَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ وامر بالترضى عن الصحابة اجمعين ''۔③

''ملک شام کے باشندوں میں سے رفض مٹا دیا اور اذان میں حی علی خیر العمل کو موقوف کر دیا اور تمام صحابہ پر رضی اللہ عنہم کہنے کا حکم دیا''۔

مصر و شام کے علاوہ بغداد کے رافضیوں نے چوتھی صدی ہجری میں شیعہ امیر الامرا بنی بویہ کی پشت پناہی سے اول تو محمد وعلی خیر البشر کے کتبے مساجد کے دروازوں پر لگائے پھر اذانوں میں الفاظ حی علی خیر العمل کہلوائے اس پر سنی شیعوں میں فسادات ہوئے بنی بویہ کی امیر الامرائی کا جب خاتمہ ہو گیا رافضیوں نے اہل سنت سے فوراً صلح کر کے یہ کلمات کہنے ترک کر دیئے۔

① البدایہ والنہایہ ج ١١ ص ٢٦٦.
② ایضاً ص ٢٧٠.
③ ج ١٢ ص ١١٩.

اور دنیا جانتی ہے کہ رافضیوں کی تو یہ خصوصیت رہی ہے جو متعدد تاریخی واقعات سے ثابت ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں کسی قسم کا اقتدار حاصل ہوگیا یا اپنے ہم عقیدہ امراء ووزرا اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کی پشت پناہی کا موقع مل گیا تقیہ کے خول سے نکل کر پَر پرزے نکالنے لگے۔ ورنہ بصورت دیگر مسلمانوں کے طریقے پر اعمال مذہبی تقیہ سے انجام دے لیتے۔ اور اسلامی اذان کہہ لیتے جب شیعہ بنی بویہ کے بعد خلیفہ عباسی کی جانب سے سلجوقی ترکوں کو جو عقیدتاً سنی تھے انتظام سپرد ہوا۔ بغداد کے رافضیوں نے نہ صرف حی علی خیر العمل کہنا ترک کردیا بلکہ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم بھی کہنا شروع کردیا۔

علامہ ابن کثیر ۴۴۸ھ کے کوائف کے ضمن میں بیان کرتے ہیں:

''وفیھا الزم الروافض بترک الاذان حی علی خیر العمل وامروا ان ینادی موذنھم فی اذان الصبح بعد حی علی الفلاح الصلوۃ خیر من النوم مرتین وازیل ما کان علی ابواب المساجد ومساجدھم من کتابۃ محمد وعلی خیر البشر ودخل المتشدون من باب البصرۃ الی باب الکرخ یتشدون بالقصائد التی فیھا مدح الصحابۃ وذٰلک ان نوء الرافضۃ اضمحل لان بنی بویہ کانوا احکاما وکانوا یقرونھم وینصرونھم فزالو وبادوا وذھبت دولتھم وجاء بعدھم قوم آخرون من الاتراک السلجوقیہ الذین یحبون اھل السنۃ''۔①

''اور اس سال اذان میں حی علی خیر العمل کہنا رافضی ترک کیے رہے۔ اپنے موذنوں کو یہ ہدایت بھی کردی کہ صبح کی اذانوں میں بعد حی

① ج ۱۲ ص ٦٩.

علی الفلاح کے الصلوٰۃ خیر من النوم دو مرتبہ کہیں ۔ اپنی مسجدوں اور دوسری مساجد کے دروازوں پر محمد وعلی خیر البشر کے جو کتبے لگائے گئے تھے وہ مٹا دیئے گئے ۔ رافضیوں کے محلہ کرخ میں باب بصرہ کی جانب سے لوگ مدح صحابہ کے قصائد پڑھتے ہوئے داخل ہوئے اور یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ رافضی اب دب گئے تھے زوران کا ٹوٹ گیا تھا کیونکہ بنی بویہ جو حکام تھے وہ رافضیوں کی مدد کرتے رہتے اوران کو تقویت دیتے تھے ان کا تیا پانچا اور ان کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا ان کے بعد جو دوسرے لوگ (امیر الامرا کے منصب پر) آئے وہ سلجوقی ترک تھے جو اہل سنت سے محبت کرنے والے تھے''۔

غرض یہ کہ تیسری صدی ہجری میں غالی فرقہ شیعہ نے اذان میں سب سے اول حی علی خیر العمل کہنا شروع کیا تھا جو بعد میں امامیہ اثنا عشریہ نے بھی اختیار کر لیا شیعہ امامیہ اثنا عشریہ کے مجتہد اعظم جو سند المحدثین وحامل لواء الشریعۃ وغیرہ سے ملقب ہیں یعنی ابن بابویہ القمی الصدوق متوفی ۳۸۱ھ نے اپنی مبسوط کتاب لایحضرہ الفقیہ کے باب الاذان میں دو شیعہ راویوں ابوبکر الحضرمی اورکلیب الاسدی کی یہ روایت درج کی ہے کہ

ہمیں ابی عبداللہ (جناب جعفر صادق رضی اللہ عنہ) نے یہی اذان بتائی کہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ (چار مرتبہ) پھر اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (دو مرتبہ) پھر اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ (دو مرتبہ) پھر حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ (دو دو مرتبہ) اس کے بعد دو مرتبہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اور آخر میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دو مرتبہ۔

اس کے بعد ابن بابویہ قمی لکھتے ہیں کہ

''اقامۃ بھی اسی طرح ہے اور مضائقہ نہیں اگر صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم تقیہ سے کہہ لیا جائے''۔

یہ کہنے کے بعد شیعہ اثنا عشری کے مجتہد اعظم و مستند محدثین لکھتے ہیں کہ

''**هذا هو الاذان الصحيح لا يزاد فيه ولا ينقص منه والمفوضة لعنهم الله قد وضعوا اخبارا وزاد في الاذان محمد وال محمد خير البرية مرتين وفي بعض رواياتهم بعد اشهد ان محمداً رسول الله اشهد ان علياً ولي الله مرتين ومنهم من روى بدل ذالک اشهد ان علياً امير المومنين حقاً مرتين ولا شک في ان علياً ولي الله وانه امير المومنين حقاً وان محمد واله خير البرية۔ ولكن ذلک ليس في اصل الاذان**''۔

''یہی ہے صحیح اذان جس میں نہ کچھ بڑھایا جا سکے اور نہ گھٹایا جا سکے اور فرقہ مفوضہ نے کہ اللہ کی لعنت ہو اس پر حدیثیں گھڑ لیں اور اذان میں بڑھا دیا یہ جملہ ''محمد ﷺ و آل محمد بہترین مخلوق ہیں''۔ دو مرتبہ۔

اور ان کی بعض روایتوں میں بعد اشهد ان محمداً رسول الله کے اشهد ان علياً ولي الله دو مرتبہ اور ان میں سے بعض اس جملہ کے بدلے کہتے ہیں: اشهد ان علياً امير المومنين حقاً اور بلاشک علی ولی اللہ ہیں اور امیر المومنین بھی اور محمد اور ان کی آل بہترین خلائق ہیں۔ لیکن اصل اذان کے یہ جملے ہرگز نہیں''۔

اس حقیقت کا اظہار کرنے کے بعد یہ سند المحدثین فرقہ امامیہ اثنا عشریہ فرماتے ہیں:

''**وذكرث ذالک ليعرف بهذه الزيادة المتهمون بالتفويض**

المدلسون انفسھم فی جملتنا'' ①

''اور میں نے یہ ذکر صرف اس لیے کیا ہے تاکہ وہ لوگ جو عقیدہ تفویض② سے متہم ہیں اور اپنے کو ہماری جماعت (فرقہ اثنا عشریہ) میں خواہ مخواہ شامل کرتے ہیں بخوبی جان لیں کہ (اذان میں یہ کلمات) اضافہ ہیں''۔

''شرح لمعہ'' میں بھی اضافہ کلمات اذان کو ناجائز بتایا ہے۔عبارت اس کی یہ ہے:

''ولا یجوز اعتقاد شریعه غیر هذا الفصول فی الاذان والاقامة کالتشهد بالولاية علی علیه السلام وان محمد واله خیر البرية وان کان الواقع کذالک فما کل واقع حقاً یجوز لا خاله فی العبادات الموعظة شرعاً المحدودة من الله تعالی فیکون بدعة وتشریعا کما لا زاد فی الصلوة رکعة او تشهد''۔

''اور یہ اعتقاد رکھنا جائز نہیں کہ ان کلمات (اصل اذان) کے سوا اور کلمات بھی اذان اور اقامت کے داخل کرنا مشروع ہیں جیسے کہ علی علیہ السلام کی ولایت کی گواہی اور اس بات کی گواہی کہ محمد اور ان کی آل تمام مخلوق میں بہترین ہیں اگرچہ حقیقت یہی ہے مگر ہر حقیقت ایسی نہیں ہوتی کہ عبادات میں ان کا داخل کرنا جائز ہو جو روزانہ کی مقرر ہیں اور ان کے حدود بھی

---

① ص ۸۷ مطبوعہ ۱۳۷۶ھ۔

② غالی رافضیوں میں مفوضہ یا تفویضہ وہ فرقہ تھا جس کا عقیدہ تھا کہ دنیا کو خلق کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے امور دنیا رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یا تنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دست اختیار میں دے دیئے تھے کہ جو چاہیں حلال کریں یا حرام۔ امامیہ اثنا عشریہ کے یہ مجتہد اعظم ان کو اپنے فرقے سے جدا بتاتے اور اضافہ کلمات اذان کے بارے میں ان پر لعن کرتے ہیں۔

اسلام کی طرف سے متعین ہیں پس ان حدود پر بڑھانا بدعت ہے اور اپنی طرف سے شریعت بنانا ہے جیسے نماز میں ایک رکعت یا تشہد بڑھایا جائے''۔

غرض یہ کہ امامیہ اثنا عشریہ کے مجتہدین اور ابن بابویہ سند المحدثین متوفی ۳۸۱ھ کی تصریحات سے روز روشن کی طرح ثابت وہویدا ہے کہ امامیہ اثنا عشریہ کے ہاں سوائے حی علی خیر العمل کے اضافے کے اور سب کلمات اذان کے وہی کہے جاتے تھے جو عہد رسالت سے موذن کہتے آئے ہیں۔''اشھدان علی ولی اللہ'' کہنے کا وجود تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایام خلافت میں بھی نہ تھا۔

ابن بابویہ قمی کے زمانے اواخر چوتھی صدی ہجری میں فرقہ مفوضہ نے جیسا اوپر بیان ہوا ان کلمات کو وضع کر کے اذان میں شامل کیا تھا مگر''وصی رسول اللہ وخلیفتہ بلافصل'' نہ فرقہ مفوضہ نے وضع کیے نہ اذانوں میں کہے ورنہ امامیہ اثنا عشریہ کے یہ مجتہد اعظم اپنی کتاب کی مندرجہ بالا عبارت میں ان کا بھی ذکر کرتے، کہنے والوں پر لعن کرتے اور فرماتے :ذالک لیس فی اصل الاذان۔

ابن بابویہ کے زمانے چوتھی صدی ہجری کے سوڈیڑھ سو برس بعد سے عراق وایران میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات ہوئے۔حکومتیں اور سلطنتیں تہہ وبالا ہوئیں لیکن امامیہ کی اذانوں میں یہ اضافی کلمات رائج نہ ہوئے تھے۔خلافت عباسیہ کے خاتمے کے تقریباً چارسو برس بعد ایران میں صفویوں① کی حکومت قائم ہوئی۔

صفویوں نے مفتوحہ ملک ایران کا نہ صرف سرکاری مذہب شیعیت قرار دیا بلکہ

① شیخ صفی الدین اردبیلی اپنے مورث اعلیٰ کی نسبت سے صفوی کہلائے بحر احرز کے علاقہ اناطولیہ کے قزلباش اور دوسرے جنگجو قبائل کے لوگ جو ترکی خلفاء سے منحرف تھے اور باوجود مسلمان کہلانے کے اپنے آبائی شامنی عقائد shaman iam سے مبرا نہ ہوسکے تھے یعنی بدروحوں کے نفع وضرر پہنچانے کی توہم پرستی میں مبتلا تھے۔

اولادعلی رضی اللہ عنہ میں اپنے کوداخل کرانے کی کوشش کی ۔ شاہ اسماعیل صفوی نے سادات مشہد پرزورڈالا انہیں مجبور کیا کہ شجر ہائے نسب اولادعلی رضی اللہ عنہ یعنی ''بحرالانساب'' میں اس کا شجرہ نسب بھی ملا دیں ایسے جابر وخونریز حکمراں کی فرمائش کی تعمیل میں اس کا سلسلہ نسب حسینی نسل کے ایک ایسے شخص سے ملا دیا گیا جس سے نسل نہیں چلی تھی ۔[1]

شاہ اسماعیل کوترکوں کے مقابلے کے لیے جوایران میں سنیوں کے قتل عام کا[2] بدلہ لینے کے لیے اس کے خلاف فوج کشی کر رہے تھے اس کی ضرورت تھی کہ آذربائجان کے علاقے کے جانبازوں سے جوعلوی خاندان کے عقیدت مند تھے فوجی امداد حاصل کرنے کی غرض سے اپنے کونسل علی رضی اللہ عنہ سے بتاتے ۔صفویوں کے زمانے سے شیعہ اذانوں میں ''اشھدان علی ولی اللہ'' کہنے کا رواج ہوا، سیاسی مصلحت کواگرچہ مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا مگر امامیہ اثنا عشریہ کے ہاں یہ مسئلہ پھر بھی مختلف فیہ رہا۔ زمانہ حال کے ایک شیعہ مجتہد محمد الخلاصی نے جوفرقہ امامیہ بغداد کے ممتاز مذہبی پیشوا تھے یہ تحریک اٹھائی کہ شیعہ اذانوں میں اب پھر سے وہ ہی کلمات کہے جائیں جوعہد رسالت میں کہے

---

[1] ص ۲۰۷ ہسٹوریز آف دی مڈل ایسٹ ۔

[2] شاہ اسماعیل صفوی نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے ایران کی آبادی کے سنی مذہب عنصر کا خاتمہ کرنا اس لیے اور بھی ضروری سمجھا کہ اس کے سیاسی حریف ترکی خلفاء سے یہ لوگ عقیدت رکھتے تھے عام اہل سنت والجماعت کے علاوہ سنی علماء وفضلا کے قتل پر ایرانی شعرا بھی اسے ابھارتے تھے ۔ پروفیسر براؤن نے ''ادبیات ایران'' میں حیرتی شاعر کی جو نظم درج کی ہے اس میں کہا گیا تھا:

درزمان چون تو شاہے دست بستن در نماز
ہست کارے دست بستہ اے شہ عالی تبار
قاضی ایں ملک نسل خالد بن ولید
مفتی ایں شہر فرزند سعید تابکار
قتل عامی گرنباشد قتل خاصی میتوان
خاصہ از بہر رضائے حضرت پروردگار

جاتے تھے اور ''اشھدان علی ولی اللہ'' کہنا ترک کیا جائے۔①

صفویوں کی ایران میں حکومت کے قیام کے زمانے میں جنوبی ہند میں بیجاپور وگول کنڈہ وغیرہ کی جو شیعہ ریاست بہمنی سلطنت ② کے زوال کے زمانے میں قائم ہوئیں ان میں وقتاً فوقتاً جو حکمران شیعیت میں غلو رکھتے تھے ان کے زمانوں میں ''اشھد ان علی ولی اللہ'' اذانوں میں کہا جاتا تھا۔

بیجاپور کے حکمراں علی شاہ اول نے تو چالیس شخص اس کام کے لیے ملازم رکھے تھے کہ مساجد میں بادشاہ کے حضور میں اور دربار میں خلفائے ثلاثہ پر تبرا بھیجا کریں۔ شاہان صفویہ نے ان ریاستوں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ترکی سلاطین سے بوجہ ان کے خادم حرمین شریفین اور خلیفۃ المسلمین ہونے کی بنا پر مسلمانانِ عالم کو عقیدت تھی صفویوں نے اس میں بھی ان کے مقابلے کی ٹھانی اور جنوبی ہند کی شیعہ ریاستوں کے خطبات میں بارہ اماموں کے ساتھ اپنے نام بھی پڑھوائے۔

---

① ص ۷۴۳ ہسٹو رنیز آف دی مڈل ایسٹ۔
② ۔۷۴۸ھ میں حسن گنگو بہمنی کو جسے ایران کے بادشاہ اسفند یار کی نسل میں بتایا جاتا ہے جنوبی ہند میں اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ گیارہ بارہ برس حکمرانی کی اس عرصہ میں ایرانیوں کی کافی تعداد کچھ تصوف کے بھیس میں اور کچھ سپاہیوں کی وضع میں وہاں جا پہنچی تھی سنی شیعہ کی زیادہ تفریق ومغایرت اس وقت نہ تھی حسن گنگو کے جانشین محمد شاہ اول نے گلبرکہ میں جو عالیشان مسجد تعمیر کرائی تھی اس کے محراب منبر پر تین کتبے نقش کرائے تھے جو اَب تک موجود ہیں سب سے اوپر ''اللہ محمد، علی، فاطمہ، حسن وحسین'' اس کے نیچے دائیں جانب ''ابوبکر عمر'' اور بائیں طرف ''عثمان علی'' پھر ان دونوں کتبوں کے نیچے دائیں طرف ''اللہ'' اور بائیں طرف ''اکبر'' اس طرح
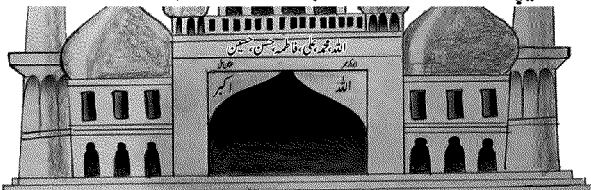
شہنشاہِ اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ نے ۱۰۸۰ھ میں ان دکنی ریاستوں کا خاتمہ کر کے ان کے علاقے مغل سلطنت میں شامل کر لئے اس وقت سے تبرا بازی اور اذانوں کے یہ کلمات کہنے موقوف ہوئے۔ لیکن بیس بائیس سال بعد جب بادشاہ موصوف کی وفات ہوگئی ان کے بڑے بیٹے معظم جو مسلکاً شیعہ تھے ۱۱۱۹ء میں بہادر شاہ اول کے لقب سے تخت نشین ہوئے اپنے جلوس کے دوسرے تیسرے سال ہی خطبات جمعہ اور اذانوں میں ''علی ولی اللہ وصی رسول اللہ'' کہے جانے کا حکم دے دیا۔

راسخ العقیدہ مسلمانوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ کا ''وصی'' کہلوانے پر اس درجہ اشتعال پیدا ہوا کہ لاہور کی جامع مسجد کے خطیب کے منہ سے یہ لفظ ادا ہوتے ہی اسے قتل کر دیا گیا۔① ایسے ہی واقعات احمد آباد گجرات اور آگرے میں بھی پیش آئے۔ بادشاہ نے مخالفت کو سختی سے دبانا چاہا بعض سنی علماء کو گرفتار کرا کے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا گیا مگر مخالفت کا طوفان بڑھتا گیا اور اتنا بڑھا کہ بادشاہ کو مجبوراً اپنا حکم واپس لینا پڑا۔②

یہ واقعات ۱۱۲۴ھ کے تھے اس کے چند سال بعد ہی جیسا گذشتہ اوراق میں تفصیلاً بیان ہوا نواب برہان الملک کی صوبیداری اودھ کے نتیجے میں نوابان اودھ کی جو مسلکاً شیعہ تھے، ریاست قائم ہوئی اس کے قائم ہونے کے کوئی پچاس برس بعد شیعہ مجتہد مولوی دلدار علی نصیر آبادی نے ۱۲۰۰ھ میں بعہد نواب آصف الدولہ شیعوں کی نماز جمعہ جماعت کا شمالی ہند میں آغاز لکھنؤ سے کیا اور اذان میں ''اشھد ان علی ولی اللہ ووصی رسول اللہ وخلیفتہ بلا فصل'' کے ممنوعہ کلمات پھر کہلوائے۔

① سیر المتاخرین ج ۲ ص ۳۸۱۔
② شیعیان ہند ۱۳۹۔

لکھنؤ کے مسلمانوں میں جنہیں مجتہد مذکور نے اپنی تحریر میں جو پہلے نقل ہو چکی ہے ''اہل طغیان واعتساف'' اور ''مخالفین بدکردار'' کہا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''وصی رسول اللہ اور خلیفتہ بلا فصل'' کہنے بالفاظ دیگر حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کو غاصب خلافت قرار دے کر ان کلموں کو برملا کہنے سے سخت ہیجان پیدا ہوا، صورت فساد کی پیدا ہوئی، انگریز ریزیڈنٹ متعینہ لکھنؤ نے فتنہ وفساد کو روکنے اور مسلمانانِ لکھنؤ کی غالب اکثریت کے مذہبی جذبات کے احترام کے لحاظ سے نواب آصف الدولہ پر زور ڈال کر ''وصی رسول اللہ وخلیفتہ بلا فصل'' الفاظ بالاعلان کہنے کی ممانعت کرا دی، نوابی زمانے کے آخر تک۔

پھر اس کے تھوڑے دنوں بعد انگریزی حکومت کے زمانے میں یہ الفاظ اذانوں میں کہنا ممنوع رہے ''اشھد ان علی ولی اللہ'' البتہ کہے جاتے تھے۔ کتاب شیعیان ہند کے انگریز مولف کا عرصہ تک قیام لکھنؤ میں رہا اکابر شیعہ خصوصاً مجتہد شمس العلماء نجم الحسن سے ان کی راہ ورسم یہی تھی انہوں نے اپنی کتاب میں شیعہ اذان کے یہی الفاظ لکھے ہیں یعنی ''وصی رسول اللہ وخلیفتہ بلا فصل'' کے الفاظ نہیں لکھے۔ [1] کیونکہ وہ ممنوع ہونے کی وجہ سے اذانوں میں نہیں کہے جاتے تھے۔

---

[1] ص ۴۹۔

عہد آصفیہ کی مذموم بدعتیں

عید باباشجاع:

حضرت فاروق اعظم خلیفہ دوم کے مجوسی قاتل ابولوءلوء کو ایرانی شیعوں نے ''باباشجاع الدین'' کے لقب سے اس لیے ملقب کیا تھا کہ آپ ہی کے عہد مبارک میں یہ ملک فتح ہو کر آتش کدہ مجوسیت وہاں ہمیشہ کے لیے بجھا دیا گیا تھا۔حضرت موصوف پر مسجد نبوی میں قاتلانہ حملہ تو ۲۶ ذوالحجہ ۲۳ھ میں ہوا تھا۔تین دن بعد وفات ہو کر یکم محرم ۲۴ھ میں رسول اللہ ﷺ کے روضہ مقدسہ میں اور آپ کے پہلو میں تدفین ہوئی تھی۔مگر ۲۴ صفر کو آپ کے مقتول ہونے کی عید منائی جاتی ہے اور اس عید کو یوم عید الاکبر، یوم مفاخرہ اور یوم برکت قرار دیا گیا ہے۔

شیعیان ہند کے مولف نے شیعہ تہواروں کی فہرست میں اس شیعہ عید کا نام ''عید عمر'' لکھا ہے اور کہا ہے کہ

''یہ دن شیعیان ہند میں خوشیاں منانے کا دن ہے''۔①

ملا باقر مجلسی نے اپنی ایک تالیف زادالمعاد میں طول طویل روایت سے جو حد درجہ لغو و مہمل ہے کئی صفحے سیاہ کیے ہیں جسے نواب محسن الملک رحمہ اللہ نے کتاب ''آیات بینات'' کے چار صفحوں پر نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ صحابی سے یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ نویں ربیع

---

① ص۱۹۱.

الاول کو آنحضرت ﷺ کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے دونوں صاحبزادے حسن وحسین کھانا نوش کر رہے تھے۔ حضرت نہایت خوش تھے نواسوں سے فرمارہے تھے:

''کھاؤ بیٹا کھاؤ یہ کھانا تم کو مبارک ہو کہ آج کا دن وہ ہے جس میں خدا اپنے دشمن کو اور تمہارے جد کے دشمن کو ہلاک کرے گا اور تمہاری مادر مشفقہ کی دعا قبول کرے گا۔ کھاؤ بیٹا کھاؤ! آج کی تاریخ خدا میرے اہل بیت کے فرعون کو ہلاک کرے گا''۔

حضرت نے فرمایا:

''خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس روز کو فضیلت دے''۔

خدا نے دعا آپ کی قبول کی اور کہا کہ

''میں نے ملائکہ ہفت آسمان کو حکم دیا ہے کہ اس دن کو جس دن وہ مارا جائے شیعوں محبوں کے لیے عید کرے اور تمام شیعوں کی مغفرت کی دعا کریں''۔

میں نے تمام فرشتوں کو یہ بھی حکم دے دیا ہے کہ

''اس تاریخ سے تین دن تک قلم آدمیوں سے اٹھالیں۔ کوئی شخص کچھ گناہ کیوں نہ کرے اس کو نہ لکھیں''۔

''دہر سال دریں روز ہزار ہزار کس از موالیان وشیعیان شمارا از آتش جہنم آزاد گردانم واعمال ایشان را قبول کنم وگناہان ایشاں را بیازرم''

نواب محسن الملک سید مہدی علی خان جنہوں نے آبائی مذہب شیعہ ترک کر کے مسلک حق اہل سنت والجماعت اختیار کر لیا تھا اس ناپاک روایت پر ریمارک کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بھلا کون شخص اس بات کو مانے گا کہ جس شخص (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کے ایمان لانے کے لیے خود ہی حضرت (رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعا کی ہو اور جس کے لیے بروایت امام باقر اللھم اعز بعمر بن الخطاب (اے اللہ عمر بن خطاب کے ایمان لانے سے اسلام کو قوت دے) کہا ہو اور جس کے حق میں خدائے حضرت کی دعا قبول کی ہو اور جس نے مسلمان ہوتے ہی جھنڈا اسلام کا کعبے میں گاڑ دیا ہو اور جس نے اسلام لاتے ہی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبے چلنے پر مستعد کیا ہو اور جس نے تمام عمر اپنی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اطاعت اور فرمانبرداری میں اور اپنی ساری زندگی اسلام کے پھیلانے میں صرف کر دی ہو اور جس نے دنیا کی کسی قسم کی لذت نہ اٹھائی اور جس نے خدا کی راہ میں جان دے دی ہو اس سے پیغمبر صاحب اس قدر رنجیدہ ہوں کہ اس کے مرنے ① پر اس قدر خوشی کریں کہ اس کے مرنے کو عید الفطر اور عید الاضحیٰ اور عید غدیر سے بھی بڑھ کر افضل جانیں''۔

اور خدا اس کے مرنے سے اس قدر خوش ہووے کہ تین دن تک گناہوں کے لکھنے سے قلم اٹھائے اور شیعوں کو اجازت دے دے کہ اس تین دن کے عرصے میں چاہیں زنا کریں چاہیں شراب نوش فرماویں، چاہیں مسجدیں ڈھاویں چاہیں قرآن جلاویں، جو دل چاہے کریں، نہ کوئی پوچھنے والا ہے، نہ بتلانے والا، کراما کاتبین موقوف، لکھنا پڑھنا بند، پس ایسی حالت میں اپنی خواہشیں پوری نہ کریں تو کب کریں۔

''خدا کے لیے انصاف کرو اور اس عقل کے دشمن، ایمان کے عدو فرقے کو

① واضح رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بتیس برس بعد آپ کے ان مرادی صحابی حضرت فاروق اعظم سلام اللہ علیہ کی وفات ہوئی تھی۔

دیکھو کس قدر شیطان نے بہکایا ہے اور اسلام کی راہ سے کس قدر دور کر دیا ہے سبحان اللہ! کیا دین اور کیا مذہب ہے کہ بے چارے نمازی برسوں نمازیں پڑھتے پڑھتے مریں، روزے رکھنے والے تیس دن تک گرمیوں کے دنوں میں بھوکے رہیں پیاس کی تکلیف اٹھاویں، حاجی ہزاروں منزل سے مصیبت راہ کی طے کر کے کعبے پہنچیں اور حج کریں تب اجر کے مستحق ٹھہریں اور شیعہ بھائی گھر بیٹھے زنا کریں، شرابیں پئیں اور ربیع الاول کی نوویں تاریخ کو اپنے بابا شجاع کے نام پر حلوے کھاویں اور لعنتی کھانا نوش کریں اور سب سے زیادہ ثواب پاویں''۔

شمالی ہند میں عہد آصفیہ سے عید بابا شجاع کی خوشیاں منانے کی تقریبیں شروع ہوئیں پھر تو گناہوں کی باز پرس سے بے خوف وخطر ہو کر جن حیا سوز و بے ہودہ حرکات کے انوکھے طور طریقے لکھنؤ میں ایجاد ہو کر بیرون جات میں پھیلے اور حضرت عمر سلام اللہ علیہ کے پتلے بنا کر جو شرمناک اور رکیک حرکتیں کرنے کی داغ بیل ڈالی گئی اس کا بیان مقصود نہیں۔

شیعہ نوابوں کے درباروں نے ہر عیب کہ سلطان بہ پسندو ہنر است عمر دشمنی میں توہین وتضحیک کی بھی انوکھی ترکیبیں ایجاد کیں۔ کتاب ''مذاہب الاسلام'' کے مولف کا بیان ہے کہ

''ریاست اودھ جب تک قائم رہی علانیہ تشیع میں بڑا غلو رہا اس کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ میر حیدر بخش نائب آفرین علی خاں نے صحابہ (خلفائے ثلاثہ) کے نام لکھ کر فرش تلے بچھوا دیئے تاکہ پائمال ہوں لکھنؤ کی کربلا تال کٹورہ میں اب تک یہ بات موجود ہے''۔

آصف الدولہ کے زمانے سے لکھنؤ وغیرہ میں دشنام دہی و بدگوئی وتبرا کی جس نہج سے ابتدا ہوئی ان کے جانشینوں نے نہ صرف جاری رکھا بلکہ بذات خود بھی تقریراً وتحریراً حصہ لیا۔

مولف مذاہب الاسلام مزید کہتے ہیں:

''امجد علی ثریا جاہ کو مذہب اثنا عشریہ میں نہایت غلو تھا۔ ان کے عہد میں مذہب شیعہ نے خوب رونق پائی تھی۔سنت جماعت کا شمار ہنود میں تھا۔①

اودھ کے پچھلے بادشاہ واجد علی شاہ نے اپنی ایک تالیف کے صفحہ ۲۰۴ میں جس کا نام ''مجموعہ واجدیہ'' ہے لکھا:

''اسامی ملعونان وملعونات کہ تا قیامت برآنہا لعنت باید کرد''

اوراس کے بعد تین صفحے اصحاب کبار وغیرہ کے ناموں سے بھر دیئے ہیں جن میں حضرت ابوبکر،حضرت عمر،حضرت عثمان ،بی بی عائشہ وغیرہ شامل ہیں۔②

کتاب ''شیعان ہند'' کے مولف مسٹر ہالسٹر ایم اے پی ایچ ڈی جو لکھنؤ سے کما حقہ خاصیت رکھتے تھے لکھتے ہیں کہ

''پہلے تینوں خلفاء (ابوبکر،عمر،عثمان رضی اللہ عنہم) سے شیعہ اپنی نفرت اورعناد کا اظہار جن واہی طریقوں سے کرتے ہیں موجب تعجب کا ہے''

پھراس کے چند نمونے یوں درج کرتے ہیں:

(۱)''معرفت امام'' نام کتابچے کے مولف نے پہلے دونوں خلیفوں کے نام تحقیر وتوہین کی غرض الٹے لکھے ہیں (گویا اس طرح ﺮﮑﺑﻮﺑﺍ ﺮﻤﻋ)

① طلسم ہند۔

② ص ۴۰۷ مولفہ نجم الغنی خان مطبوعہ ۱۹۱۳ء۔

(۲) عمر کی شہادت کے دن لعنت کے حسب ذیل الفاظ کا سو مرتبہ تسبیح کے دانوں پر فریضہ مذہبی کے طور سے ورد کرنا شیعوں کے عقیدے میں ان کی مشکل کشائی کا موجب ہے یعنی :

''لعنت ہوا ابوبکر وعمر پر پھر عمر پر پھر عمر پر پھر عمر پر''

(۳) پہلے تینوں خلفاء (ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم) کے نام پائخانے کی دیواروں قدمچوں یا جوتوں کے تلووں پر لکھ لیتے ہیں۔

آصف الدولہ کے زمانے سے نصف صدی کی مدت ہی میں اودھ کی شیعہ سلطنت کا خاتمہ ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ کے جبراً تخت سلطنت چھوڑ دینے سے ہوگیا اور دوسرے ہی سال ۱۸۵۷ء کے غدر کے جو مصائب اودھ سے دہلی تک کے باشندوں کو جن میں شیعہ سنی سب فرقوں کے لوگ شامل تھے بھگتنا پڑے قیامت کا نمونہ تھے۔

بایں ہمہ عید بابا شجاع کی خوشیوں کی لایعنی رسموں اور بزرگان دین کی بدگوئی دوشنام دہی سے جو زہریلی فضا پیدا ہوگئی تھی ریاست کے خاتمے اور ۱۸۵۷ء کی تباہ کاریوں کے باوجود تنگ دل وتنگ نظر افراد کے غلو وتعصب کی وجہ سے قائم رہی ہر سال عید بابا شجاع کے مراسم کی تجدید کرتے رہے جس کے نتیجے میں ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۸ء کے دوران سنی شیعہ فسادات ہوتے رہے جو ۱۹۳۵ء میں پھر ابھرے اس وقت سے مدح صحابہ وتبرے میں فریقین نے ایسی قوت آزمائی کہ ۱۹۴۵ء تک ہزاروں سنی شیعہ ان اقدامات میں جیل بھی گئے تقسیم ملک کے زمانے تک اس کے اثرات بدقومی یک جہتی کے لیے ستم قاتل بنے رہے۔

تعزیہ داری:

شمالی ہند میں تعزیہ سازی اور محرم کے جلوس میں ان کے گشت کرانے کی ابتداء بھی آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ سے شروع ہوئی۔

''مجاہد اعظم'' کے شیعہ مولف ہی فرماتے ہیں:

''تعزیہ جس طرح ہندوستان میں ہوتے ہیں کہیں بھی نہیں ہوتے یہاں تک کہ ایران جو شیعوں کا خاص گھر ہے وہاں بھی اس کا رواج نہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ہر جگہ تعزیے بنائے جاتے ہیں کچھ شیعوں پر ہی منحصر نہیں ہے کہ سنی بھی اور سنی ہی کیا ہندو بھی اس رسم میں شریک ہیں آخر اس کی ابتداء کب سے ہوئی اور کس نے کی اور کیوں ہوئی۔ افسوس ہے کہ اس سوال کے جواب میں تاریخ خاموش ہے''۔①

''گنبد دار تعزیہ کا رواج غالباً لکھنؤ سے شروع ہوا۔ بعض سن رسیدہ لوگوں سے سنا گیا ہے کہ آغاز زمانہ نواب آصف الدولہ بہادر میں اول ایک سبزی فروش نے بانس اور کاغذ کا تعزیہ بنایا تھا جب وہ سبزی فروش مر گیا تو وہاں میر باقر نے ایک امام باڑہ بنوا دیا اس کے بعد ویسے ہی تعزیوں کا رواج ہوا۔ رفتہ رفتہ اراکین خاندان سالار جنگ نے گنبد دار تعزیوں کو رواج دیا اور لطافت و زینت روز بروز بڑھتی گئی شدہ شدہ تمام ہندوستان میں اس کا عام رواج ہو گیا''۔②

شیعہ سلطنت کے دار الحکومت لکھنؤ کے علاوہ اودھ کے قصبات میں بھی رفتہ رفتہ عمال حکومت اور شیعہ امراء کی سرپرستی سے امام باڑے اور تعزیے بننے لگے۔

① ص ۳۳۳ ② ص ۳۳۶.

''تاریخ خطہ پاک بلگرام'' کے مولف نے اس قصبہ میں محرم کے تعزیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''مشہور تعزیوں میں بیٹوں کا تعزیہ، کنجڑوں کا تعزیہ، کرم میاں پیرزادہ کا تعزیہ، رسول بخش کا تعزیہ، حیدری پنجہ بند کے تعزیئے اس کے بعد قصابوں، گاؤ قصابوں، خیاطوں، معماران، جوگیان، نوربافاں، گاذران کے تعزیئے امام باڑے میں آکر شریک گشت ہوتے تھے۔ اہل ہنود کے یہ لوگ بناتے اور شریک عزاداری ہوتے تھے۔ ایشری ساہ ''بقال، ہیرا لال بھرجی، سوہن بقال، گوکل تنبولی، لچھمن بقال، سوہن نجار''۔

تقریباً یہی کیفیت اودھ کے علاوہ روہیل کھنڈ وغیرہ کے شہروں وقصبات کی تھی کہ نیچے طبقے کے لوگ اور پیشہ ور نائی، قصائی، تیلی، تنبولی، دھنے، جلاہے، دھوبی، سقے، کنجڑے اور دوسرے پیشہ ور جو اکثر شیعہ جاگیرداروں زمینداروں کی رعایا ہوتے تھے تعزیئے بناتے اور صوفی جو پیری مریدی کے پردے میں شیعیت ہی کے مبلغ تھے اپنے مریدوں سے تعزیئے بنواتے اور گشت کراتے تھے۔تعزیئے تو معزوالدولہ نے بھی نہ بنوائے نہ گشت کرائے۔ حالانکہ ماتم حسین منانے کی ابتداء واقعہ کربلا کے تین سو برس بعد اسی نے اپنے زمانہ امیر الامرائی میں بغداد میں کی تھی تعزیئے سازی وگشت کرائی کی ابتداء لکھنؤ سے ہوئی۔

شاعری ومرثیہ گوئی:

مغلیہ سلطنت کے دم توڑنے کے زمانہ میں اردو شعراء کا ملجا وماویٰ اودھ کی ریاست ہی تھی۔ مرزا رفیع سودا تو چند سال پہلے شجاع الدولہ کے وقت میں دلی سے

اودھ چلے آئے تھے۔ میر تقی میر ۱۱۹۷ھ میں بعہد آصف الدولہ دلی چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے نیز بعض دیگر دہلوی شعراء بھی آ پہنچے۔ یوں اردو شاعری کا مرکز ثقل دلی سے لکھنؤ منتقل ہوا یہاں کے ماحول نے اس کے رنگ و آہنگ کو یکسر بدل دیا۔ لکھنؤ کی معاشرت شیعہ حکمرانوں اور شیعی عقائد اور مراسم کی وجہ سے دہلی کی معاشرت سے قطعاً جداگانہ تھی اس کا اثر لکھنؤ کی شاعری پر شدت سے پڑا اور ایک الگ مکتب شاعری وجود میں آیا جس کے موضوعات بدلے ہوئے ماحول کی وجہ سے دبستان دہلی سے مختلف تھے۔

دہلی میں صوفیانہ خیالات کی گرم بازاری تھی وہاں کے شعراء نے زندگی کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا تھا ان کی شاعری قنوطیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی قناعت وصبر وتوکل تسلیم ورضا اور دنیا سے بے زاری دہلوی شاعری کے جسد کے عناصر تھے۔ لکھنؤ سوسائٹی نے تصوف سے دامن چھڑا لیا تو قنوطیت کی گرد کو بھی دامن سے جھٹک دیا اس کی جگہ فلسفہ رجائیت کو اپنایا۔ عیش کوشی نفسانیت، سرمتی اور کامجوئی کے جذبات نے اپنا رنگ گہرا کیا یہی باتیں لکھنوی شاعری کا جزو لاینفک بنتی گئیں۔

دلی میں حسن مستور تھا لکھنؤ میں بے پردہ ہوگیا، دلی میں داخلی عنصر نمایاں تھا لکھنؤ میں خارجی لوازمات نے جگہ پائی۔ دہلی میں محبوب کے لیے تذکیر کے صیغے اور صفات مستعمل تھے جس کی وجہ سے اس میں آفاقیت تھی لکھنؤ میں متعہ کے عام رواج وجنسی آوارگی نے شاعروں کے محبوب کو صنف نازک بنا دیا اور اس کے خارجی لوازماتِ حسن یعنی کنگھی چوٹی، سرمہ مستی اور خال وابرو کی تعریف مستقل موضوع شاعری بن گئی اس طرح شاعری اپنے بلند مرتبے سے گر کر انگیا چوٹی میں پھنس گئی۔ نہ عشق کی عظمت قائم رہی نہ حسن کی لطافت۔ لکھنوی شعراء کا بیشتر سرمایہ سخن بوالہوسی اور کامجوئی کا ایک مرقعہ ہے جو ساز قلب کے لطیف تاروں کو مرتعش کرنے کے بجائے نفسانی

خواہشات کو ہوا دیتا اور ابھارتا ہے۔

دہلوی شعراء مقیم لکھنؤ کے علاوہ بعض لکھنوی شعراء کے یہاں بھی لفظی رعایتوں پیچیدہ تشبیہوں کے باوجود اچھے اشعار کی کمی نہیں لیکن کلام کی زیادہ نوعیت ان ہی سرخرافات کی ہے۔ بطور مشتے نمونہ از خروارے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ امام بخش ناسخ جن کے مجموعہ کلام میں اچھے اشعار بھی ہیں، فرماتے ہیں:

دمکتا ہے جو کندن سا بدن ہر ایک حلقہ سے
تری جالی کی کرتی میں ہے عالم کامدانی کا
اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا
آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھ کو
اڑ نہیں سکتی تری انگیا کی چڑیا اے پری
جالی کی کرتی کا اس پر اے پری روجاں ہے

برقؔ کی چکا چوند ملاحظہ ہو:

اودی کرتی، لال چکن اور اسپہ سنہری گوٹ لگی
ابر سے نکلا چاند کا مکھڑا برق کے دل پر چوٹ لگی

اب حکیم مسیحا کی مسیحائی بھی دیکھئے:

ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آ گئی
آج ہم عنقا کو لائے دام میں

یہ تو ریختہ کا نمونہ تھا ریختی کی خرافات کا کیا بیان ہو۔ بعض لکھنؤ شعراء نے اس خرافات میں بھی اپنی بہترین صلاحیتیں ضائع کیں۔

قصیدے کی دنیا میں انقلاب آیا۔ منقبت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر دیگر ائمہ اثنا عشریہ

کی مدح میں قصیدے کہنے کا رواج ہوا۔

مرثیہ وسلام کی یوں تو ابتداء دکن کی شیعہ حکومتوں میں بہت پہلے ہو چکی تھی کچھ ناقص نمونے ان کے دہلی میں بھی پیش کیے گئے مگر وہاں شیعیت کا غلبہ واستیلا نہ تھا مرثیہ گو کو ''بگڑا شاعر'' اور مرثیہ خواں کو ''بگڑا گویّا'' کہا جاتا تھا لکھنؤ کی فضا پر شیعیت کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی مرثیہ گوئی کو نشو ونما پانے اور پوری طرح ترقی کرنے کا موقع ملا، مسدس کو ذریعہ اظہار بنایا گیا، روایتیں نقل کرنے کی ابتداء ہوئی۔

ضمیرؔ کے شاگرد دبیرؔ نے، خلیقؔ کے فرزند اور شاگرد انیسؔ نے مرثیہ کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ اور اتنی ترقی دی کہ اس کے آگے جانا کسی کے لیے ممکن نہ رہا۔ انہوں نے ایک طرف تو اپنی قادر کلامی کے جوہر دکھانے اور تنوع پیدا کرنے نیز رونے رلانے کو اثر وتاثر پیدا کرنے کی غرض سے تاریخ ووقائع نگاری سے قطعاً بے نیاز ہو کر بے شمار قصے اور روایتیں وضع کر کے مراثی میں داخل کر لیں۔ اس کا اعتراف خود انیسؔ نے کسی معترض کا جواب یہ کہہ کر کیا تھا:

''جو صاحب معترض ہیں وہ دس بندھی ایسے کہہ کر سنادیں جنہیں صحیح روایات سے مطلق تجاوز نہ ہو اور پھر بھی کلام موثر ومبکی ہو''۔[1]

گویا کربلا کے من گھڑت قصے اور وضعی روایتیں مرثیوں میں بیان کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ گریہ وبکا سے مرثیہ کامیاب سمجھا جائے۔

دوسری طرف ان لکھنوی مرثیہ گوشعراء نے اپنے مرثیوں میں بیگماتی معاشرت کو پوری طرح سمو دیا۔ حسینی گھرانے کی غیرت مند وعالی ظرف ہاشمیہ وعربیہ خواتین کے وقار وثبات، صبر واستقامت، غیرت وحمیت کو بھارت کی دکھیاری ہندی عورت کے

[1] یادگار انیسؔ۔

بین ونوحہ وواویلا کا رنگ دے ڈالا اور قوت متخیّلہ کی جولانیاں دکھانے کے لیے کربلا کے من گھڑت حالات دل ودماغ سے تراش کر مرثیوں میں اس چابک دستی سے بھر دیئے کہ یہ وضعی روایتیں تاریخ کے مسلمات سمجھی جانے لگیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں صرف دو بیٹیاں فاطمہ وسکینہ نام تھیں مرثیہ گویوں اور ذاکروں نے ایک تیسری بیٹی فاطمہ صغریٰ نام قرار دے کر یہ جھوٹا قصہ گھڑ ڈالا کہ مدینے سے روانگی کے وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس تیسری بیٹی کو بیماری کی وجہ سے اپنی نانی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس چھوڑ گئے تھے حالانکہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا تو ایک سال پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں اور اس تیسری بیٹی کا بھی کوئی وجود نہ تھا مگر اس وضعی قصہ کو بقول شیعہ مولف ''مجاہد اعظم'' نظماً ونثراً درد انگیز ورقت خیز پیرایہ میں بڑے شدومد کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ روایت بالکل غلط وبے بنیاد ہے۔①

اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سیدہ سکینہ کو جو حادثہ کربلا کے وقت بالغہ اور شادی شدہ تھیں، چار پانچ برس کی بچی قرار دے کر بیان کیا جاتا ہے کہ دمشق کے قید خانے میں مرگئیں حالانکہ وہ واقعہ کربلا کے بعد ۵۶ برس تک زندہ رہ کر ۱۱۷ھ میں فوت ہوئیں شوہر ان کے یکے بعد دیگرے مرتے گئے اس لیے متعدد نکاح کیے تھے جن میں سے تین امیر یزید رحمہ اللہ ہی کے خاندان بنی امیہ میں کیے تھے جو بین ثبوت ہے کہ واقعات کربلا کی وہ نوعیت نہ تھی جو شہادت ناموں اور مرثیوں میں بیان ہوتی ہے۔

''مجاہد اعظم'' کے شیعہ مولف ہی نے کربلا کے پچیس ایسے واقعات کی جو بہت مشہور ہیں اور شیعوں کے علاوہ پیشہ ور سنی خطیب کی زبان سے بھی بیان ہوتے ہیں اور مرثیوں میں درد انگیز طریقے سے دہرائے جاتے ہیں پر زور تردیدیں کر دی ہیں۔

---

① ص ۱۹۴.

غرض ومقصد اِن جھوٹے قصوں کے مرثیوں میں بیان کرنا محض گریہ وبکا اور رونا رلانا تھا۔ اور ظلم وستم کے فرضی قصوں کے بیان سے خلیفہ وقت کو بدنام کرنا تھا۔

مرثیہ گوئی کے علاوہ مرثیہ خوانی بھی لکھنؤ کے شیعہ حکمرانوں کی سرپرستی میں ایجاد ہوئی اور یہ دونوں فن مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی جلب منفعت کا بڑا ذریعہ تھے۔ آواز کے نشیب وفراز، اوضاع واطوار کے تغیرات سے بیان میں اثر پیدا کرنے، مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے اور خط وخال کے اشارات سے گفتگو کو موثر کرنے کے اس فن کو لکھنؤ نے اوجِ کمال پر پہنچا دیا۔

تحت اللفظ خوانی، روضہ خوانی، حدیث خوانی، اور سوز خوانی رفتہ رفتہ مستقل فن بن گئے۔ سوز خوانی تو مودودی گھرانے کے خواجہ حسن مودودی نے جو نغمات الآصفیہ کے استاد تھے بطور فن کے ایجاد کی تھی۔ موسیقی کے شمول سے مرثیہ خوانی وسوز خوانی کو وہ مقبولیت ہوئی کہ صنف نازک نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

بادشاہ بیگم اودھ کے یہاں تو کتنی ہی عورتیں اس کام پر مقرر تھیں ویسے سارے شہر میں گھر گھر روزانہ زنانی مجلسیں ہوتی تھیں اور طوائفوں اور خانگیوں کے یہاں کی مجلسوں میں جو اکثر وبیشتر مسلکاً شیعہ، موسیقی میں مہارت رکھتی تھیں بڑا اژدہام رہتا تھا۔ سیاہ لباس، حسین چہرے، کھلتے رنگ، بال پریشان، سہانا وقت، سریلی آوازیں، رقت خیز مضامین کی ادائیگی میں آواز کا اتار چڑھاؤ، اوضاع واطوار کے دلکش تغیرات یہ سب مل کر ایسا سماں باندھتے کہ مولانا شرری نے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا ہے کہ

''وضعی داستان کی حقیقت سے واقف ہو کر بھی وہ کس درجہ متاثر ہوتے تھے۔ مرثیہ خوانی وسوز خوانی فروغ شیعیت ہی میں نہیں بلکہ کربلا کی وضعی داستانوں کی نشر واشاعت میں بھی بہت موثر ثابت ہوئے''۔

جس طرح بعض شاعر غزل کہتے کہتے ہزل کی جانب مائل ہو گئے لکھنؤ کے کچھ شاعروں نے مرثیہ کے مقابلے میں ہرثیہ یا ہرسیہ ایجاد کر ڈالا۔

مرزا دبیرؔ ہی کے ایک شاگرد مشیرؔ کو ہرثیہ گوئی کی شریعت کا پیغمبر کہا جاتا ہے۔ رعایت لفظی و ضلع جگت سے اپنے اشعار میں کیا لغو بیانی کی ہے پڑھیے:

''وہ بولی صدقے جاؤں مصیبت سنو مری
مستی تلک نہ دی مجھے لوٹا دھڑی دھڑی
گہنا تمام لے گیا ملبوس لے گیا
ہاتھوں کی چوہے دتیاں تک موس لے گیا
نتھ ناک سے اتار لی منہ کیل کر مرا
اور چھکا دینے کو سونے کا تعویذ بھی لیا
لے بھاگا ڈھونڈ نا مرا قرآن کی قسم
انگشتری چرائی، سلیمان کی قسم
کیا کیا میں تڑپی مچھلیوں کے واسطے میاں
بالا بتا کے لے گیا بچپن کی بالیاں
سب چیز بست باندھ کے بستے میں لے گیا
موتی کے جھالے پانی برستے میں لے گیا''

جنسی آوارگی اور معاشرہ کا بگاڑ:

نواب شجاع الدولہ کی غیر معمولی رغبت صحبت نسواں کا مجمل حال تو ابتدائی اوراق میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ان کی زوجہ اولیٰ والدہ آصف الدولہ ہی کی ایک تحریر میں جو اپنے نافرمان بیٹے کو فہمائشاً بھیجی تھی ضمناً اس کا بھی ذکر ہے کہ شجاع الدولہ کی محل

سرائے چند ہزار ممتوعہ وغیر ممتوعہ عورتیں جمع تھیں۔①

ان کے فرزند آصف الدولہ کو عورتوں سے مطلق شوق نہ تھا مورخین کا بیان ہے کہ

''ان میں قوت مردمی کا فقدان تھا کوئی صلبی اولاد بھی ان کے نہ تھی بایں ہمہ پانچ سوخوبصورت عورتوں کو انہوں نے بھی محل سرائے میں جمع کر رکھا تھا''۔

ان کے جانشینوں میں غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کی عیاشی کا مجمل حال اس کتاب کے مندرجہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کا کریکٹر تو جنسی آوارگی میں سب سے زیادہ تاریک اور ناپاک تھا جس کی شرمناک داستانیں ان کی نظموں اور تصنیفوں میں خود ان ہی کی زبان سے سن لی جاسکتی ہیں۔

مولانا شرر کا بیان ہے کہ

''واجد علی شاہ کو مذہبی احتیاط کا پورا لحاظ رہتا، بادشاہ شیعہ تھے اور شیعوں کی شرح میں متعہ بغیر کسی تحدید اور روک کے جائز ہے۔اس مذہبی آزادی سے فائدہ اٹھا کر بادشاہ جی بھر کر اپنا شوق پورا کر لیتے ،سینکڑوں ممتوعہ عورتیں تھیں ، ان ممتوعات میں جو صاحب اولاد ہو جاتیں ان کو محل کا خطاب دیا جاتا تھا''۔بہشتن طرح دار متعہ میں آئی ''نواب آب رسا بیگم'' کہلائی۔ خاکروبن سے متعہ کیا ''نواب مصفا بیگم'' کا خطاب پایا②۔

شیعہ مذہب میں متعہ کا جواز ضرور ہے مگر واجد علی شاہ اور دوسرے نوابان اودھ نے اپنی عیاشی و بوالہوسی کے لیے متعہ کی ان احادیث سے جو شیعوں کے مذہبی

---

① تاریخ اودھ ج ۳ ص ۱۹۷۔
② گذشتہ لکھنؤ ص ۸۱۔

لٹریچر میں ہیں ناروا و ناجائز فائدہ اٹھایا۔

مجتہد اعظم شیخ صدوق ابن بابویہ نے باب المتعہ کی اکتیسویں حدیث میں لکھا ہے:

''ان المومن لا یکمل حتی یتمتع'' (کوئی مومن اس وقت کامل الایمان نہیں ہوتا جب تک متعہ نہ کرلے)

تینتیسویں حدیث میں ہے کہ

''شیعہ امام جعفر نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی متعہ کیا تھا''①

اٹھارہویں حدیث میں ہے کہ

معراج میں جبریل فرشتہ نے آنحضور ﷺ کو یہ پیغام پہنچایا تھا کہ

''ان اللہ تبارک وتعالی یقول انی قد غفرت المتمتعین من امتک من النساء''

(یعنی ہم نے (اے محمد) تمہاری امت کی متعہ کرنے والی عورتوں کی مغفرت کردی)

متعہ کی بھی شرعاً دو قسمیں قرار دی گئیں۔دائم اور غیر دائم۔

دائم: وہ جس میں مدت متعین نہ ہو اور غیر دائم: جس میں مدت متعین ہو یعنی ''زن را بمدت یک ساعت یا یک روز یا یک ماہ یا یک سال یا بیشتر عقد نمایند''۔②

ایک گھنٹے یا ایک دن یا اس سے زیادہ عرصہ کے لیے متعہ کرنے کی سہولت کے ساتھ شیعی عقیدے نے کہ بعد فراغت متعہ غسل میں جتنے بال پانی سے تر ہوں ان کے بقدر گناہ معاف ہوں گے۔

---

① ص ۲۳۴. ②توضیح المسائل.

''فاذا اغتسل غفر اللہ لہ بقدر ما مر من الماء علی شعرہ''①

نوابوں، درباری امراء اور ان کے متوسلین کا تو ذکر ہی کیا شہریوں کے مختلف طبقوں کے شوقینوں کو متعہ کا ثواب لوٹنے اور گناہ بخشوانے کی جانب مائل کر دیا۔ اور خانگیوں، طوائفوں کو بھی جو اکثر و بیشتر شیعی مسلک کی تھیں یک ساعتی و یک روزہ غیر دائم متعہ کے کاروبار کو رونق دینے کا شرعی جواز مل گیا۔ شرفا اور مہذب لوگ بھی بلا جھجک ان کے یہاں جانے لگے۔

مولانا شرر ہی کا بیان ہے کہ

''لکھنؤ میں بازاری عورتوں کو یہ رتبہ حاصل ہو گیا کہ مہذب و شائستہ امراء کی محفلوں میں ان کے پہلو بہ پہلو بیٹھتیں، اور یہاں اس مذاق کو یہاں تک ترقی ہوئی کہ بعض مہذب رنڈیوں نے بھی اپنے گھروں میں ایسی نشست و برخاست کی صحبتیں قائم کر دیں جن میں جانے سے بہت سے مہذب لوگوں کو بھی شرم نہیں آتی۔ رنڈیوں کے مکان اچھے خاصے شرفا کے کلب تھے''۔②

رفتہ رفتہ یہ ''شرفا کلب'' آدابِ مجلس سیکھنے کے مرکز ہو گئے، شعر و شاعری کی محفلیں جمنے لگیں، طوائفیں بھی شعر کہنے لگیں، لکھنؤ اور بیرون جات کے سنی شیعہ روساء اور زمینداروں و تعلقہ داروں کی سرکاروں میں بصیغہ ملازمت ہی منسلک نہیں ہوئیں بعض نے اپنی پسند کی متاعی رنڈی کو رفیقہ حیات بھی بنا لیا۔

مشہور ریختی گو شاعر جان صاحب (میر یار علی) فرماتے ہیں ؎

---

① ص ۱۳۱۴ من لا یحضرہ الفقیہ.
② گذشتہ لکھنؤ ص ۳۲۹.

نکاحی بیاہی کو چھوڑ بیٹھے متاعی رنڈی بٹھا کے گھر میں
بنایا صاحب امام باڑہ خدا کی مسجد کو تم نے ڈھا کر

شیعہ رنڈیوں کے بطن سے سنی شوہر کی جو اولادیں ہوئیں وہ اکثر اپنی ماؤں کے مسلک پر رہیں سنی مذہب تعلقہ داروں اور والیانِ ملک کے یہاں اس کی بعض مثالیں ملتی ہیں۔

متعہ کے عام رواج نے ممتوعات وشاہدان بازاری کو اس زمانے کے بگڑے معاشرے میں اس درجہ مقبول کر دیا کہ متصوفین کی سماع کی محفلوں، خانقاہوں اور بزرگوں کے مزاروں کے اجتماع میں ان کے مجرے اور گانے بڑے شوق سے سنے جاتے۔

لکھنؤ میں درگاہ حضرت عباس پر بقول مولانا شرر:

''شہر کی پری پیکر طوائفیں بن ٹھن کر جمع ہوتیں ہزاروں تماشائیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ سلطنت کے قیام تک بڑی دھوم دھام رہتی تھی''۔

یہی کچھ کیفیت اجمیر اور دوسری درگاہوں کے سالانہ اجتماعات کی تھی۔ مذہبی تقریبات کے علاوہ بیاہ شادی کی تقریبوں میں رنڈی کا ناچ مجرا شمالی ہند کے قصبات تک میں لازمی جزو تقریبات کا ہو گیا تھا۔ غرض یہ کہ معاشرے کے بگاڑنے، دین و مذہب کو طرح طرح کی بدعتوں، شخصیت پرستیوں اور لایعنی رسومات کا وہ مجموعہ بنا دیا تھا، جس کی جھلک بادشاہ بیگم اور نصیر الدین حیدر کے شرمناک واقعات میں آپ کو نظر آئے گی۔

ائمہ اثنا عشر کے تمثیلی مقبرے، ان کی منسوبہ بیویاں، ان کی ولادت وفات کی مجلسیں، محرم میں چالیس دن کی عزاداری، یا علی و یا حسین کے نعرے، ان کی دیکھا

دیکھی بلکہ شیعوں کے نقش قدم پر چل کر متصوفین اور تفضیلیہ کی ایجاد کردہ قبوری شریعت کی بدعتیں نذر و نیاز سالانہ عرسوں میں قوالیاں اور رنڈیوں کے مجرے پیری مریدی کے گورکھ دھندے، قوالی کی محفلیں یا غوث اعظم یا خواجہ غریب نواز کے نعروں اس طرح کی دوسری بدعات وخرافات نے دین اسلام کی تعلیمات کو حد درجہ مسخ کر دیا۔ سوائے راسخ العقیدہ علماء اور قوی الایمان متبعین کے دین خالص نہ رہا۔

معاشرے کی یہ حالت مولانا حالی کے چشم دید تھی مسدس میں انہوں نے کس درددل سے سو برس پہلے کہا تھا۔

کتاب اور سنت کا ہے نام باقی
خدا اور نبی سے نہیں کام باقی
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

فرقہ واریت کا عذاب:

مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے میں جو شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے شروع ہوا۔شمالی ہند کے مسلمانوں میں یوں تو شیعی و تفضیلی عقائد ورسومات پھیلتی گئی تھیں۔مگر فرقہ وارانہ مغایرت وعناد شیعہ نوابانِ اودھ کے تعصّبات سے بڑھتا گیا۔ مذہبی تعصب سے لباس و وضع میں بھی فرق وامتیاز کرنا شروع کیا گیا۔

گذشتہ لکھنؤ کے مولف ہی رقمطراز ہیں کہ

''خلفائے اربعہ کی مخالفت اور پنجتن کی محبت نے لکھنو کی درباری معاشرت نے چار کے عدد کو بُرا اور پانچ کے عدد کو محبوب بنا دیا جس کا اثر ٹوپی پر یہ پڑا کہ بر بنائے بعض روایات خود جہاں پناہ کی ہدایت کے مطابق چوگوشیہ ٹوپی میں چار کے عوض پانچ پان کر دیئے گئے۔ نام بھی پنج گوشیہ قرار دیا گیا''۔

اسی شیعہ حکومت کے شباب کے زمانے میں جس کے تنگ دل حکمران ایسے لایعنی تعصّبات میں مبتلا تھے۔ نادر شاہ بادشاہ جو خود بھی شیعی مسلک کا تھا ایران فتح کرنے کے بعد اس کوشش میں مصروف تھا کہ خلفائے ثلاثہ اور دوسرے اصحاب رسول اللہ ﷺ پر سب وشتم اور تبرا بازی ختم کرا کے شیعہ سنیوں میں اتحاد کرا دے تاریخ جہاں کشائے نادری میں بڑی تفصیل سے بادشاہ موصوف کی مساعی جمیلہ کے احوال درج ہیں۔ اس نے ایران کے علماء و مجتہدین اور امراء و روساء اور ہر طبقہ کے نمائندوں کو یکجا کیا اور والی بغداد کو مراسلہ بھیج کر وہاں سے سنی علماء کو بلوایا ان کے سامنے خود بھی پر جوش تقرر کی اور صاف کہا کہ

ایران میں سب سے پہلے شاہ اسماعیل صفوی نے صحابہ رضی اللہ عنہم پر تبرا بازی کے بے ہودہ فعل ''افواہ حمام'' کو (گویا چانڈو خانہ کی گپ) کو جاری کیا اور خاک ایران کو کشت وخون سے بھر دیا۔تم لوگ یہ خانہ برباد فرقہ بندی مٹا ڈالو میں اس بات کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتا کہ میری قلمرو کے مسلمان ایک دوسرے کو کافر بنا کر لڑتے رہیں۔

شیعہ سنی علماء میں کئی دن تک بادشاہ کے مواجہ میں مباحثہ ہوتا رہا بالآخر ایران وترکستان وافغانستان کے شیعہ سنی علماء و مجتہدین اور سلطنت ترکیہ کے نمائندوں کے

متفقہ فیصلے سے محضر نامہ لکھا گیا جس میں اہالیان ایران کی حلفیہ عبارت یہ تحریر کی گئی:

''ہم صحابہ کو برا نہ کہیں گے اور تبرے سے دست بردار ہوتے ہیں خلفاء اربعہ کی فضیلت وخلافت کے اسی ترتیب کے ساتھ قائل ہیں جو اس محضر نامے میں ہے''۔

محرم ۱۱۷۰ھ میں سنی شیعہ اختلاف رفع ہو کر ترکی سلطنت اور نادر شاہ میں عہد مصالحت لکھا گیا تھا یہ جملہ تفصیلات تاریخ جہاں کشائے نادری میں درج ہیں۔سنی شیعہ علماء کا یہ اجتماع نجف میں ہوا تھا اور وہیں شیعہ مجتہدین نے تبرے سے دست بردار ہونے کا حلف اٹھا کر محضر نامہ کی مندرجہ بالا عبارت تحریر کی تھی۔نجف سے نوابان اودھ کا رابطہ برابر قائم تھا مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔تبرے بازی بڑھتی رہی۔

شیعہ سنی مناظرہ کا آغاز شمالی ہند میں یوں تو قاضی نوراللہ شوستری کی تحریرات سے ہوا صحابہ رضی اللہ عنہم کی بدگوئی میں ان کو سزائے موت ملی شہید ثالث کہلائے پھر ایک مدت کے بعد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ردّ شیعیت میں تحفہ اثنا عشریہ تالیف کی۔اس کے بعض ابواب کے جواب میں مولوی دلدار علی نے قلم اٹھایا ان کے فرزند مولوی سید محمد وغیرہ نے تالیفات کیں ان علمائے شیعہ کی تحریرات سنجیدہ ہیں ان میں صریح بدگوئی نہیں کی گئی مگر شیعہ سلطنت کی مالی امداد سے ایران وعراق سے جو لٹریچر منگوا کر پھیلایا گیا اس میں خلفائے ثلاثہ وصحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر واضح الفاظ میں بلکہ ردیف وقافیہ کے ساتھ بدگوئی کے الفاظ تحریر ہیں مثلاً ملا باقر مجلسی کی ''حیوۃ القلوب'' میں ہے:

''عمر بن خطاب علیہ اللعنۃ والعذاب''①

پھر بعد کے سفلہ پرور زمانے میں قرآن مجید کے ترجمہ اور تفسیری حواشی میں

① ص ۴۲۶ مطبوعہ ایران۔

رسول کریم ﷺ کے ان ہی ساتھیوں ''وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ'' اور ''سَابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' صحابہ رضی اللہ عنہم کی نہایت دریدہ دہنی و بے ہودگی سے بدگوئی کی گئی جن کے ایثار و خلوص و کامل الایمان ہونے کی شہادت میں کتنی ہی آیات قرآنی وارد ہیں۔

شیعہ مقبول ترجمہ و حواشی میں ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ'' (یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے) اس آیت شریفہ کی تفسیر میں لکھا گیا ہے کہ ''اَلْفَحْشَآءِ اور اَلْمُنْکَرِ سے مراد حضرت اول (ابوبکر) اور جناب ثانی (عمر) ہیں اس لیے کہ دونوں صاحب از روئے صورت و سیرت مجسم بے حیائی و بدکاری تھے۔ رہا منکر وہ اتفاق سے ثانی مشہور نام کا ہم عدد بھی ہے''۔ ①،②

یہ تو ایک ہی مثال یہاں پیش کی گئی اسی طرح کی سینکڑوں خرافات خباثت سے لکھی گئی ہیں۔ شیعہ نوابوں اور شیعہ امرائے سلطنت اودھ کا دین و مذہب تولاّ و تبرا ہی تھا، اس میں جو غلو کیا گیا اس کا اجمالی ذکر اس کتاب میں اس مقصد سے کیا گیا ہے کہ

---

① ص ۴۱۱ مطبوعہ افتخار بک ڈپو کرشننکر لاہور۔

② منکر/ ۳۱۰ و عمر/ ۳۱۰ کے عدد بقاعدہ جمل ضروری مساوی ہیں۔ حروف ابجد سے اگر تساوی اعداد ہی حجت ہے تو اس مترجم مقبول درگاہ سبائی کو یاد نہ رہا کہ شیعہ/ ۳۸۰ و شیطانیہ/ ۳۸۰ کے عدد بھی مساوی ہیں اور شیعہ علی/ ۴۹۵ و کھٹمل/ ۴۹۵ کے بھی۔ عمر جیسے مبارک نام کے مساوی عدد تو ''برحق/ ۳۱۰'' ''باوقار/ ۳۱۰'' ''مکرمی/ ۳۱۰'' ''رب العباد/ ۳۱۰'' اور بہت سے الفاظ ہیں اسی طرح ابوبکر/ ۲۳۱ کے ہم عدد گوہر/ ۲۳۱، محاسن اعلیٰ/ ۲۳۱، امداد مساکین/ ۲۳۱ وغیرہ ہیں۔

مگر اس بدگو مقبول/ ۱۷۸ کو اپنے نام کے مساوی عدد الفاظ کا خیال نہ آیا جو بہت سے ہیں یعنی نگہ ابلیس/ ۱۷۸، اصلی ابوجہل/ ۱۷۸، نحس زبان/ ۱۷۸، نحس نہاد/ ۱۷۸، مکائد ابلیس/ ۱۷۸، کیسہ ناپاکی/ ۱۷۸، بداسلاف/ ۱۷۸، حیوانِ زمانہ/ ۱۷۸، اندھا بدگمان/ ۱۷۸، ہم کاسہ ابوجہل/ ۱۷۸، نامطبوع/ ۱۷۸، حیوان بے کمال/ ۱۷۸، ان ہی بارہ الفاظ پر اکتفا کیا گیا ورنہ اس کے نامطبوع نام پر تساوی اعداد کے بہت سے الفاظ ہیں۔

فرقہ واریت کے عذاب سے لوگوں کو عبرت ہو۔

سورۃ الانعام میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمادیا ہے:

﴿اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾

''یا بھردے تم کو مختلف فرقے کر کے اور چکھادے ایک کو لڑائی ایک کی''۔

سرسید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے شمالی ہند کے مسلمانوں کی عام تباہی وزبوں حالی کو دیکھ کر جو دلی اور لکھنؤ کی سلطنتوں کی بربادی اور ۱۸۵۷ء کے فسادات کے نتیجے میں رونما ہوئی تھی۔ اصلاح کی کوششیں کیں متعدد بیدار معزز شیعہ حضرات جو قومی درد اپنے دلوں میں رکھتے تھے ان کے معاون ہوئے۔ علی گڑھ تحریک کو فروغ دینے اور کامیاب بنانے میں مساعی رہے۔

سرسید رحمہ اللہ نے شیعہ سنی اتحاد کے پیش نظر نواب محسن الملک مولوی سید مہدی خان پر زور ڈال کر ان کی تالیف ''آیات بینات'' کی اشاعت جو ردّ شیعیت میں ہے بند کرادی تھی۔ بایں ہمہ شیعوں کی تفریق پسند جماعت نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے مقابلہ میں اپنی جداگانہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس قائم کی، آل انڈیا مسلم لیگ کے مقابلہ میں آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس بنائی اور صوبہ بہار، صوبہ جات متحدہ اور پنجاب میں اس کی صوبائی شاخیں بھی قائم کیں پھر علی گڑھ کالج کے مقابلہ میں شیعہ انٹرمیڈیٹ کالج لکھنؤ میں قائم کیا اور لکھنؤ ہی میں شیعہ مذہب کی ترویج واشاعت کے لیے مدرسۃ الواعظین موئید العلوم وتنظیم المومنین ادارے بھی قائم کیے گئے۔

قائداعظمؒ کا تحفظ حقوق شیعہ سے انکار

برصغیر ہند کی تقسیم کے سلسلے میں مسلم لیگ کا مطالبہ قیام پاکستان جب کامیابی سے ہمکنار ہونے کو تھا شیعوں نے یہ سمجھ کر کہ مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ ان ہی کے مسلک کے ہیں۔ اس نئی قائم ہونے والی اسلامی مملکت میں تحفظ حقوق شیعہ کے سوالات اٹھانے شروع کر دیئے تھے۔

قائداعظم کی ولادت تو بے شک اسماعیلی گھرانے میں ہوئی تھی مگر وہ ''امام حاضر'' ہز ہائی نیس سر آغا خان کی امامت ہی کے معتقد نہ تھے بلکہ ہز ہائی نیس کو فرقہ وارانہ امامت کے ترک کر دینے کا مشورہ بھی دیا تھا۔①

مسلمانانِ ہند کے مسلمہ قائد کی حیثیت سے بھی اور اپنے ذاتی تصورات سے بھی وہ سنی شیعہ فرقہ واریت سے بہت بلند تھے۔

---

① اسماعیلیہ گھرانے سے ہونے کی بناء پر بعض لوگوں کو قائداعظم کے مسلک کے بارے میں غلط فہمی تھی انگلستان کا قیام ترک کر کے وہ جب مسلمانانِ ہند کے سیاسی مسائل کی گتھی سلجھانے کو یہاں آ گئے تھے غالباً اقبال سہیل نے مزاحاً چند شعر کہے تھے جن میں یہ دو شعر بھی تھے۔

''آغا'' امام اور ''محمد علی'' ہے باب
اس دین میں ہے ترک سوادِ حرم مباح
بشریٰ لکم کہ منتظر ما رسیدہ است
یعنی حجاب غیبت کبریٰ دریدہ است

لیکن قائداعظم رحمہ اللہ کے واقعات زندگی سے روزِ روشن کی طرح ہویدا ہے کہ وہ سنی شیعہ فرقہ واریت سے قطعاً بیگانہ تھے اسلام کے بنیادی عقیدے توحید و رسالت کے معتقد کی حیثیت سے اسلامی مذہبی تقریبات میں مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے ساتھ شرکت کرتے حتیٰ کہ تجہیز و تکفین بھی ان کی اسی طریقے پر ہوئی، نماز جنازہ بھی مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں یعنی مملکت پاکستان قائم ہونے سے تھوڑے ہی دن پہلے شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے نمائندہ وفد نے پریسیڈنٹ مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح رحمہ اللہ کے سامنے یہ مطالبات پیش کیے کہ قائم ہونے والی اسلامی مملکت میں اقلیت فرقہ کی حیثیت سے شیعوں کے مخصوص حقوق کے کیا تحفظات ہوں گے۔قائداعظم رحمہ اللہ نے شیعہ وفد کو صاف جواب دے دیا تھا کہ

''مسلم لیگ اس اصول پر کاربند ہے اور کاربند رہے گی کہ سب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ اور انصاف ہو''۔

اسی لیے انہوں نے شیعوں کے کسی حق وحقوق کے تحفظ کے بارے میں گفتگو تک کرنے سے انکار کر دیا تھا۔①

قائداعظم رحمہ اللہ کی زندگی میں اور اس کے کچھ عرصے بعد تک تحفظ حقوق شیعہ کے بارے نہ کوئی آواز پاکستان میں اٹھی نہ کوئی ادارہ قائم ہوا۔شیعہ مولوی سید محمد دہلوی نے جنہوں نے اپنی تقریظ مندرجہ مقبول ترجمہ قرآن میں خلفائے ثلاثہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بدگوئی اور سب وشتم کو ''پرانے چٹخاروں کے مزے'' سے تعبیر کیا ہے تحفظ حقوق شیعہ کی تحریک چلائی۔عزاداری وماتم حسین ہی شیعوں کا مخصوص حق ہے۔ اور جس اہتمام اور پیمانہ پر وہ پاکستان میں منایا جاتا ہے بھارت میں بھی اس کی مثال نہیں مثلاً کراچی میں قیام پاکستان سے قبل کھارادر اور آغا خانی خوجوں کے جماعت خانے کے قرب وجوار کے علاوہ نہ شیعوں کی آبادیاں تھیں اور نہ امام باڑے، اثنا عشریہ خوجوں نے البتہ جماعت خانے کے ایک حصہ پر دھینگا مشتی سے قبضہ کر کے امام باڑہ بنا لیا تھا۔مسجد بھی شیعوں کی کوئی نہ تھی تالپری طلباء کے لیے ریاست خیر پور نے

---

① ص ۱۸۷ کتاب شیعیان ہند۔

چھوٹی سی مسجد احاطہ سندھ مدرسہ میں ضرور بنوا دی تھی۔

ماتم حسین وتعزیہ داری کی بھی یہ کیفیت تھی کہ صدر کے قصاب ہی تعزیہ نکالتے اور نیپر روڈ کی رنڈیاں البتہ ماتم بھی کرتیں اور تعزیہ بھی نکالتی تھیں۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد خصوصاً نئی بستیوں میں امام باڑے اور شیعوں کی مسجدیں بھی جا بجا بنتی گئیں تعزیہ داری کے لیے ہر طرح کی سہولتیں بالخصوص مسٹر ابو طالب نقوی کے نظامت کراچی کے زمانے سے پیدا کی گئیں۔

سکندر مرزا صدر مملکت کے ایام میں شیعہ اذانوں میں ''علی ولی اللہ وخلیفتہ بلا فصل'' کے کلمات وہ بھی علی الاعلان لاؤڈ اسپیکر سے کہے جانے لگے حالانکہ جیسا تفصیلاً بیان ہوا شیعہ امامیہ اثنا عشریہ کے ہاں یہ کلمات اذانوں میں کہنے ناجائز اور موجب لعن ہیں۔ اودھ کی شیعہ سلطنت کے حکمران مطلق العنان تھے وہ اپنی تنگ خیالی اور زعم میں یہ سوچنے سمجھنے سے قاصر رہے کہ بدگوئی وتبرا نہایت مذموم فعل اور ایسا لغو تخیل ہے کہ اس کی بنیاد نفرت وعناد اور تعصب پر ہے جو ہمیشہ موجب افتراق و مایہ فساد رہے گا۔

سچ ہمیشہ جھوٹ پر اور روشنی ہمیشہ تاریکی پر غالب آ جاتی ہے پھر آج کا زمانہ تو وہ ہے کہ انسانی شعور محدود وتنگ نظریوں سے بلند ہو رہا ہے تاریخی حقائق جن پر وضعی روایتوں کے دبیز پردے پڑے تھے اب کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ شیعہ حضرات کو سوچنا چاہیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک بیٹے کا نام جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مبارک نام پر ابو بکر رکھا، دوسرے کا عمر اور تیسرے کا عثمان تو کیا اپنے بیٹوں کے یہ نام ان تینوں خلفاء سے اپنی اسی محبت واحترام کے جذبے سے نہیں رکھے تھے جس محبت وجذبہ احترام سے انہوں نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے نام پر ایک بیٹے کا نام

عباس رکھا تھا۔ کیا اس تاریخی حقیقت سے بداہتۂ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ان تینوں پیشتر وخلفاء کو ''غاصب'' نہیں جانتے تھے شاید اسی حقیقت کی روشنی میں اب ایران تک میں یہ تحریک پھیلتی جاتی ہے کہ ایرانی شیعہ ان بزرگوں کے نام احترام سے لیں اور یہ بدگوئی ترک کردیں۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت کے ایام میں ان کے والد ابوطالب مکے سے باہر گئے ہوئے تھے نومولود کا نام ان کی والدہ فاطمہ بنت اسد نے اپنے باپ اور اس بچے کے نانا کے نام پر اسد رکھ دیا ابوطالب گھر واپس آئے انہیں اسد نام پسند نہ تھا اسے بدل کے بیٹے کا نام ''علی رضی اللہ عنہ'' رکھا۔

''علی'' ایک مبارک نام ہے اس کے معنی علو و بلندی و رفعت شرف وغیرہ کے ہیں اور العلی تو اسماء الحسنیٰ میں شامل ہے اسد شیر کو کہتے ہیں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ عم رسول اللہ کا لقب ''اسد اللہ'' تھا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ''سیف اللہ'' کا لقب عطا فرمایا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم وعہد صحابہ رضی اللہ عنہم اور خود اپنے زمانے خلافت میں ''علی بن ابی طالب'' ہی کہلاتے تھے کوئی لقب ان کا نہ تھا ایک مرتبہ اپنی اہلیہ محترمہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کسی ناچاقی کی وجہ سے رات کو مسجد میں آکر سو رہے تھے فرش کی مٹی (تراب) بدن پر لگ گئی تھی اس منظر کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ''ابوتراب'' کہہ کر پکارا تھا۔ شیعوں نے ''ابوتراب'' کے علاوہ انہیں ''حیدر'' بھی کہنا شروع کردیا۔

''الحیدر والحیدرۃ'' ان کے اصلی نام ''علی'' کے مقابلے میں گھٹیا نام ہیں کیونکہ یہ الفاظ اسد اور شیر کے معنی میں بھی مستعمل ہیں اور تباہی و ہلاکت کے معنی میں بھی۔ سکندر مرزا کے زمانے میں مملکت اسلامیہ پاکستان کا سب سے بڑا قومی اعزاز شیعوں

کے اسی مخترعہ لقب سے ''نشان حیدر'' رکھ دیا گیا۔ ''نشان علی'' رکھا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔ پھراس تاریخی حقیقت سے بھی کسی تاریخ داں کومجال انکارنہیں ہوسکتی کہ اسلامی مملکت کی بنیادیں نظم ونسق اور مختلف شعبوں کے قواعد وضوابط وغیرہ کے اعتبار سے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں استوار ہوئیں۔ زبردست فتوحات اور قومی وملی اتحاد و یک جہتی کے اعتبار سے بھی خلافت فاروقی کا عہد مثالی عہد تھا اسی مبارک عہد میں مجوسی ایران اور رومی عیسائی شہنشاہتیں جو اسلام دشمن قوتیں تھیں فنا کی گئیں۔

بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مختصر سے پرآشوب زمانے کے جس میں قومی اتحاد کا شیرازہ بکھر کر فتنہ وفساد ایسا برپا رہا کہ تقریباً اسّی ہزار مسلمان ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ کر ہلاک ہو گئے تھے۔ اسلامی مملکت میں ''نشان فاروق'' کا کوئی اعزاز مقرر نہ ہونا یا حضرت خالد بن ولید ''سیف اللہ'' کے مبارک نام سے جن کا کوئی ثانی قیادت جیوش، فنون حرب کے معجزانہ کمال اور بے پناہ تہور وشجاعت میں نہ تھا کوئی اعزاز ونشان تجویز نہ ہونا سکندر مرزا اور ان کے کسی مشیر کی غفلت وخطائے اجتہادی کا سبب وثبوت ہے یا تنگ خیالی وتعصب کا؟

فروغ شرک وبدعت:

شیعیت کے اصول ''تولاّ'' میں جو غلو نوابان لکھنؤ کے ہاں ہوتا رہا ان کے درباری اور متوسلین بھی اسی رنگ میں رنگ گئے رفتہ رفتہ شخصیت پرستی بڑھتی گئی۔ ہمایوں بادشاہ کے ساتھ جو ایرانی لشکری آئے تھے بقول مولف دربار اکبری ان کے بیشتر نام گدا علی، مسکین علی، زلف علی، پنجہ علی اور کشف علی وغیرہ تھے جس پر شیخ حمید سنبھلی نے بادشاہ سے کہا بھی تھا:

''تمام لشکر شارارافضی ویدم''

لکھنوی شیعیت کی فضا میں تو بندہ علی، کلب علی، تراب علی، مدد علی نام رکھے گئے اور ناموں کے ساتھ ''یا علی مدد'' کا ورد شروع ہوا۔

گلبرگہ کی مسجد اودھ سلطنت کے خاتمے سے تقریباً چانچ سو برس پہلے ایک شیعہ بادشاہ نے تعمیر کرائی تھی اس کی محراب کے کتبے کو آپ نے ملاحظہ کیا سب سے اوپر شیعوں کے پنجتن کے نام نقش ہیں مگر کسی نام کے ساتھ ''یا'' نقش نہیں۔ بعد کی صدیوں میں یہ مشرکانہ بدعت ایسی پھیلی کہ سو برس پہلے مولانا حالی اپنے ابنائے زمان کے شرک وبدعت کا رونا یوں رو گئے ہیں۔

وہ دیں جس سے توحید پھیلی جہاں میں
ہوا جلوہ گر حق زمین وزماں میں
رہا شرک باقی نہ وہم وگماں میں
وہ بدلا گیا آ کے ہندوستاں میں
ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

''یا'' حرف ندا ہے، اس کے معنی ہیں آواز اور پکار، آواز اسی کو دی جاتی ہے پکارا اسی کو جاتا ہے جو موجود ہو۔ اسلامی عقیدے میں ہر جگہ، ہر وقت، ہر حال میں حاضر وناظر اور موجود ہستی خالق کائنات کی ہے، خدا ہر وقت ہر جگہ موجود ہے اس کے سوائے کوئی اور ہستی ہر جگہ ہر وقت موجود نہیں۔ خدا لایزال ہے اس کے سوا سب ھالک ہیں۔

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾①

①آل عمران.

''اس کے سوائے سب فانی ہے''۔

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾①

''اس کے سوائے سب کو فنا ہے''۔

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْإِكْرَامِ﴾②

ہر شخص کو مرنا ہے بلکہ افضل البشر کو بھی ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ إِنَّهُمْ مَّيِّتُونَ﴾③

(اے محمد!) بے شک تجھے بھی مرنا ہے اور وہ بھی مر جائیں گے''۔

آنحضور ﷺ کی وفات ہی پر تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے سب سے بزرگ شخصیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''ایها الناس من کان یعبد محمد (ﷺ) فانه قد مات و من کان یعبد الله فانه حی لا یموت''۔

''اے لوگو! جو شخص محمد ﷺ کو پوجتا تھا وہ جان لے محمد مر گئے لیکن جو شخص اللہ کی بندگی کرتا ہے اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ زندہ ہے اسے کبھی موت نہیں آئے گی''۔

پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ﴾④

''اور محمد اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی (اللہ کے) رسول گزر چکے ہیں پھر اگر وہ وفات پا جائیں یا وہ قتل ہو

---

①القصص.
②الرحمٰن.
③زمر ۳۱.
④آل عمران ۱۴۴.

جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں راہِ حق سے پھر جاؤ گے''۔

اللہ جل شانہ کے سوائے کسی کی بقا نہیں۔اسی نے سورۂ بقرہ کی آیت میں فرما دیا ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾①

''جب (اے رسول) تجھ سے میرے بندے میرے متعلق استفسار کرتے ہیں میں یقیناً نزدیک ہوتا ہوں پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارے''۔

ایک دکھیاری عورت نبی ﷺ کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ سے فریادی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کی پکار سنتے ہیں۔اس کی فریاد کے بارے میں نبی پر وحی بھیجتے ہیں جو سورۃ المجادلہ کی ابتدائی آیات ہیں۔شانِ نزول یہ ہے کہ اسلام سے پہلے اگر شوہر اپنی عورت کو کہہ دیتا کہ ''تو میری ماں ہے'' تو ساری عمر کے لیے علیحدگی ہو جاتی۔اوس رضی اللہ عنہ بن صامت اپنی بیوی خولہ سے یہی الفاظ کہہ بیٹھے تھے خولہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنا ماجرا سنایا آپ نے مروجہ رسم کے مطابق فرمایا کہ

''خدا کا خاص حکم اس معاملے میں مجھے نہیں پہنچا میرے خیال میں تو اس پر حرام ہوگئی''۔

وہ شکوہ وزاری اور جھگڑا کرنے لگی کہ یا رسول اللہ! اس نے طلاق کا ارادہ نہیں کیا تھا غصہ میں کہہ بیٹھا تھا اس طرح تو گھر ویران ہو جائے گا اولاد پریشان ہو جائے گی پھر اللہ تعالیٰ سے یوں فریادی ہوئی اے اللہ! تو اپنے نبی کی زبان سے میری مشکل حل کر دے۔اللہ تعالیٰ نے اس کی فریاد سنی اور یہ آیتیں نازل فرمائیں:

①سورۃ البقرہ.

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ﴾①

''سن لی اللہ نے بات اس عورت کی جو جھگڑتی تھی تجھ سے (اے رسول) اپنے خاوند کے حق میں اور جھینکتی تھی اللہ کے آگے اور اللہ سنتا تھا سوال وجواب تم دونوں کا بے شک اللہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے''۔

دیکھا آپ نے سرور عالم وعالمیان ﷺ کی موجودگی اور افضل البشر کے سامنے دعاؤں اور التجاؤں کے سننے اور مشکلات کو حل کرنے والے اللہ تعالیٰ نے جو ہر وقت وہر جگہ موجود ہے اس دکھیاری عورت کی التجا بھی سنی۔

اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں:

﴿وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾②

''اور البتہ ہم نے بنایا انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو باتیں اس کے جی میں آتی رہتی ہیں اور ہم اس سے نزدیک ہیں اس کے پھڑکنے والی رگ سے بھی زیادہ''۔

خالق کائنات جو مخلوق کی رگِ جاں سے بھی قریب ہے وہ ہی مخلوق کے دل کی بات جانتا ہے وہ ہی فریاد رس اور مشکل کشا ہے۔''یا اللہ'' کہہ کر اسی کو پکارا جاتا ہے۔ کسی بھی رسول وپیغمبر اور ولی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ جس طرح خدا کو حاضر وناظر اور حاجت روا جان کر یا اللہ کہہ کر پکارتے ہو مجھے بھی ایسا ہی سمجھو''یا محمد''''یا علی''''یا غوث اعظم'' کہہ کر پکارو بلکہ اس کے برعکس وہ جن کا مرتبہ''بعد از خدا بزرگ توئی''

① المجادلہ۔ ② ق ۱۶۔

ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) بحکم و بوحی خدا صراحتاً فرماتے ہیں:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾①

''کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر وہ (الٹا) لوگوں سے کہے خدا کو چھوڑ کر میرے بن جاؤ''۔

اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے رسول ﷺ سے صاف کہلوا دیا ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾②

''(اے رسول) کہہ دو میں بھی تو تم ہی جیسا ایک بشر (ایک آدمی) ہوں البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تمہارا معبود ہی ایک اللہ ہے''۔

عہد رسالت، زمانہ صحابہ اور دورِ تابعین و تبع تابعین میں اسلامی عقیدہ توحید وشرک کی آمیزش سے محفوظ تھا کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ گزرا ہوگا کہ توحید کے پرستاروں پر کبھی ایسا منحوس وقت بھی آئے گا کہ ''یا اللہ'' کے ساتھ اللہ ہی کے خلق کیے ہوئے کسی بشر کو ''یا'' کہہ کر پکارا جائے گا اور ''یا اللہ'' کے ہم پہلو اِن کے نام بھی ''یا'' کے ساتھ لکھے جائیں گے اور وہ بھی مسجدوں کے دروازوں اور محرابوں پر۔

پنج وقتہ نمازوں میں ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾③

(اے اللہ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے تو ہم مدد چاہتے ہیں)

پڑھنے اور پڑھانے والے ہزاروں برس کے مدفون مردہ بندوں سے مدد

---

①آل عمران ۷۹.

②الکھف ۱۱۰،حم.

③الفاتحہ.

واستعانت چاہیں گے اور صوفی وملا اور دوسرے عیار جلب منفعت کی خاطر اپنے ناواقف اور اوہام پرست مریدوں اور پیروں کو مزاروں پر نذریں چڑھانے اور ان کے سر نہوڑوانے پر اکسائیں گے۔

مولانا روم نے کیا صحیح بات کہی ہے کہ کسی گدھے کو دوسرے گدھے کے سامنے جھکتے اور سجدہ کرتے نہیں دیکھا یہ آدمی جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے ہم جنسوں کی بندگی کرنے میں گدھے سے بھی بازی لے گیا۔فرماتے ہیں۔

ہیچ خر ساجد ندیدم پیش خر
آدمی زیں خوئے شد از خر بیتر

اقبال رحمہ اللہ نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا۔

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
جوہرے داشت ولے نذر قبا جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زمگان خوارتر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

شیعیت نے ائمہ کی بندگی ، ان کے اصلی یا فرضی مدفنوں پر شاندار تعمیرات وزیارات کو مذہبی اہمیت دے کر شخصیت پرستی اور قبر پرستی کے لیے جس کا نمونہ آپ بادشاہ بیگم کے واقعات میں ملاحظہ کریں گے، ایسی فضا پیدا کر دی کہ اوہام پرست ڈاکو ورہزن بھی اپنے جرائم کی کامیابی کے لیے استمداد اور استعانت ان بزرگوں کا نام لے کر چاہنے لگے اس کا بدترین نمونہ حال ہی کا واقعہ ہے جس کی تشہیر اخبارات کے کالموں میں ہوئی کہ اسمگلروں کے پاس سے گھڑیوں کی جو پیٹیاں برآمد ہوئیں جن کے فوٹو بھی شائع ہوئے ہیں ان پر ''یا علی مدد'' کے جملے جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے۔

پنجاب وسندھ کے بعض مقامات کی طرح کراچی میں کوئی قدیم مزار ایسا نہ تھا جو مرجع خلائق ہو اب چند سال سے کلفٹن پر واقع کسی مجہول الحال شخص کی قبر کو عبداللہ الاشتر مقتول بکابل جیسی تاریخی شخصیت کی قبر بنا کر بڑی عیاری سے اوچھالا جاتا ہے۔ یہ عبداللہ الاشتر حسنی نسل کے تھے ان کے والد محمد الارقط اور چچا ابراہیم نے خلیفہ المنصور رحمہ اللہ کے خلاف مکہ اور بصرے میں بغاوتیں کی تھیں جو ناکام رہیں عبداللہ مذکور اپنے چچا کے پاس بصرے میں تھے باپ اور چچا کے مارے جانے کے بعد بھاگ کر سندھ آگئے تھے خلیفہ نے ان کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ عبداللہ سندھ سے بھاگ کر نواح کابل چلے گئے سرکاری فوج نے وہاں بھی تعاقب کیا بالآخر ۱۵۱ھ میں نواح کابل کی ایک پہاڑی علج نام پر مع ساتھیوں کے مارے گئے۔ ان کے فرزند کابل میں پیدا ہونے کی وجہ سے محمد الکابلی کہلاتے تھے۔

کتاب نسب قریش کے مولف ان کے ہمعصر تھے انہوں نے ذاتی واقفیت سے یہ سب حال لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ

''عبداللہ الاشتر قتل بکابل''۔① ''یعنی کابل میں قتل ہوئے''۔

جو شخص خلافت کے باغی کی حیثیت سے کابل میں قتل ہوا اس کی لاش کلفٹن پر کیسے کیوں اور کون دفن کرتا۔ ان عبداللہ الاشتر کے ہی ہم جد مصنف عمدۃ الطالب نے ان کے خاندانی انساب وحالات بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہوئے نواح کابل ہیں ان کے قتل ہو جانے اور وہاں سے بغرض پرورش اہل خاندان کے پاس مدینہ بھیجے جانے کا حال لکھا ہے۔②

عبداللہ الاشتر کے اس اکلوتے بیٹے محمد الکابلی کے پانچ بیٹے ہوئے جن میں دو

① ص ۵۴۔ ② ص ۸۴۔

بیٹوں سے خوب نسل چلی ان میں سے ایک بیٹے الحسن الاعور کی نسل میں ایک فاضل شخص قطب الدین احمد جن کا سلسلہ نسب سات واسطوں سے عبداللہ الاشتر کے پوتے ابو محمد عبداللہ بن الحسن الاعور سے متصل ہوتا ہے تباہی بغداد کے بعد سندھ آ گئے تھے بعد میں یہ صحیح النسب خاندان کٹرہ مانک پور روڈ لمبیو ضلع رائے بریلی وغیرہ میں مسکن گزیں رہا جن میں نسلاً بعد نسلٍ علماء وفضلا واتقیا ہوتے رہے۔

مجاہد کبیر سید احمد شہید رحمہ اللہ اسی قطبیہ حسنیہ خانوادے سے تھے نیز مولانا حکیم عبدالحیٔ مصنف نزھۃ الخواطر وغیرہ بھی جن کی تاریخ وسیر پر بہت وسیع نظر تھی انہوں نے کسی تصنیف میں خصوصاً سندھ وگجرات کے تاریخی حالات کے مقالہ میں جو ۱۹۱۳ء کے اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ خیر پور کے لیے لکھا تھا اور راقم الحروف نے طبع کرایا تھا اشارتاً بھی اس کا ذکر نہ کیا کہ کلفٹن کی مجہول الحال قبر اِن کے جد اعلیٰ کی ہے اور نہ اس خاندان کے کسی اور فرد کو یا سندھ کے کسی اہل علم کے وہم وگمان میں یہ بات تھی۔ گذشتہ ساٹھ برس سے یا بالفاظ صحیح تر ۱۹۰۷ء سے کراچی کے آثار قدیمہ تو راقم الحروف کے چشم دید ہیں۔ اس سال کراچی میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس مولانا حالی رحمہ اللہ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ راقم الحروف کو مولانا موصوف کی مشفقانہ معیت میں یہاں حاضری کا اتفاق ہوا تھا۔

پاکستان بننے کے برسوں بعد سے کسی حاجی عبداللہ یا عبداللہ شاہ جیسے مجہول الحال شخص کی قبر کو مماثلت اسمی کے فریب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب نواسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پوتے کے پوتے سے منسوب کرنے کا پروپیگنڈہ نسل پرستی کی غیر اسلامی فضا پیدا کرنے کے لیے کیا گیا۔ اس فضا کے کچھ حالات آپ بادشاہ بیگم اور نصیر الدین حیدر کے حالات میں ملاحظہ کریں گے۔ سیاسی اغراض سے شیعیت نے پھر صوفی گورکھ

دھندے نے نبی ﷺ کی اولاد دختری کے ساتھ جو انس وعقیدت مسلمانوں کو ہے اس کو طرح طرح سے ابھارا۔ آنحضور ﷺ کے سب صاحبزادے اللہ تعالیٰ نے بچپن میں شاید اسی لیے اٹھا لیے جیسا ارشاد ہے کہ

''محمد تم میں سے کسی ایک مرد کے بھی باپ نہیں، مگر اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں''۔

قرابت نبی ﷺ کے دعوے وراثت سے اسلامی نظام کو مبرا رکھنا تھا۔

اگر کوئی رہ جاتا بیٹا نبی کا
عجب کیا وہ کرتا وراثت کا دعویٰ
نہ اٹھتا وہ خود تو کوئی اور اٹھاتا
نواسوں کی تاریخ کو دیکھے دنیا
نواسوں کی تاریخ مظہر ہے اس کی
کہ بیٹے نبی کے رہے کیوں نہ باقی

شیعیت نے جو غلو نواسوں اور ان کی اولاد کے ساتھ سیاسی مصلحتوں سے کیا اس کی جھلک اس کتاب میں ہے جس کے سلیس اردو میں ترجمہ کرنے کی زحمت مکرمی سراج احمد صاحب عثمانی چشتی نے اٹھائی اور نظر ثانی مکرمی ضیاء الدین احمد صاحب برنی نے کی ہے ان دونوں دوستوں کی زحمت فرمائی کا شکریہ۔

محمود احمد عباسی

پیش لفظ

ازقلم: مشہور ہندوستانی مؤرخ: سرجادوناتھ سرکار۔سی۔آئی۔ای

بیگمات اودھ نے تاریخ ہند پر دیرپا نقش چھوڑے، ان میں سے اولین دو بیگموں یعنی نواب صدر النساء ① نے جو ایک نواب کی تحکم پسند بیٹی، ایک دوسرے نواب کی بیوی اور ایک تیسرے نواب کی والدہ تھیں۔ نیز بہو بیگم ② نے جو دہلی کے ایک شہنشاہ کی لاڈلی لے پالک تھیں ایک ایسی المناک داستان کے ہیروئن کی حیثیت سے اپنی زندگیوں کے دن پورے کیے کہ کالے پانی کے اس پار ویسٹ منسٹر ہال میں ایک انگریز سحر بیان نے جب اس داستان کو چھیڑا تو سننے والوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔

نوابی خاندان کے اختتام کے قریب ہی بادشاہ بیگم ہوئیں جو ضعیف العقل نواب غازی الدین حیدر کی جوشیلی بیوی تھیں پھر حضرت محل جو واجد علی شاہ جیسے عاشق مزاج سادہ لوح نواب کی اولوالعزم بیگم گویا فوجی بغاوت کی جیوڈتھ تھیں③ اودھ کی ان شاہی خواتین میں سے تین سے تو انگریزی تاریخ دان واقف ہیں لیکن بادشاہ بیگم مورخ کی نگاہ میں اس وقت تھوڑے سے وقفے کے لیے آئیں جب ۱۸۳۷ء میں انہوں نے منا

① نواب بیگم برہان الملک نواب سعادت علی خاں کی بیٹی، نواب صفدر جنگ کی بیوی اور نواب شجاع الدولہ کی والدہ تھیں۔

② بہو بیگم موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں بہادر کی بیٹی اور نواب شجاع الدولہ کی بیوی تھیں۔

③ جیوڈتھ ایک خوبصورت یہودن تھی جو ہولوفرانس کے ماتحت اسیریا کی فوج میں داخل ہو گئی تھی اور سردار فوج کا اعتماد حاصل کر کے اسے تنہائی میں شراب پینے پر راضی کر لیا تھا اور اس کے مست ہو جانے کی حالت میں اس کا سر کاٹ لیا تھا۔ (مترجم)

جان کے حق میں ایک ناکام انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جس کا حال سلیمن نے اپنی کتاب ''سلطنت اودھ کے اندر سفر'' ① میں شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔

محمد تقی احمد نے تاریخ اودھ کی یہ بہت بڑی خدمت کی ہے کہ اس بیگم کے ہمعصرانہ حالات زندگی کے بارے میں ایک کتاب دریافت کر لی اور اس کا ترجمہ بھی پیش کر دیا۔ اصل کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو بیگم کے گھر بھی آتا جاتا تھا اور برطانوی ریزیڈنسی میں بھی اسے یکساں دخل تھا۔ یہ احوال ایک ہندوستانی شاہد کے قلم سے سلیمن کے بیان کی بہت سی تفصیلات میں تطابق رکھتے ہیں۔

لیکن اس بایوگرافی کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اسی شہر کی ایک مشرقی ملکہ کی سیرت اور اس کے گھرانے کی اس میں ہو بہو اور زندہ تصویر کھنچی گئی مگر یہ ڈاکٹر نائٹن کی ہیروئن سے ایک نسل پہلے کی ہے اور موخر الذکر تصنیف کے مقابلے میں نہ صرف زیادہ مختصر ہے بلکہ لایعنی تفصیلات کی بھرمار سے بھی مبرا ہے جن سے ''ایلیہو جان'' کی کہانی پٹی پڑی ہے۔

موجودہ کتاب اس اعتبار سے اور بھی لائق توجہ ہے کہ ہندوستان میں شیعیت کے نشوونما پانے کی وہ ایک ایسے پہلو سے وضاحت کرتی ہے جس کا علم ہم میں سے بہت کم لوگوں کو تھا۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ② میں اس موضوع پر جو آرٹیکل درج ہے اس کے فاضل مقالہ نگار نے اس مذہب (شیعہ) میں تشبیہی تجسیم ③ کے ایسے اہم عنصر کی جانب توجہ دلائی ہے جو راسخ الاعتقاد صحیح اسلام کے فلسفہ سے تخالف رکھتا ہے اور صاف طور

① جلد ۲ ص ۱۸۲۔ ۱۵۳۔ ② جلد ۴ صفحہ ۳۵۸۔

③ یعنی مذہب شیعہ کے عقائد جن میں اماموں کو معصوم عن الخطا و مافوق البشر اور متصف و مظہر صفات الٰہیہ قرار دیا گیا ہے یعنی مذہب تشبیہ و تجسیم جسے انگریزی اصطلاح میں Anthropomorphism کہا جاتا ہے۔

سے اشارہ کیا ہے کہ

''مصائب حسین اور ایک مافوق البشر امام کے ظہور'' کے محرکات نے اس مذہب (شیعہ) کے نشوونما میں ایسے طور وطریقے سے حصہ لیا جو اسلامی عقائد مروجہ عرب سے منحرف ومتضاد ہے۔آئندہ نہایت دلچسپ صفحات میں، جیسا دورِ حاضر کے قارئین کو واضح ہوگا، یہ بنیادی سبب بادشاہ بیگم کے انوکھے مذہبی خرافات کی تشریح پیش کرتا ہے''۔

مجھے یقین ہے کہ تاریخ اودھ کے بارے میں جو اصلی مواد وماخذ موجود ہیں مسٹر تقی احمد نے ابھی ان کی ابتداء کی ہے انہوں نے نوابی زمانہ کی تاریخ اودھ کے متعلق متعدد قیمتی اور نادر تصانیف بھی جمع کی ہیں جن میں ڈلہوزی کی کتاب مطبوعہ لنڈن ۱۸۵۴ء کا دندان شکن جواب اور واجد علی شاہ کے ایجنٹ مسیح الدین خاں① کی کتاب

Indication of Oudh and its Government

(اودھ اور اس کی حکومت کی بریت) بھی شامل ہیں۔

آخر الذکر کتاب تو لنڈن میں ۱۸۵۶ء میں طبع ہوتے ہی ممنوع قرار دے دی گئی تھی لیکن اس کتاب نے ''اودھ پر زبردست ڈاکہ زنی یا لوٹ مار'' کے بارے میں کافی مواد بہم پہنچا دیا تھا۔مفاد تاریخ کی خاطر یہ نادر ونایاب کتابیں کسی پبلک ادارے کو حاصل کر کے محفوظ کرا دینی چاہئیں۔

جادوناتھ سرکار ۱۵جون ۱۹۳۸ء

① خان بہادر مولوی مسیح الدین خاں بن مولوی علیم الدین خاں سکنہ قصبہ کاکوری مضاف لکھنؤ مترجم تاریخ الخلفاء۔

تعارف

ازقلم: محمد تقی احمد ام۔اے۔ایل۔ڈی

میں نے اس فارسی مخطوطہ (تاریخ بادشاہ بیگم) کا جو مجھے مہاراجہ بلرام پور آنجہانی کی ذاتی لائبریری میں ملا، ترجمہ (انگریزی زبان میں) اس خیال سے کیا ہے کہ تاریخ اودھ کا ایک قیمتی شاہکار ضائع ہونے سے محفوظ رہے۔ اب تک تاریخ اودھ لکھنے کے بہت کم اقدامات کیے گئے ہیں حالانکہ یہ وہ مضمون ہے جو ہماری سب سے پہلی توجہ کا مستحق تھا۔ ہم آج بھی وہیں ہیں جہاں ہم ۱۸۸۵ء میں تھے جبکہ ڈاکٹر ہوئی نے ایک ایسے ہی مضمون کی کتاب کے مترجم ہونے کی حیثیت سے یہ رائے دی تھی کہ

> ''تاریخ اودھ کبھی لکھی ہی نہیں گئی۔ ہمارے پاس انگریزوں کے لکھے ہوئے گنتی کے چند خاکے ہیں۔ اور اردو زبان میں بہت مختصر سے خلاصے ملتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسی کتاب ہمارے پاس نہیں ہے جسے تاریخ کہا جا سکے''۔

اس زمانہ سے لے کر اب تک بہت سے بیش قیمت قلمی نسخے ضائع ہو چکے ہیں اور جو چند باقی ہیں وہ ایسے تتر بتر ہیں کہ وہ بہت جلد بے خبری میں ضائع ہو جانے والے ہیں۔ ایسے نسخوں کو جمع کرنے کے لیے جو حقیر کوشش میں چند سال سے کر رہا ہوں اس سے مجھے یقین ہوتا ہے کہ ان کی قدر و قیمت کس قدر زیادہ ہے۔ خود ہوئی نے محسوس کیا تھا کہ

''ہمیں ہندوستانی ذرائع سے معلومات فراہم کرنی چاہئیں۔ اس میں کوئی

شبہ نہیں کہ ایسی مستند معلومات موجود ہیں۔ضرورت ان کے فراہم کرنے کی ہے۔ایسی ہی ایک کتاب کے دستیاب ہونے کے بعد میں نے اس کا ترجمہ اس نیت سے کیا ہے کہ اس سلسلہ میں مزید تفتیش وتحقیق کی حوصلہ افزائی ہو''۔①

اس کتاب کی تاریخی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ ایسے دور کے واقعات کا معاصرانہ بیان ہے جن کا خود مصنف نے دارالحکومت لکھنؤ میں رہ کر مشاہدہ کیا ہے۔ ریزیڈنٹ لکھنؤ کے سیکنڈ اسسٹنٹ لیفٹیننٹ جے ڈی شیکسپیئر سے اس کے اچھے تعلقات تھے اس کے ہی ایما پر یہ کتاب اس نے لکھی اور اپنے دیگر ہم عصر مصنّفین کے مقابلے میں جنہیں صرف نوابی دربار ہی تک رسائی حاصل تھی اور دونوں طرف کے حالات سے جو واقف نہیں ہو سکتے تھے اس کو یہ فوقیت البتہ حاصل تھی۔

قیصر التواریخ کے مصنف نے جو خود غازی الدین حیدر اور اس کے جانشینوں کا ہمعصر تھا اس کتاب سے استفادہ کیا ہے جس سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب مستند مانی گئی تھی۔علاوہ ازیں جو حالات اس میں بیان کیے گئے ہیں وہ بالتفصیل ان معلومات کے متعلق ہیں جو جزواً جزواً ''کاغذات اودھ''سلیمن کی کتاب ''سلطنت اودھ کے اندر سفر''اور دیگر دیسی ریکارڈز میں پائے جاتے ہیں۔

تاریخ کے طلبا کے واسطے اس کی جو قدر و قیمت ہے اس کے علاوہ یہ کہانی اس قدر دلچسپ طریقہ سے بیان کی گئی ہے کہ سرسری طور سے پڑھنے والا بھی اس میں منہمک ہو جاتا ہے۔یہ کتاب جس میں غازی الدین حیدر حکمران اودھ (۱۸۲۷۔۱۸۱۴ء) کے محل خاص بادشاہ بیگم کی زندگی کے حالات بیان کیے گئے ہیں کئی دلچسپ پہلو رکھتی

① چنانچہ تاریخ اودھ پر چند تصانیف اردو میں اس کے بعد سے شائع ہو چکی ہیں۔

ہے۔فی الجملہ اودھ کے اس دور کی پوری تاریخ ہے جو غازی الدین حیدر کی تخت نشینی ۲۷۔۱۸۱۴ء سے شروع ہو کر اس کے بیٹے نصیر الدین حیدر کی وفات اور محمد علی شاہ کی تخت نشینی یعنی ۱۸۳۷ء تک ختم ہو جاتا ہے۔

وہ جامع تفصیل جو اس کتاب میں اس زمانہ کا بہت اہم واقعہ یعنی منا جان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بارے میں ہے اور جو اس بیگم کا آخری اور بہت ہی دلیرانہ اقدام تھا وہ اسے اس مبحث کی چند مستند کتابوں کے زمرے میں شامل کرا دیتی ہے پھر یہ نہ صرف بیگم موصوفہ کی سیاسی سرگرمیوں کا پورا پورا حال بتاتی ہے بلکہ یہ اس موضوع پر کہ سلطنت کے معاملات میں بیگمات کا دخل ہوتا تھا بہت زیادہ روشنی ڈالتی ہے بلکہ حرم کے مذہبی اور معاشرتی رسوم کا بھی جنہیں ہندوستان کے مسلم تاریخ نویس باوجود دلچسپی کے نظر انداز کر دیتے ہیں تفصیل سے بیان کرتی ہے۔

غالباً یہ ان چند شاہی بیگمات کی سوانح عمریوں میں سے ایک ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں۔نور جہاں، جہاں آرا اور روشن آرا جیسی با اقتدار بیگمات کو بھی کوئی سوانح نگار نہیں ملا۔تب یہ سوال معقول طور سے پوچھا جا سکتا ہے کہ بادشاہ بیگم کی سوانح عمری لکھنے والا کیوں میدان میں آیا؟ اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ مغربی اثرات نے کچھ تو اس وقت نسوانی رازداری کے متعلق ہمارے تخیل میں تبدیلی پیدا کر دی تھی اور اس بندش کو ڈھیلا کر دیا تھا یا یہ سبب ہو سکتا ہے کہ سوانح نگار کو جو بیگم کا ہوا خواہ نہ تھا اس سے تنفر تھا بلکہ اس کا پختہ نکتہ چیں تھا اور اس نے بیگم کے جاہ طلب منصوبوں کی تضحیک کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی۔لکھنے کا خواہ کوئی مقصد ہو مگر یہ بیگم بلاشبہ ایسی منکسر مزاج نہ تھی کہ اپنے عظیم اختیارات کو استعمال میں نہ لاتی یا سلب کیے رہتی۔

کپتان وہائٹ جو ''اودھ کا مقتول بادشاہ'' کتاب کا مصنف ہے اس بیگم کو عالی

مرتبت قرار دیتا ہے اور ''اسے دنیا کی نہایت ہی عجیب وغریب عورتوں میں شمار کرتا ہے'' آیا سلطنت کے واسطے اس کا اثر مضرت رساں تھا یا نفع بخش؟ اس پر اختلاف رائے ہوسکتا ہے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ بادشاہ بیگم اپنے عہد کی بہت سی بیگمات کے مقابلہ میں زیادہ اولوالعزم تھی۔

یہ ایک قابل معافی امر ہوگا اگر اس موقع پر کنگسٹن کی کتاب ''ایک مشرقی بادشاہ'' کا ایک دلچسپ فقرہ یہاں نقل کردیا جائے جس سے اس دور کی مثالی عورتوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''عورتیں مردوں کو بالاتر ہستی خیال کرتی ہیں وہ ان کی باتوں کو اس طرح گوش گزار کرتی ہیں جیسے بچہ اپنے والدین کی باتوں کو سنتا ہے ان کے خیالات کو اختیار کرتی ہیں اور ان کی رایوں کو پورے اعتماد کے ساتھ بلا پس وپیش تسلیم کرلیتی ہیں۔جس سے طفلانہ سادہ پن اور پختہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے مگر بادشاہ بیگم اتنی زیادہ حوصلہ مند تھی کہ وہ اس غلامانہ ذہنیت کو قبول نہیں کرسکتی تھی''۔

آگے چل کر شاہی خاندان میں ازدواجی تعلقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''گو بادشاہ کی ہر بیگم اپنا ذاتی حرم رکھتی تھی اور چاہے وہ مہینہ میں ایک دفعہ بھی اس سے نہ ملے پھر بھی وہ بیوی تھی اور ملکہ، کنیز، محبوب اور داشتہ ہو سکتی تھی اور ملکہ ایسی بیوی جس سے تغافل وبے رخی برتی جاتی ہو مگر ایسا تعلق بادشاہ بیگم جیسی مزاج والی عورت کے لیے ناقابل برداشت تھا۔اس کے متعلق یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ وہ نہایت حوصلہ مند بیگم تھی اور خود

رائے بھی تھی۔لیکن کیا اس کے زمانہ میں عورتوں کی حیثیت ایسی ناقابل اطمینان نہیں تھی کہ ایک عالی حوصلہ بیگم خودسر نہ ہوجاتی''۔

لہٰذا یہ کہنا کوئی عذر نہیں کہ اگر بادشاہ بیگم کا زمانہ بہتر ہوتا تو وہ اپنے غیر معمولی اختیارات کا بہتر استعمال کرتی۔ وہ جو زیروں کو مقرر اور برطرف کرسکتی تھی۔ بادشاہوں سے لڑسکتی تھی اور اپنے امیدوار کو تخت نشین کرنے کے لیے ایک فوج کی رہنمائی کرسکتی تھی وہ اپنی خداداد قابلیت غیر متزلزل دلیری اور عزم واستقلال کو اگر زمانہ مختلف ہوتا تو مفید کاموں میں بھی استعمال کرسکتی تھی۔لہٰذا ہمیں اس کے سوانح نگار کی جانبدارانہ اور غیر ہمدردانہ رائے پر آنکھ بند کرکے اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔کیونکہ اس کی ہمدردیاں قدرتی طور پر بیگم دشمنوں کے ساتھ تھیں۔اس لیے کہ خود اس کے مزلی لیفٹینٹ شیکسپیئر نے اس کا تختہ الٹنے کی مہم میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

باقی رہا منا جان کی تخت نشینی کا حق اور اس کی مشکوک ولدیت تو اس کے بارے میں اس کتاب میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جو نقطہ نظر مصنف نے اختیار کیا ہے وہ انگریزوں کا تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جو مواد اس نے دیا ہے اس سے یقینی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منا جان شاہی نسل سے نہیں تھا۔اس وجہ سے اس کا تخت پر کوئی حق نہیں تھا لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ نقطہ نظر اس مسئلہ کے دوسرے پہلو کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

اپنی کتاب ''حکومت اودھ کے اندر سفر'' میں لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل سلیمنؔ نے تختہ حکومت الٹنے کی مہم کے بارہ سال بعد منا جان کے دعوے کی حمایت کی ہے۔یہ امر قابل لحاظ ہے کہ سلیمنؔ کو اس بحث کا جوش ٹھنڈا پڑ جانے کے بعد ایسے عمدہ مواقع میسر تھے کہ وہ بے لاگ رائے قائم کرسکتا تھا اور یہ کہ کرنل سلیمنؔ جیسا ذمہ دار انگریز افسر

ایسے اہم معاملہ میں اپنے پیشرو کرنل ''لو(Low)'' اور لیفٹیننٹ شیکسپیئر سے کبھی اختلاف نہیں کرسکتا تھا تاوقتیکہ اس کے پاس ایسا کرنے کے معقول وجوہ نہ ہوں۔ چونکہ جو دلائل اس نے پیش کیے ہیں وہ اس نوجوان دعویدار کے دعوے کی حمایت میں بہت ہی وزنی ہیں۔ اس لیے میں اس کی کتاب کے چند مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں۔ کرنل سلیمن لکھتا ہے:

''شاہی خاندان کے بہت سے افراد جو متوفی بادشاہ نصیر الدین حیدر کے ساتھ بچپن سے پرورش پائے ہوئے تھے اور جو آخر تک اس سے قریب تر رہے۔ بیان کرتے ہیں کہ منا جان اسی کا بیٹا تھا''۔

آگے چل کر لکھتا ہے:

''متوفی بادشاہ کا یہ بیان کہ اس نے افضل محل مادر منا جان سے مجامعت ترک کردی تھی قطعی غلط تھا۔ افضل محل گو نیچ ذات کی تھی لیکن ایک عیاش کے محل میں ان لوگوں میں جو اسے اچھی طرح سے جانتے تھے خاصی شہرت اور نیک نامی کی مالکہ تھی جو اَب تک اپنی مصیبت کے ایام میں بھی برابر قائم رہی۔ قید میں اور اپنی وفات کے وقت تک بادشاہ بیگم نے اعلان کیا ہے کہ اس نے اس لڑکے کو پیدا ہوتے دیکھا تھا۔ اور یہ قصہ اس لیے گھڑا گیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ذریعہ بادشاہ سے ملاپ نہ کرنے پائے اور اس کی غیر معمولی محبت اس سے کبھی کم نہ ہوئی''۔

سلیمن مزید لکھتا ہے:

''وہ لڑکا نمایاں طور سے صورت شکل میں نصیر الدین سے مشابہت رکھتا تھا اور اسی کی طرح افتاد طبع اور مزاج رکھتا تھا''۔

ان اقوال کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بات مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ اس کتاب کے مصنف کے مجموعہ دلائل پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرلیا جائے۔ اس لیے ہمیں دونوں پہلوؤں کو ہوشیاری سے میزان میں رکھنا چاہیے تب ہم کوئی رائے قائم کریں۔ ''اودھ پر مضامین'' کی کتاب سے ہمیں اس موضوع پر بہت سا مواد دستیاب ہوتا ہے۔ اگرچہ مندرجہ اطلاع وہی ہے جو اس کتاب میں شامل ہے تاہم یہ اِن معدودے چند مطبوعات سے ہے جو تاریخ اودھ پر شائع ہوئی ہیں اور غلط رائے قائم کرنے سے بچنے کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ یہ ترجمہ بالکل لفظی نہیں ہے باوجود اس ادعا کے کہ وہ سادہ اور بے تکلف زبان لکھ رہا ہے ہمارے مصنف نے بے معنی اور غیر ضروری ملحقات لکھنے اور بے کار تکرار لفظی سے اجتناب نہیں کیا ہے جنہیں میں نے ترجمہ میں چھوڑ دیا ہے۔ ایک سلیس اور قابل مطالعہ داستان لکھنے کی خواہش نے اس بات پر آمادہ کیا تاکہ تاریخ اودھ کو مقبول عام بنایا جائے اور میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ عبارت آرائی کے ساتھ لفظی ترجمہ کر کے بے مصرف کوشش کروں۔

محمد تقی احمد

لکھنؤ۔ ۱۵ جون ۱۹۳۸ء

تاریخ بادشاہ بیگم

گزشتہ اور موجودہ طبقہ امرا کے متعلق گفتگو کے دوران لیفٹیننٹ جان ڈاوڈ ① شیکسپیئر نے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمایندے کرنل ② جان لو متعینہ دربار اودھ کے سیکنڈ اسسٹنٹ تھے اور جنہیں تاریخ کا وہ ذوق تھا جو ایک انگریز کو ہوتا ہے یہ تجویز پیش کی کہ بادشاہ بیگم کے ملازمین سے کوئی شخص بیگم کی سوانح عمری لکھے جس میں اس کی زندگی سے متعلقہ حالیہ واقعات بھی بیان کیے جائیں۔

بنا بریں راقم الحروف عبدالاحد ③ ولد محمد فائق مرحوم نے اس کا بیڑا اٹھایا۔

---

① یہ بنگال سول سروس کے ٹالیاٹ شیکسپیئر کا بڑا بیٹا تھا اور مشہور ناول نویس تھیکرے اس کا حقیقی چچازاد بھائی تھا۔ کرنل نیوکم ناول میں اس کے خدوخال بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اس کی بہن آگسٹہ لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل لو کو بیاہی تھی جس کی ماتحتی میں خود شیکسپیئر نے بطور سیکنڈ اسسٹنٹ کام کیا تھا بادشاہ اودھ نصیر الدین حیدر کی وفات کے بعد جو واقعات ۷ اور ۸ جولائی ۱۸۳۷ء کی درمیانی رات میں لکھنؤ کے شاہی محل میں رونما ہوئے اس میں شیکسپیئر نے نمایاں کردار ادا کیا تھا جس کا تفصیلی بیان اس واقعہ سے متعلق باب میں آئندہ آئے گا۔

② جان لو (۱۸۸۰۔۱۷۸۸ء) اینڈریوز یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا۔ ۱۸۰۴ء میں مدراس میں کیڈٹ مقرر ہوا تھا۔ اوائل عمر سے اس نے مختلف ملازمتیں کیں۔ مہد پور میں مرہٹوں کی مشہور شکست کے وقت وہ موجود تھا۔ ۱۸۳۱ء میں لکھنؤ میں بطور ریزیڈنٹ تعینات ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں نصیر الدولہ کو جو بعد میں محمد علی بادشاہ کہلایا۔ اسی نے اودھ کے تخت سلطنت پر بٹھایا اور اس طرح اس نے بادشاہ بیگم کو اس کے اس اقدام میں کہ ایک جھوٹے دعویدار کو تخت نشین کیا جائے شکست دے دی۔ صلہ خدمات میں وہ ۱۸۳۰ء میں سی۔ بی۔ پھر کے۔ سی۔ بی اور بعد میں جی۔ سی۔ ایس۔ آئی سے نوازا گیا۔

③ عبدالاحد رابطؔ پسر محمد فائق نواح لکھنؤ کے مقام امیٹھی کے ساکن تھے ان کے والد نے انہیں فارسی پڑھائی اور فرنگی محل لکھنؤ میں عربی کی تحصیل کی۔ پھر ریزیڈنٹ لکھنؤ کے دفتر میں سرشتہ دار رہے وہ اچھے شاعر اور عمدہ نثر نگار تھے۔ رابطؔ تخلص تھا ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں بمقام امیٹھی وفات پائی۔

بارہ سال میں نے کمپنی کی ملازمت کی ۔لیفٹیننٹ شیکسپیئر مجھ پر ہمیشہ مہربان رہے۔ میں نے ابتداء سے آخر تک واقعات کی اچھی طرح چھان بین کی ہے اور ان کی صحت وصداقت کو جانچا اور پرکھا ہے پھرانہیں ضبط تحریر میں لایا ہوں۔

کتاب کا نام''وقائع دل ① پذیر'' رکھا ہے اگر اس میں مصنف کے نام کا اضافہ کردیا جائے تو اس سے کتاب کی تاریخ تکمیل نکل آتی ہے۔

عام رواج کے خلاف میں نے استعارات وتلمیحات سے اجتناب کیا ہے تا کہ الفاظ کے صحیح مطالب کے بارے میں شبہات نہ رہیں اور نہ ان کے معنی میں کوئی تذبذب ہو، تاہم اگر کہیں غلطی رہ گئی ہو تو التجا ہے دانشمند معاف فرمائیں گے۔

① ابجد کے قاعدے سے''وقائع دل پذیر عبدالاحد'' سے ۱۲۵۳ھ برآمد ہوتا ہے جو تکمیل کتاب کی تاریخ ہے۔

بادشاہ بیگم کی شادی کا بیان اور دیگر متعلقہ واقعات

ابوالمظفر معزالدین شاہ زماں غازی الدین حیدر شاہ اودھ:

آصف الدولہ کے زمانہ ۱۱۸۸ھ تا ۱۲۱۲ھ میں سعادت① علی خاں نے لکھنؤ میں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ اپنی تدبیروں میں ناکام ہو گئے تھے۔

① سعادت علی خاں برادر آصف الدولہ لکھنؤ میں ایک سال رہے یعنی ۷۶-۱۷۷۵ء میں اور آصف الدولہ کے نائب مختار الدولہ کے قاتل بسنت سے سازش کی۔ تین ہمعصر وقائع نگاروں میں سے مصنف ''عماد السعادت'' نے سعادت علی خاں کی سازش کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ ان کو سازش سے مبرا قرار دیا۔مگر دوسرے دو مصنّفین سیر المتاخرین اور تفصیح الغافلین صاف کہتے ہیں کہ سعادت علی خاں سازش میں شریک تھے جس کا مقصد آصف الدولہ اور مختار الدولہ کی زندگیوں کا خاتمہ کر کے انہیں (سعادت علی خاں) کو اور بسنت کو ان کی جگہ علی الترتیب بٹھانا تھا۔

عماد السعادت میں لکھا ہے: ''تفضّل حسین خاں علامہ......بحضور آقائے خویش آمدہ سخن بہ کرسی تقریر جاداد آنجناب (نواب یمین الدولہ) فرمود کہ مراچہ ضرور کہ دست گرفتہ غلام (بسنت) گفتہ شوم تا خدا نخواہد ہیچ نمی شود''۔

سیر المتاخرین میں ہے کہ:

''بسنت خواجہ سرائے مذکور کہ بہ جرنیلی مشہور بود برداعیہ آصف الدولہ بے پردہ خواست کہ بطورے قابو یافتہ کار مختار الدولہ را با تمام رساند فی الجملہ رضائے آصف الدولہ دریں خصوص حاصل نمودہ باطنا با میرزا سعادت علی ہم ساز شئے کرد کہ ہرگاہ من مختار الدولہ را تمام کنم شما علی الغفور با چند کسے کہ دارید سوار شدہ حاضر آیند من ادرا کشتہ حضور آصف الدولہ خواہم رفت در مہماں گری کار او ہم باتمام رسانیدہ شما را بر وسادۂ ایالت خواہم نشانید''۔(جلد ۳ ص ۹۴۵)

تفصیح الغافلین (مترجمہ ہوئی) میں ہے کہ:

''مرزا سعادت نے تفضّل حسین کے ایما پر عمل کرتے ہوئے بسنت سے مل کر سازش کی بہت کچھ بحث مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ بسنت آصف الدولہ اور مختار الدولہ دونوں کو راستے سے ہٹا دے تاکہ سعادت علی خاں اپنے بھائی (آصف الدولہ) کا جانشین بن جائے اور بسنت اس کا وزیر جنگ اور وزیر مال بنے''۔ ==>

لکھنؤ چھوڑ کر وہ پہلے شاہجہاں آباد (دہلی) پھر بنارس چلے گئے۔ سعادت علی خاں جب بنارس میں مقیم تھے۔ مبشر خاں منجم الملک پسر مشرف خاں جو محمد شاہ بادشاہ کی رصدگاہ کے مہتمم خیر اللہ خاں کے بہترین شاگردوں میں تھے بنارس میں وارد ہوئے مبشر خاں کی اولاد میں بادشاہ بیگم نام ایک بیٹی تھی جسے وہ اپنے دوسرے بچوں سے زیادہ چاہتے تھے اور اپنی اس بیٹی کو علم نجوم کی نظری اور عملی تعلیم انہوں نے بہت اچھی دی تھی۔ سعادت علی خاں کو معلوم تھا کہ منجم الملک رضوی سید ہیں اور ان کے خاندان کا نکاس مشہد سے ہے لوگوں میں ان کی بڑی عزت و توقیر تھی انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مبشر خاں اپنی بیٹی کی شادی ان کے بیٹے غازی الدین حیدر سے کر دیں اور ہندوستانی رواج کے مطابق ڈولہ کی رسم ادا کی جاوے لیکن منجم الملک نے یہ پیشکش نامنظور کر دی کیونکہ وہ اس طرح کے تعلق کو اپنی خاندانی حیثیت سے فروتر سمجھتے تھے۔ صاف انکار سے بچنے کے لیے انہوں نے کہا کہ:

''صرف اس صورت میں اپنی رضامندی دے سکیں گے کہ یہ رسم شادی امراء کے خاندانوں کے مروجہ رسوم کے مطابق عمل میں لائی جائے''۔

نواب (سعادت علی خاں) راضی ہو گئے۔ چنانچہ ۱۲۰۹ھ مطابق ۹۵۔۱۷۹۴ء میں اپنے سب سے بڑے بیٹے کی شادی جو ۱۸۱۴ء میں ''ابوالمظفر معز الدین شاہ زمن غازی الدین حیدر شاہ بادشاہ غازی'' کے القاب سے تخت پر بیٹھے بادشاہ بیگم سے کر دی۔

==> تفضّل حسین خاں علامہ عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی و لاطینی زبانیں بھی جانتے تھے نیوٹن کی ڈفرنشل کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا وہ مرزا سعادت علی خاں کے ''اتالیق و مربی و معلم'' تھے۔ (سیر المتاخرین) بسنت کا پورا نام و لقب بسنت علی خاں خواجہ سرا تھا جو جرنیل کہلاتا۔ ادنیٰ طبقہ کا شخص تھا۔

شادی کو کچھ بہت عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک بیٹی پوتی بیگم پیدا ہوئی وہ بعد میں توپ دروازے کے نواب علی مہدی خاں کو بیاہی گئی ان میاں بیوی (علی مہدی و پوتی بیگم) کے یہاں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بیٹا محسن الدولہ کہلایا اس کی شادی موجودہ بادشاہ محمد علی شاہ کی بیٹی سے ہوئی۔ دونوں بیٹیاں وزیرؔ بیگم اور حاجیؔ بیگم ابوطالب خاں کے بیٹوں کو بیاہی گئی تھیں۔وہ وفات پا چکی ہیں۔

بادشاہ بیگم سے شادی ہونے کے کچھ عرصہ بعد غازی الدین حیدر کی طبیعت اپنی بیوی کی ایک باندی پر آ گئی جو صبح دولت کہلاتی تھی اسے حمل رہ گیا۔بادشاہ بیگم کو جب یہ حال معلوم ہوا وہ غصہ اور جلاپے سے آپے سے باہر ہوگئی۔

۲۲ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ کو جب بچہ پیدا ہوا بادشاہ بیگم اور بھی غضبناک ہو گئی اور نومولود کی ماں صبح دولت کو حد درجہ قساوت و بے رحمی سے مروا ڈالا پھر جھنکر باغ کے قبرستان میں جو غربا کے لیے مخصوص تھا دفن کرا دیا۔نصیر الدین حیدر یعنی اس بچے نے جو بعد میں اودھ کا بادشاہ ہوا اپنی ماں کی قبر پر مقبرہ بنوا دیا۔ماں کو قتل کرانے کے بعد بیگم نے بچے کو بھی مار ڈالنے کی تجویز کی مگر فیض النساء① نے جو بیگم کے داروغہ محل میر فضل ② علی کی خالہ تھی بہت منت سماجت کی اور اس گھناؤنے گناہ کے ارتکاب سے اسے باز رکھا۔

بعد میں اس بچے کا نام نصیر الدین حیدر رکھا گیا بیگم بہت جلد اسے پیار و محبت کرنے لگی اور ایسی شفقت سے اس کی پرورش کی کہ سوتیلے بچوں کے ساتھ مادرانہ محبت

① فیض النساء بادشاہ بیگم کی خاص ملازمہ ہر کام کاج میں دخیل تھی۔
② آغا میر کے ۱۸۲۷ء میں معزول ہو جانے کے بعد بادشاہ بیگم کی تحریک پر میر فضل علی نائب السلطنت یعنی وزیر مقرر ہوا اور ۱۸۲۹ء میں جب اس پر بادشاہ کا عتاب ہوا اس کے چند دن بعد ہی مر گیا۔

کی ایک نادر مثال قائم کردی۔

بیگم کے باپ مبشر خاں نے عملی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ وہ ہر سال نئی جنتری تیار کر لیتے اور امراء اہل دولت کو نذر کر دیتے جو انہیں چھوٹے بڑے انعامات پانچ روپے سے پانچ ہزار تک عطا کرتے تھے اور یہی مبشر خاں کا ذریعہ معاش تھا۔

شیعہ مذہب میں بیگم کی نئی نئی بدعتیں

واضح رہے کہ بادشاہ بیگم اگرچہ مذہبی رسموں، رواجوں اور تقریبوں کی شدت سے پابند تھی مگر اپنے مذہب میں نئی نئی بدعتیں ایجاد و اختراع کرنے کی بھی بے حد شائق تھی۔ علاوہ ازیں بہت تند مزاج، سرکش اور من چلی تھی۔ اس کی طبیعت اور مزاج کی صحیح صحیح کیفیت بیان کرنے کے واسطے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ غصہ اس کا اس درجہ ہیجانی ہوتا تھا کہ غازی الدین حیدر اس کا شوہر مارے ڈر کے اس کے تابع ہونے پر مجبور تھا اور جب یہ بات زیادہ دنوں تک وہ برداشت نہ کرسکا تو بالآخر اس سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ اپنے جاہ وجلال اور قوت واقتدار بڑھانے کی وہ اتنی زیادہ حریص و دلدادہ تھی کہ کوئی چیز اسے مطمئن نہ کرسکتی تھی سوائے اس کے کہ ساری سلطنت اس کی مٹھی میں ہو۔

میں پہلے ان بدعات و اختراعات کا بیان کروں گا جو اس نے جاری کیں پھر بعد میں اس کی فطرت اور سیرت کی دیگر خصوصیات کا ذکر کروں گا۔

پہلی بدعت: امام مہدی کی چھٹی:

پہلی بدعت جو بادشاہ بیگم نے شیعہ مذہب میں قائم کی وہ امام مہدی کی چھٹی منانے کی رسم تھی۔ یہ رسم ہندوستان میں بچے کی پیدائش کے چھٹے دن ادا کی جاتی ہے۔ اس دن زچہ و بچہ کو نہلایا جاتا ہے۔ تمام رشتہ دار مدعو ہوتے ہیں، گانا بجانا اور دعوتیں ہوتی ہیں۔ زچہ و بچہ کو عمدہ، نفیس اور نئے نئے قیمتی لباس پہنائے جاتے ہیں۔ بیگم نے امام مہدی کی چھٹی کی یہ رسم اختراع کر کے اس ہندی رسم کو ولادت مہدی سے متعلق کر دیا۔

ہر سال ماہ شعبان میں وہ یہ رسم مناتی، بڑی بڑی کثیر رقمیں اس پر صرف کی جاتیں اور بیگم انتہائی احتیاط کے ساتھ اس کے پروگرام کی ہر ہر مد کے انجام دیئے جانے کی بذات خود نگرانی کرتی مبادا کوئی غلطی یا فروگذاشت رہ جائے۔

دوسری بدعت: اماموں کی فرضی بیویاں:

دوسری بدعت یہ تھی کہ خوبصورت لڑکیاں سیدوں کی محل میں لے آئی جاتیں وہاں ان کی کفالت و پرورش کی جاتی۔ اور وہ گیارہ[1] اماموں سے منسوب ہو کر ان کی بیویاں کہلاتیں۔ جو والدین خوشی سے اپنی لڑکیاں پیش کر دیتے تھے انہیں بڑی بڑی رقمیں ادا کی جاتی تھیں۔ والدین اگر بخوشی نہ دیتے تو لڑکیوں کو حاصل کرنے کے واسطے دیگر ذرائع اختیار کیے جاتے تھے۔ ہر لڑکی کا نام ایک ایک امام کی بیوی کے نام پر رکھا جاتا تھا اور یہ نام اسلامی تاریخ کی کتابوں کے مطالعہ سے تلاش کر کے رکھے جاتے تھے۔

اچھوتیاں:

ان سب لڑکیوں کو (جو اماموں کی فرضی بیویاں قرار پائیں) اچھوتی کہا جاتا تھا۔ ہندی زبان کے اس لفظ سے مراد انتہائی پاک و متبرک سے لی جاتی ہے جسے کسی کا ہاتھ نہ لگا ہو کہ چھونے سے ناپاک ہو جائے۔ یہ لفظ ہندوستانی خواتین کی بول چال میں مستعمل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا کا غیر معمولی احترام چونکہ پیغمبر صاحب کے گھرانے کے افراد ہونے کی وجہ سے کیا جاتا ہے لہٰذا ان نقلی شخصیتوں میں ان کی نمائندگی نہیں کی جاتی تھی۔

[1] شیعوں کے اماموں کے باقی گیارہ نام جن کی فرضی بیویاں بنائی جاتی تھیں یہ ہیں: حضرت حسن، حسین، علی زین العابدین، محمد باقر، جعفر صادق، موسیٰ کاظم، علی رضا، محمد تقی، علی تقی، حسن عسکری، امام مہدی۔

ہر اچھوتی کی خدمت کے لیے تین تین باندیاں مقرر تھیں۔صبح کو جب بیگم بیدار ہوکر اپنے بستر سے اٹھتی پابندی کے ساتھ پہلا کام وہ یہ کرتی کہ کسی اچھوتی کا درشن کرے کیونکہ اس کے خیال میں اچھوتیوں کے چہرے سب سے پہلے دیکھنا نیک شگون ہوتا تھا۔

وہ اچھوتیوں کا نہایت ادب واحترام کرتی، جب کسی کا ان میں سے اس کا آمنا سامنا ہوتا تو بیگم اس کے آگے جھک جاتی۔ وہ انہیں نہایت بیش قیمت لباس پہناتی، بڑے مزیدار کھانے کھلاتی اور جن چیزوں کی وہ خواہش کرتیں وہ فوراً مہیا کر دی جاتی تھیں۔

مگر بیگم ان کی شادیاں کرا دینے کے سخت خلاف تھی اگر کوئی ان میں سے سن بلوغ کو پہنچ جاتی اور شادی کرنے کی جانب مائل ہوتی تو بیگم اس کو یہ بات جتا دیتی کہ جب تم نے اپنے نفس کو ایسے مقدس امام کی نذر کر دیا ہے تو دوسرا شوہر قبول کرنا بڑی بے حرمتی و بے ادبی کی بات ہے۔مگر فطرتی تقاضے سے ان میں سے بعض کو شادی کرنے کی زبردست خواہش ہوتی چونکہ انہیں اس کی اجازت نہیں دی جاتی تھی اس لیے وہ بڑے دکھ سہتیں۔

ان میں سے ایک اچھوتی نے جسے خواہش نفسانی نے بہت ہی ستا رکھا تھا ایک رات ایک اچھی چال چلی۔ وہ اپنے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور زاروقطار رونے اور واویلا مچانے لگی۔محل کی دوسری سب خواتین اس شوروغل سے جاگ اٹھیں اور جلدی سے جا کر بیگم کو اس افسوس ناک واقعہ کی اطلاع دی۔بیگم اٹھ کھڑی ہوئی اور بذات خود حال معلوم کرنے کو چھپٹ کر آئی۔اس مکارہ نے بیگم کو بتایا کہ

”میں تو میٹھی نیند سو رہی تھی کہ اتنے میں امام صاحب کو خواب میں دیکھا وہ

بہت ناراض نظر آ رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ ہم نے تجھ کو طلاق دے
دی اس بات نے مجھے بے چین کر دیا ہے اور اسی دکھ واذیت سے میں اٹھ
بیٹھی ہوں اور اپنی اس بڑی محرومی پر رونے پیٹنے لگی ہوں کیونکہ اس
بدبختانہ محرومی سے میں بالکل ہی تباہ ہو جاؤں گی‘‘۔

بیگم نے یہ ماجرا سن کر اسے مع اس کے تمام قیمتی زیورات کے پالکی میں سوار کرا
کے اس کے باپ کے گھر بھجوا دیا۔

تیسری بدعت: اچھوت:

یہ تیسری بدعت اس نے اچھوت کی قائم کی۔ ہندی میں اچھوت سے بھی مراد
ایسے پاک ومقدس سے ہے کہ اسے ہاتھ نہ لگا ہو۔ اچھوتی اور اچھوت میں مذکر ومونث
کا فرق ہے۔ اچھوتی مونث ہے کیونکہ ہندوستانی میں یائے تانیث امتیازی علامت
مونث کی ہے۔ اچھوتی کی طرح لفظ اچھوت ہندوستانی خواتین کی عام بول چال میں
مروج ہے۔

چونکہ اچھوتوں کے متعلق میری معلومات کم تھیں صرف اتنا جانتا تھا کہ شاہی محل
میں یہ اصطلاح مروج ہے اس لیے خدام خاص سے دریافت حال کیا انہوں نے مجھے
بتایا کہ بیگم نے محل کے اندر ایک ایک کمرہ اماموں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جس میں
کسی شخص کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے ہر امام کے یوم پیدائش پر کمرے کو قیمتی
اشیاء سے سجایا وآراستہ کیا جاتا ہے اور بڑی خوبی وخوشنمائی سے روشنی کی جاتی ہے۔ بیگم
ہر طرح کا ادب واحترام بذات خود ملحوظ رکھتی ہے اور بہت جھک کر آداب وکورنش بجا
لاتی ہے اور زر نقد میں نذر پیش کرتی ہے۔ امام کی مفروضہ بیوی کو بیگم بیش قیمت لباس
وزیورات دیا کرتی تھی اور کمرہ کا آرائشی سامان باندیوں میں بانٹ دیتی تھی۔

چوتھی بدعت: اماموں کے مقبرے:

بیگم نے اپنے محل میں بارہ اماموں میں سے ہر امام کا مقبرہ بنوایا اور ہر مقبرے کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر کرائی۔ ان مقبروں کا نام ''روضہ دوازدہ امام'' رکھا گیا تھا۔ ہر مقبرے کے اندر ایک ضریح بھی رکھی گئی جو اس امام کے اصلی مقبرے کی نقل ہوتی تھی اور ساتھ ہی چند متبرک یادگاریں بھی۔ ان مقبروں کے علاوہ ایک اور عمارت بھی بنائی گئی تھی جو حضرت عباس[1] کے مقبرے کی نقل تھی۔

بیگم ہر امام کی وفات کی تاریخ پر دن رات ان کی پوجا و پرستش اور عبادت میں مشغول رہتی اور فاتحہ و درود پر بڑی رقمیں خرچ کرتی تھی۔ اور ان مشرکانہ رسموں کی ادائیگی کو اپنی روحانی اور دنیاوی بہتری کا موجب گردانتی تھی۔

پانچویں بدعت: شاہ جنات کا بیگم پر آنا:

پانچویں بدعت یہ تھی کہ بیگم کا عقیدہ تھا کہ شاہِ جنات اس کے سر پر آتا ہے۔ ان مواقع پر وہ سب سے زیادہ بیش قیمت لباس اور زیورات پہنتی عمدہ عمدہ عطر اور خوشبوئیں لگاتی اور نہایت ستھرائی و نفاست سے تخت پر بیٹھتی تھی۔ اس کے چاروں طرف ڈومنیاں کھڑی ہو کر گانے گاتیں اور وہ خود اپنے سر کو گھماتی اور اس طرح جھومتی گویا اس پر شاہ جنات کا اثر ہو رہا ہے جب وہ اس کیفیت میں ہوتی تو جو لوگ وہاں موجود ہوتے ان کے سوالات نیز اگلے پچھلے حالات کے بارے میں جوابات دیا کرتی تھی۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

[1] عباس بن علی بن ابی طالب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سوتیلے بھائی تھے جو کربلا میں مقتول ہوئے تھے۔ ان سے نسل باقی رہی ان ہی عباس کی پوتی نفیسہ خاتون بنت عبید اللہ بن عباس مذکور امیر یزید رحمہ اللہ کے پوتے عبد اللہ بن خالد بن یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کو بیاہی گئی تھیں ان کے بطن سے دو بیٹے علی و عباس ہوئے جن سے نسل چلی۔

اماموں کی تاریخ ولادت پر بادشاہ کا حاملہ بننا اور بچہ جننا:

مرزا نصیر الدین حیدر شاہ اودھ نے چونکہ بیگم کے زیر نگرانی تربیت پائی تھی وہ فرائض خمسہ ① اسلام کے مقابلہ میں ان واہی رسموں کی ادائیگی میں بہت مستعد اور چوکس رہتا تھا جب تک ان ماں بیٹے (بادشاہ بیگم اور نصیر الدین حیدر) کے تعلقات خوشگوار رہے سوائے خاص خاص افراد کے بہت کم لوگوں کو اس کا علم تھا کہ نصیر الدین حیدر ان رسموں پر کہاں تک اعتقاد رکھتا ہے۔

عام طور سے خیال کیا جاتا تھا کہ وہ محض بیگم کے توہمات کی خاطر ان رسموں کو بجا لاتا ہے لیکن جب آپس میں اختلافات رونما ہو گئے تو بادشاہ اپنے معتقدات کو راز میں نہ رکھ سکا اس نے ان رسومات کے بجالانے میں انتہائی دلچسپی کا اظہار کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ ان رسموں میں کچھ کمی کرتا یا کسی رسم کو ترک کر دیتا۔ اس نے اپنی طرف سے بھی کچھ اور رسمیں ایجاد کر کے ان میں اضافہ کر دیا۔ اس طرح شاگرد استاد پر بھی سبقت لے گیا۔

بادشاہ بیگم کی طرح نصیر الدین حیدر نے بھی بارہ اماموں میں سے گیارہ کی مفروضہ بیویاں بننے کے لیے عورتوں کو نامزد کیا نیز حضرت قاسم ② اور حضرت عباس ③ جیسی مذہبی ہستیوں کے لیے بھی فرضی بیویاں نامزد کیں۔

ہر امام کے یوم ولادت پر بادشاہ بذات خود حاملہ عورت کا پارٹ ادا کرتا تھا اور

---

① فرائض خمسہ میں کلمہ شہادت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ شامل ہیں۔بنی الاسلام علی خمسة کلمه شهادة ان لا اله الا الله وان محمد رسول الله واقام الصلوٰة وايتاء الزكاة وصوم شهر رمضان وحج البيت من استطاع اليه سبيلا۔

② یہ قاسم حضرت حسن بن علی بن ابی طالب کے بیٹے تھے کربلا میں ان کی شادی فاطمہ دختر حسین سے ہونے کی داستان محض اختراعی ہے اکثر شیعہ مورخین نے بھی اس کی تردید کی ہے۔

③ یعنی عباس بن ابی طالب جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

ایسا بنتا تھا گویا وہ وضع حمل کر کے دردزہ میں مبتلا ہے۔ جواہرات سے جڑی ہوئی گڑیا بطور فرضی بچے کے بادشاہ کی گود میں لٹا دی جاتی تھی۔منتخب خدام وہ کھانے تیار کرتے جو زچگی کے دنوں میں زچہ کو کھلائے جاتے ہیں یہی بادشاہ کو بھی کھلائے جاتے تھے۔اس مصنوعی حمل اور وضع حمل کے ایام میں کسی کو اجازت نہ تھی کہ بادشاہ کو چھو سکے۔

بادشاہ کا چھلا نہانا:

چھٹے دن بادشاہ زچہ عورتوں کی طرح چھٹی نہاتا تھا۔ ماماؤں میں سے ایک ماما اس فرضی بچہ کو بھی ایک گوشہ میں لے جاتی اسے کھڑا رکھتی اور دوسری کوئی ماما چند گھڑے پانی کے اس پر انڈیل دیتی۔اس طریقہ سے رواجی غسل کی فرضی رسم ادا کی جاتی تھی۔

ستارہ بینی:

چھٹی کے بعد والی رات کو بادشاہ شاندار زنانہ لباس پہن کر محل کے صحن میں فرضی بچے کو گود میں لیے نکل آتا۔ ستارہ① بینی کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ان رسوم کے ادا ہونے کے بعد فرضی بچہ کو ایک اعلیٰ شاندار بستر پر جس میں جواہرات ٹکے ہوتے تھے بٹھا دیا جاتا اور پورے آداب کے ساتھ نذریں پیش کی جاتی تھیں پھر بے شمار قابیں بہت سے اقسام کی مزیدار کھانوں اور مٹھائیوں کی لائی جاتیں، فاتحہ پڑھی جاتی اور خاص خاص لوگوں خصوصاً خدمت گارنیوں کو تقسیم کر دی جاتی تھیں۔

اماموں کی فرضی بیویوں کی زچگی:

لیکن گیارہ اماموں کی فرضی بیویوں کے واسطے (بچہ جننے کے لیے) سونے کی گڑیاں ہوتی تھیں اور دوسرے مذہبی پیشواؤں کی بیویوں کے لیے چاندی کی۔ یہ

① مسلمان گھرانوں میں چھٹی کے بعد یہ رسم منائی جاتی ہے۔زچہ قیمتی پوشاک پہنتی ہے۔قرآن اس کے سر پر پھیرایا جاتا ہے۔پھر وہ ستارے دیکھنے کے لیے صحن میں لائی جاتی ہے۔

امتیاز اس احترام کے مطابق ہوتا تھا جو ان کا مذہبی پیشوا ہونے کی حیثیت سے ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ خود اماموں کے بچے کی ولادت کے ماسوا اگر ان کے گھروں میں سے کسی اور کے یہاں بچہ پیدا کرایا جاتا تھا تو یہ خواتین ہی ان مواقع پر بچہ کی ماں بنتیں اور فرضی بچہ جنتی تھیں۔

زنانی پوشاک میں بادشاہ کا جلوس:

جس دن ایام زچگی کی مدت ختم ہو جاتی بادشاہ اعلیٰ نسوانی پوشاک پہن کر اور نہایت درجہ آراستہ پالکی میں سوار ہوکر شہر کا چکر لگاتا تھا اس کے ساتھ ساتھ بڑے دھوم دھام سے شاندار جلوس نکلتا اور نہایت ہی لذیذ قسم کی مٹھائیوں کے خوان ہوتے تھے۔ ایام زچگی میں کوئی معین مدت نہ تھی۔ کبھی ایک ہفتہ کی، کبھی دس دن اور کبھی اس سے زیادہ کی مدت ہوتی تھی۔

لکھنؤ میں اچھوتیوں کا طبقہ:

مذہبی تضحیک و بے حرمتی کی یہ رسم رفتہ رفتہ اتنی عام ہو گئی شہر (لکھنؤ) کی بعض عورتیں بھی اچھوتیین کہلانے لگیں پھر تو ان کا ایک طبقہ ہی بن گیا۔ ایسے گھرانوں کے مردوں نے بھی مردانہ صفات سے دست کشی اختیار کر لی، یہ لوگ عورتوں کی سی بولی بولتے، عورتوں ہی کے سے حرکات وسکنات کرتے اور عورتوں ہی کے سے لباس پہنتے۔[1]

① آصف الدولہ وسعادت علی خاں کی نوابی کا زمانہ چالیس اکتالیس ہی برس رہا وہ جو کہتے ہیں کہ جو بھی عیب سلطان (حکمران) کے پسند خاطر ہو ہنر بن جاتا ہے ان کے درباریوں میں ان شاء اللہ خاں انشاءؔ وغیرہ شعراء مٹک مٹک ریختیاں پڑھتے ہنستے ہنساتے عام لوگوں میں چرچا ہوتا اسی کی ریس کرتے انشاء نے سعادت علی خاں کے روزہ رکھنے پر عورتوں کی طرح دوپٹہ اوڑھ کر جب یہ شعر پڑھا تھا۔

میں ترے صدقہ نہ رکھ اے میری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

نواب بے اختیار ہنس پڑے تھے ہر کہ ومہ کی زبان پر یہ شعر چڑھ گیا اور انشاء وسعادت یار خاں رنگین وجان صاحب وغیرہ کی یہ ریختیاں عام لوگوں کی زبان پر چڑھ گئیں رفتہ رفتہ زنانہ مزاجی بزدلی و بے ہمتی عوام میں پیدا ہوگئی اور ساری سماج متاثر ہوئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ وفاطمہ رضی اللہ عنہا کی مورتیاں بنا کران کی شادی منانا:

اسلامی کتب تاریخ سے اماموں کی شادیوں کی تاریخیں بھی چھانٹ لی گئیں اور ان کے مطابق ساچق① وحنا بندی② کی رسمیں ادا کی گئیں۔

خاص خدمت گارنیوں میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ

''یکم محرم کو جس دن حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوئی تھی۔ پورے قد کی دو مورتیاں ایک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام کی اور دوسری ان کے شوہر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کی بنا کر بیش قیمت زردوزی اور کارچوبی کام کے بستر پر بٹھادی جاتی تھیں۔اوران کے نکاح کی رسم کی ادائیگی کے بعد نذریں پیش کی جاتی تھیں۔اور لوگ کچھ عرصہ کے واسطے تعظیماً کھڑے رہا کرتے تھے۔ اس کے بعد نہایت عمدہ قسم کی مٹھائیاں اور کھانے لائے جاتے تھے اور فاتحہ خوانی کر کے خادماؤں میں تقسیم کر دیتے تھے''۔

میں جب ان مذہبی بے حرمتیوں کا خیال کرتا ہوں تو خدا کے خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ ان باتوں کے خلاف کچھ رائے زنی کر سکے۔اسے لیے کہ اس میں بادشاہ کی بے ادبی کا ڈر لگا رہتا تھا۔

خود بادشاہ نے بھی بیگم کی مثال کی پیروی کرتے ہوئے اپنی نئی حویلی (فرح بخش③) کی برابر بارہ مقبرے اماموں کے مقبروں کی نقل میں مع ایک چھوٹی مسجد کے

① شادی سے ایک دن پہلے یہ رسم ادا ہوتی ہے، دلہن کو پوشاک اور تحفہ تحائف ومٹھائی دولہا کی جانب سے دلہن کے یہاں بھیجی جاتی ہے۔ ② مہندی کی رسم ساچق سے ایک دن پہلے ہوتی ہے۔
③ فرح بخش شاہان اودھ کا شاہی محل تھا جرنل مارٹن نے اصل میں اسے تعمیر کرایا تھا۔سعادت علی خاں نے شدید بیماری کے بعد تبدیل آب وہوا کے لیے اس میں عارضی طور سے قیام کیا تھا۔صحت یابی کے بعد اسے خرید لیا اور ''فرح بخش'' سے موسوم کر دیا۔

تعمیر کرائے۔ ہر ایک مقبرہ کی مسجد میں ضریح کی متبرک یادگاریں رکھی جاتی تھیں۔ نقلی مزار حضرت عباس کی یاد میں لوہے کا ایک مزار بھی بنایا گیا تھا۔ بیگم کے بنوائے ہوئے مقبروں کے مقابلہ میں بادشاہ کے بنوائے ہوئے مقبرے زیادہ شان سے آراستہ کیے گئے تھے۔ کیونکہ بادشاہ کا خیال تھا کہ اس سے اس کی زیادہ فلاح ہوگی۔

چہلم تک بیاہ شادی کی ممانعت:

میر احسان علی مرثیہ گو نے جو یمین الدولہ سعادت علی خاں کے زمانہ میں تھا ایام محرم کے ماتم کی مدت چہلم تک یعنی ۲۰ ماہ صفر تک بڑھوالی تھی۔ حالانکہ سابق میں یہ مدت ۱۰ محرم تک ہوتی تھی۔ اس نئی رسم کے مطابق تعزیئے ۲۰ صفر کو دفن کیے جانے لگے۔

بیگم نے نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی کے پہلے سال یہ اعلان کر دیا کہ ماتم کی مدت آئندہ سے چہلم تک ہوا کرے گی اور ان ایام غمی میں کوئی شادی یا تفریحی پارٹیاں منعقد نہیں کی جائیں گی۔ اس کی خلاف ورزی عتاب شاہی کا باعث ہوگا اور اس کی علت میں سزا دی جائے گی۔ چونکہ یہ حکم مفاد عامہ کے منافی تھا لہٰذا ریزیڈنٹ نے مداخلت کر کے بڑی مشکل سے بادشاہ کو اپنا حکم منسوخ کرانے پر آمادہ کیا کیونکہ رعایا آزادی سے جس طرح چاہے اپنے مفاد کی خاطر عمل کرے۔ لیکن ذاتی طور پر بادشاہ اپنے مقرر کیے ہوئے عہد کے مطابق محرم کا غم چہلم تک منائے گا۔

سلطنت کی تباہی:

قصہ مختصر کہ بیگم کی دی ہوئی تربیت کے برے نتائج یہ ہوئے کہ بادشاہ اپنا تمام وقت ان رسوم کی ادائیگی میں صرف کرتا تھا اور سلطنت کے انتظامی اور مالی امور کی انجام دہی کے واسطے اس کے پاس کوئی وقت نہ تھا۔ شاہی فرائض سے اس غفلت کا نتیجہ

یہ ہوا کہ ریاست کے عمال نے خزانہ سرکاری میں تغلب کر کے اپنے نجی اخراجات میں روپیہ صرف کرنا شروع کر دیا۔ اس بری تربیت کے ایسے برے نتائج برآمد ہوئے کہ بالآخر سلطنت تباہ ہوگئی۔

بادشاہ کی فرائض سے غفلت اور افسروں کی چیرہ دستی سے جو مظالم رعایا پر ہوئے ان کا تفصیلی بیان کرنا ناممکن ہے۔ موجودہ بادشاہ کے زمانہ میں آغا مرزا کوکا اور دلجیت سنگھ خواص تھے۔ شاہی ملازموں نے نقد اور سامان کی صورت میں غبن کیا تھا جو ان کے مکانوں سے برآمد ہو کر ضبطی میں آیا وہ بہت بڑی مالیت کا تھا۔ اگر یہ دو شخص اتنی کثیر رقم کو اپنے تصرف میں لا سکتے تھے تو دوسروں کا پوچھنا ہی کیا جو اونچے عہدوں پر تعینات اور اعلیٰ تقریبات کی انجام دہی کے امانت دار تھے۔

اچھوتیوں کی آزادی:

نصیر الدین حیدر کی وفات اور بیگم کے معاملات کی بربادی کے بعد آخر کو اچھوتیاں جو کافی تعداد میں تھیں آزاد ہوگئیں۔ وہ محلات سے باہر نکلیں۔ شادیاں کیں اور زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوئیں۔

یمین الدولہ سعادت علی خاں کی وفات

رفعت الدولہ و رفیع الملک غازی الدین حیدر خاں بہادر شہامت جنگ کی تخت نشینی اور وزارت کی سلطنت میں تبدیلی:

۱۲۲۹ھ مطابق ۱۱ جولائی ۱۸۱۴ء کو چوتھائی رات گزارنے کے بعد یمین الدولہ سعادت علی خاں کا انتقال ہوگیا، کمپنی کے نمایندے کی معاونت سے موروثی مسند پر غازی الدین حیدر جانشین ہوئے۔ بادشاہ بیگم کو خطاب ''مریم العصمت، بلقیس السطوت، محل خاص نواب وزیر المما لک رفعت الدولہ رفیع الملک غازی الدین حیدر خان بہادر شہامت جنگ'' کا دیا گیا۔ مرشد زادہ یعنی نواب موصوف کے بیٹے کو خلعت ولی عہدی اور خطاب ''امتیاز الدولہ عمدۃ الملک نصیر الدین حیدر خان بہادر اسد جنگ'' عطا ہوا اور آغا① میر کو خلعت نیابت اور خطاب عمدۃ الدولہ مختار الملک سید محمد خاں بہادر ضیغم جنگ کا ملا۔ پرگنہ سلون (ضلع رائے بریلی۔م) بلقیس السطوت (بادشاہ بیگم) کو بطور جاگیر دیا گیا۔

① بشپ ہیبر جو ۱۰۲۶ء میں آغا میر سے لکھنؤ میں ملا تھا کہتا ہے کہ

''آغا میر ایک سیاہ فارم درشت مزاج شخص ہے ناک اس کی باز کی طرح مڑی ہوئی، اس کے لہجے بشرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضبط نفس کا عادی ہے اور سخت مزاجی کی فطری کشمکش بھی رکھتا ہے۔ ابتدا میں موجودہ بادشاہ کا خانساماں تھا''۔

ڈاکٹر اسپرائی اس کا معالج بیان کرتا ہے کہ

''آغا میر آغاز سلطنت غازی الدین حیدر میں عہدہ وزارت پر مقرر ہوا تھا اگرچہ ادنیٰ طبقے کا شخص تھا مگر ترقی پانے کے قابل تھا۔ طبعاً سریع الفہم اور عقل کا تیز تھا اور اپنے کام میں بہت انہماک رکھتا تھا گو اپنے ذاتی فائدے کو وہ کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ کئی برسوں تک وہ اپنے آقا پر غلبہ پائے رہا اور دربار لکھنؤ میں اس کا اثر قائم رہا۔

محل کے اندر کامل اختیارات شاہجہاں آباد (دہلی) کی ایک سیدہ خاتون کو دیئے گئے اور محل کے باہر اس کے بھتیجے میر فضل علی کو علاوہ انتظام جاگیر بادشاہ بیگم کلی اختیارات تفویض ہوئے اور معتمد الدولہ کو شاہی خاندان اور سلطنت کے انتظامی معاملات کے کامل اختیارات سپرد ہوئے۔

۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء میں نواب نظیر محمد آفرین علی خاں ① اور مرزا فخر الدین احمد ② عرف مرزا حاجی پسر مرزا جعفر مرحوم نے نواب غازی الدین حیدر پر اپنا پورا اثر جما لیا اور معتمد الدولہ کے خلاف شکائتیں کر کے نواب کے کان بھرے جس کے نتیجے میں معتمد الدولہ مورد عتاب ہوا۔

جن ایام میں یہ واقعات رونما ہو رہے تھے یہ اطلاع ملی کہ لارڈ موئیرا مارکوئیس آف ہسٹنگر گورنر جنرل فرخ آباد آنے والے ہیں چنانچہ نواب نے یہ طے کیا کہ ولی عہد بہ ہمراہی معتمد الدولہ و راجہ کشن ③ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور چند امور کے بارے میں مشورہ و ہدایت طلب کرے۔

① آفرین علی خاں نواب آصف الدولہ کا غلام تھا رفتہ رفتہ عروج پایا اور سلطنت میں بڑا با اثر ہو گیا ۱۸۱۷ء میں لکھنؤ میں فوت ہوا۔

② فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر کرنیل بیلی ریزیڈنٹ کا معتمد تھا اور اسی وجہ سے غازی الدین حیدر کی تخت نشینی کی موافقت میں اس نے اپنا اثر استعمال کیا۔ ۱۸۱۴ء میں وہ شکستہ دل ہو کر مرا کیونکہ وزارت کا عہدہ اسے نہ دیئے جانے سے اس کی خدمت کا معاوضہ نہیں دیا گیا تھا اس کا بیٹا مرزا حاجی جس نے اس اعلیٰ عہدے کو ایک بار اپنے باپ کی خاطر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا زیادہ خوش نصیب رہا کیونکہ باپ کے مرنے کے بعد کچھ عرصہ کے لیے عہدہ وزارت کے فرائض اسے سپرد کیے گئے تھے۔ یہ دونوں باپ بیٹے شاعری سے طبعی مناسبت رکھتے تھے مصحفی نے جو اِن کے ہمعصر تھے ریاض الفصحا میں نمونہ کلام نقل کیا ہے۔

③ دیا کشن کو غازی الدین حیدر نے منصب دیوانی کا عطا کر کے راجہ کا خطاب دیا تھا اس سے پہلے وہ راجہ جھاؤلال کی دیوانی کے زمانے میں واصل باقی نویس تھا اگرچہ دوسرے وزیر تفضّل حسین خاں نے اسے معطل کر دیا تھا لیکن آصف الدولہ نے دوبارہ تقرر اس کا کر دیا تھا۔

اب بعض اشخاص نے جو اس موقع کے منتظر تھے معتمد الدولہ کی غیر حاضری میں اس قسم کی اطلاعوں سے نواب کے کان بھرے کہ معتمد الدولہ کا رویہ ولی عہد کے ساتھ بے اعتنائی کا ہے اور اس سے ایسے بے جا اور تکلیف دہ واقعات بھی منسوب کیے جن سے اس کی بے وفائی وغداری آشکارا ہوتی تھی اس وجہ سے بادشاہ اس سے حد درجہ ناراض ہو گئے اور اس کی واپسی پر اسے قید میں ڈال دیا۔ کاروبار سلطنت اب نواب نظیر، اس کے کارندے خدا بخش اور مذکورۂ بالا مرزا حاجی کے حوالے کیے گئے۔

چونکہ اس مختصر سے مقالے کا مضمون مختلف ہے اس لیے اس بیان کو یہاں چھوڑ کر اصل داستان شروع کرتا ہوں۔

۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں معتمد الدولہ پر پھر ایک بار نظرِ عنایت ہو گئی اس نے دربار کو اپنے دشمنوں سے پاک صاف کیا اور سلطنت میں اپنا پورا اقتدار جما لیا۔ اسی سال گورنر جنرل کے ایما سے تخت و تاج کو ساہو بہاری لال مہاجن کے زیر انتظام لال و جواہر سے بہتر طور پر مزین کیا گیا۔ جان مانکٹن ریزیڈنٹ کی معرفت سرحدی اضلاع اودھ کے جو انگریز افسر فرخ آباد، کانپور، الٰہ آباد اور جونپور میں متعین تھے انہیں مدعو کیا گیا۔ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۱۸ء کو انگریز افسروں کے مواجہ میں نواب نے خودمختار بادشاہت کی حیثیت اختیار کر لی اور امرائے سلطنت کی پیش کردہ نذریں قبول کیں۔

الفاظ ''ابوالمظفر معز الدین شاہِ زمن غازی الدین حیدر شاہ'' شاہی مہر میں کندہ کیے گئے اور یہ شعر

سکہ زد برسیم وزر از فضل رب ذوالمنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہِ زمن

سونے اور چاندی کے سکوں پر ضرب کیا گیا۔ معتمد الدولہ کو وزیر کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا اور ولی عہد کو سلیمان جاہ کے لقب سے افتخار بخشا گیا۔

بادشاہ بیگم کی ہوس اقتدار

اپنی ہوس اقتدار کو پورا کرنے کے لیے بادشاہ بیگم کو ایک نئی ترکیب سوجھی۔ اس نے کہا کہ

''نیابت ولی عہد کا حق ہے''۔

لٰہذا تجویز کی کہ میر فضل علی کا تقرر حقدار نائب کے مددگار کی حیثیت سے امور سلطنت کی بہترین انجام دہی کا باعث ہوگا۔مگر باوجود اپنی تمام مساعی کے وہ کامیاب نہ ہوسکی۔معتمد الدولہ جو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخیل تھا اس ترکیب کو بھانپ گیا اور بادشاہ کو اس بات پر رضا مند کرلیا کہ وہ بیگم کے محل میں آنا جانا بند کردے۔

چند دنوں کے بعد جب اختلافات حد سے زیادہ بڑھ گئے تو محسن الدولہ بہادر اپنی خودسر دادی کو چھوڑ کر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوگیا۔اور بہ تعمیل حکم شاہی اپنے گھر والوں کے ساتھ مرزا حاجی کی حویلی میں رہنے پر رضا مند ہوگیا۔لیکن سلیمان جاہ نے باوجود سلطنت کے خاص خاص اہلکاروں کے سمجھانے اور ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے بیگم کو نہ چھوڑا۔معتمد الدولہ نے میر فضل علی پر قابو پانے کے پورے جتن کر ڈالے مگر کامیاب نہ ہوا۔

بیگم نے میر فضل علی کی مدد سے بہت سے لٹیرے بھرتی کیے جو دارالسلطنت (لکھنؤ) نیز اس کی اپنی جاگیر و پرگنوں اور دیگر قصبات سے جو اس کی عملداری میں تھے لائے گئے تھے تاکہ حسب ضرورت طاقت استعمال کرنے کی صورت میں ان سے کام لیا جاسکے۔معتمد الدولہ کے کانوں تک یہ بات پہنچی اور وہ اسے روکنے کی اور ساتھ

ہی بیگم کے محل میں میر فضل الٰہی کی حاضری کو مسدود کر دینے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے پھر بادشاہ کو بھڑکایا کہ بیگم سے کہہ دیں کہ میر فضل علی کو اس کے حوالے کر دیں اور درصورت عدم تعمیل حکم شاہی میر فضل علی کو بزور اسلحہ باہر نکال لیا جائے مگر باوجود اپنی انتہائی کوششوں کے معتمد الدولہ قطعی ناکام رہا۔

۲۴ ذیقعد ۱۲۳۷ھ (مطابق ۱۳ اگست ۱۸۳۲ء) شاہی فوجوں نے بیگم کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ اس پر بیگم نے اپنے متعینہ سپاہیوں کو شاہی فوج سے برسر جنگ ہونے کا حکم دے دیا اور فضل علی کو حکومت کے افسران کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ جب یہ جھگڑا غیر معقول حدود سے زیادہ بڑھ گیا اور شاہی نمائندوں نے دیکھا کہ بیگم حکم نہیں مانے گی تو مجبوراً یہ معاملہ قائم مقام ریزیڈنٹ کے گوش گزار کیا۔ ریزیڈنٹ نے کپتان ہومز کو تلنگوں کی دو کمپنیوں کے ساتھ محل بھیجا اور سید باقر علی میر منشی کو بھی بیگم کو تنبیہ کرنے کے لیے روانہ کیا تا کہ بیگم کو سمجھائیں کہ میر فضل علی کو بادشاہ کے حوالے کر دیا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دی گئی کہ اگر بیگم پھر بھی بضد ہو تو طاقت سے کام لیا جائے۔ کپتان اور میر منشی نے دن کا چوتھائی حصہ اس کوشش میں گزرا۔

آخر کار سلیمان جاہ کی وساطت سے بیگم نے میر فضل علی کو کپتان کے حوالے کر دیا۔ اور کہا کہ میں نے کمپنی کے اہلکاروں کی ذمہ داری پر ایسا کیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے وعدوں پر قائم رہنے کے لیے مشہور ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے امید ہے کہ میں جس وقت بھی میر فضل علی کو طلب کروں اسے میرے پاس بھیج دیا جائے گا۔ کپتان نے رضامندی ظاہر کی اور میر فضل علی اور اس کی پھوپھی فیض النساء کو پالکی میں سوار کرا کر انگریز سپاہیوں کی حراست میں لایا گیا۔

بادشاہ کے کارندوں نے ریزیڈنٹ کے سامنے اب یہ تجویز پیش کی کہ میر فضل

علی اور فیض النساء دونوں کو ان کے سپرد کر دیا جائے مگر ریزیڈنٹ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ میر فضل علی کی ملکیت کا سب سامان اور زر نقد جو کئی لاکھ روپیہ تھا شاہی افسروں نے خاص کر معتمد الدولہ کے آدمیوں نے لوٹ لیا اور برباد کر دیا اور اس کی مضبوط اور اچھی بنی ہوئی حویلیاں مسمار کر دیں لیکن بیگم کے ساتھ ایسی کوئی اذیت دہ کارروائی نہیں کی گئی اگرچہ بیگم کے دروازوں پر انگریزی سپاہیوں کا ان ہدایت کے ساتھ متعین کر دینا کہ سب دروازے آمد و رفت کے لیے مسدود رہیں ایک قسم کی قید نظر آتی تھی تاہم اس کا یہ اچھا نتیجہ نکلا کہ بیگم اور سلیمان جاہ کی جان و مال کی حفاظت ہوگئی۔

تھوڑے عرصہ کے بعد ۱۹ محرم ۱۲۳۸ھ مطابق دوشنبہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۲۲ء میر فضل علی اور فیض النساء دونوں کو ان ہی کی درخواست پر انگریزی سپاہیوں کی حفاظت میں شاہجہاں آباد (دہلی) بھیج دیا گیا۔ اس دن بڑا طوفان مچا۔ شاہی فرمان جن میں بیگم سلیمان جاہ اور میر فضل علی کی ملازمت کرنے کی ممانعت کی گئی تھی شہر میں جا بجا چسپاں کیے گئے ان کی نقول درج ذیل ہیں:

ا: فرمان شاہی پیشہ ور سپاہیوں اور مسلح اشخاص کے نام:

بذریعہ ہذا حکم دیا جاتا ہے کہ

''جو پیشہ ور سپاہی اور مسلح اشخاص ظاہراً یا خفیہ طور سے میرے بیٹے سلیمان جاہ کی ملازمت اختیار کریں گے ان کو غیر معینہ مدت کی سزائے سخت دی جائے گی اور ان کے مکانات ضبط کر لیے جائیں گے اس لیے انہیں چاہیے کہ اپنے مال اور اہل و عیال کو محفوظ رکھنے کی خاطر وہ ایسا نہ کریں''۔①

① مطبوعہ چھاپہ خانہ سلطانی لکھنؤ ۱۲ محرم ۱۲۳۸ھ۔

۲: فرمانِ شاہی بنام افسران فوج شاہی:

چونکہ نصیر الدین حیدر نے میر فضل علی کے شہ دینے پر مابدولت کی منشاء کے خلاف عمل کیا ہے میر فضل علی کو سزا کے طور پر پہلے قید کیا گیا پھر حکم دیا گیا کہ

''اپنے اہل وعیال سمیت وہ حدود سلطنت سے باہر نکل جائے لہٰذا حکم دیا جاتا ہے کہ ہمارے افسران فوج میں سے کوئی شخص نصیر الدین حیدر سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور نہ کوئی اس سے انعام یا تحفہ قبول کرے درصورت عدول حکمی قصور وار سزائے قید سخت، ضبطی مکان اور برخاستگی کا مستوجب ہوگا''۔①

۳: فرمانِ دیگر:

بذریعہ ہذا اعلان عام کیا جاتا ہے کہ

''میر فضل علی نے اپنی پھوپھی فیض النساء کی مدد سے جو خاص محل کی مغلانی تھی ڈیوڑھی میں ایک عہدہ حاصل کیا اور رفتہ رفتہ داروغہ کے عہدہ تک پہنچ گیا۔ چونکہ فضل علی ادنیٰ نمود کا تھا داروغگی کے عہدے پر ترقی پا جانا اس کے بے وفا اور نمک حرام ہو جانے کے لیے کافی ہو گیا اس نے شاہی گھرانے کی جاگیر اور ڈیوڑھی کا لاکھوں روپیہ خرد برد کر لیا۔

نہ صرف یہ بلکہ میر مذکور نے سلطنت کی تباہی کا منصوبہ بنایا اور فتنہ وفساد اور انقلاب پیدا کرنے کی خفیہ ریشہ دوانیاں کیں۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کی غرض سے اس نے میرے فرزند سلیمان جاہ کو بھی نافرمانی اور من مانی حرکات پر برانگیختہ کیا، اس کے دل میں مستقبل کے بارے میں باطل امیدیں بندھائیں اور اسے برے راستہ پر لگا دیا۔ اس نے شاہی

① مطبوعہ چھاپہ خانہ سلطان ۱۲ محرم ۱۲۳۸ھ۔

خاندان میں نفاق کے بیج بوئے، غلط فہمیاں پیدا کیں اور شاہزادے کو بہکایا کہ جملہ ملازمین کو ساتھ لے کر دارالحکومت سے باہر چلا جائے اور کسی اور جگہ قیام کرے۔ جو کچھ اس نے کیا اس کا ایک برا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہزادہ عمدہ تربیت اور مفید تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہو گیا۔

لیکن سلیمان جاہ نے بوجہ اپنی ناتجربہ کاری اور کم عمری ان برے نتائج کی پیش بینی نہیں کی اور فضل علی کی صلاح پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا۔ میر فضل علی نے اس سے آگے ایک قدم اور بڑھایا اس نے دارالحکومت ہی میں ایک فوج اکٹھی کر لی یہ حرکت شاہی عتاب کا موجب ہوئی جس کی بنا پر وہ قید کیا گیا۔

مزید برآں اس کے اعمال بد کی پاداش میں اس کو اور اس کے گھر والوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ لہٰذا یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جو کوئی اس قسم کی ناوفاداری اور بغاوت کا ارتکاب کرے گا اسے بہت سخت سزا دی جائے گی''۔①

جن دنوں بیگم کا محل زیر محاصرہ تھا وہ صرف ایسے کھانے پینے پر گزر کرتی رہی جو وہ خود یا اس کی پوتیاں حاجی بیگم وزیر بیگم تیار اور مہیا کرتی تھیں۔ وہ اس درجہ تہی دست تھی کہ اس کے بعض جانوروں کو دانہ چارہ بھی ساتویں آٹھویں دن ملتا تھا۔ اس کے بہت سے نوکر تو عتاب شاہی کے خوف سے اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے اور جو لوگ پھر بھی اس کے وفادار رہے وہ اسی کو نعمت الٰہی سمجھتے تھے کہ وہ دو دن کے فاقے کے بعد انہیں بھنے چنے کھانے کو مل جاتے تھے۔ یہ حالت اور کیفیت اس وقت تک رہی جبکہ مارڈنٹ ریکٹس لکھنؤ میں ریزیڈنٹ کی حیثیت سے آ گئے انہوں نے ان مصیبت زدوں کی طرف سے بیچ میں پڑ کر بادشاہ سے ان کو معافی دلوائی۔

① مطبوعہ چھاپہ خانہ سلطانی لکھنؤ ۱۲ محرم ۱۲۳۸ھ۔

ولی عہد کا بادشاہ سے میل ملاپ

۹ ذی الحجہ کو چار گھڑی رات گزرنے کے بعد امام بخش مروہے اور فتح علی کے بیٹے کو حکم ہوا کہ

''پیغام شاہی خفیہ طور سے ولی عہد کے پاس لے جائیں''۔

پیام رسانوں کے بھیجنے کے تھوڑی دیر بعد صاحب عالم (ولی عہد) محل سے برآمد ہوا اور پیغام بروں سے کہا کہ

''جو حکم بھی بادشاہ کا ہے اس کی تعمیل کرنے کو موجود ہوں''۔

فتح علی کے بیٹے کو اس خدمت کے صلہ میں چہار پارچہ کا خلعت اور امام بخش کو دوشالہ اور رومال عطا ہوئے اور یہ احکام جاری ہوئے کہ اگلی صبح سواریاں اور جلوس تیار رہے۔ وردیاں، پیٹیاں اور صافے خاص برداروں کو تقسیم کیے گئے۔

۱۰ تاریخ کو فتح علی خاں ① اور امرت لال ② ولی عہد کی خدمت میں حاضر ہوئے غرض بادشاہ نے بڑی محبت سے اسے سینہ سے لگا لیا اور چند نصیحتیں کیں۔ عین اسی وقت ریزیڈنٹ بھی آ پہنچے اور بادشاہ کے ایما سے وہ بھی بغلگیر ہوئے اس کے بعد جب

---

① یہ نواب سعادت علی خاں کے نہایت معتبر ملازموں میں سے تھا۔ اپنی امانت وصیانت کی بنا پر نامور ہوا اور سعادت علی نے شاہی خزانوں کا اسے مہتمم بنایا۔

② امرت لال سکسینہ کایستھ تھا۔ سعادت علی خاں کے عہد حکومت میں ملازمت میں آیا اور غازی الدین حیدر کے زمانے میں داروغگی دیوان خانہ پر ترقی پائی اس کے بعد کے دورِ حکومت میں اسے راجہ کا خطاب عطا ہوا۔ چونکہ یہ آغا میر کی پارٹی کا تھا اس وزیر کے زوال کے بعد اسے بھی قید میں ڈال دیا گیا اس نے مزید تعذیب اور تذلیل سے بچنے کے لیے ۱۸۲۸ء میں خودکشی کر لی۔

بادشاہ تخت پر بیٹھے صاحب عالم نے نذر پیش کی اور بہت ہی مطمئن ہو کر واپس لوٹ گیا۔راستے میں تین ہزار روپیہ گھر پہنچتے پہنچتے تقسیم کیے۔

اسی مہینے کی ۱۱ تاریخ کو بادشاہ نے ریزیڈنٹ کو پیغام بھیجا کہ

''صاحب عالم کے مکان پر سے سپاہی ہٹا لیے جائیں''۔

ریزیڈنٹ نے جواب میں کہلوادیا کہ

''منڈاوان کے کمان افسر کو اس بارے میں تحریر بھیج دی گئی ہے چنانچہ سپاہی ہٹا لیے گئے''۔

بادشاہ نے فوجی افسر انچارج کمپنی کو جو وہاں تعینات تھی تین ہزار روپیہ بطور انعام دیئے۔

بیگم کا ولی عہد کو عورتوں کی صحبت میں ڈالنا اور اس کا تنگ آ جانا

بیگم نے اب بھی صاحب عالم کو دربار شاہی میں حاضر ہونے یا شکار کھیلنے اور سیر سپاٹے کو باہر جانے سے روکے رکھا اور عورتوں کی صحبت میں اسے منہمک و مشغول کر دیا۔ بالآخر ولی عہد ان باتوں سے تنگ آ گیا اور ایک موقع پر بادشاہ سے چند امور پر گفتگو کرتے ہوئے اس نے بیگم سے اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا۔

بادشاہ نے اس بات پر حکم دیا کہ

''حیدرؔ باغ، شیش محل اور حسنؔ باغ کے محلات اور باغات کو خوب آراستہ کیا جائے اور انہیں ولی عہد کے قیام کرنے کے لیے تیار رکھا جائے''۔

پھر اس خیال سے کہ ولی عہد کو تنہائی محسوس نہ ہو نواب محسن الدولہ کو ہدایت کی گئی کہ

''ولی عہد کی صحبت و سنگت میں رہے''۔

اب معتمد الدولہ جو اپنے اثر کو بڑھانے کا سخت آرزومند تھا ایک نئی تجویز لے کر بادشاہ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ صاحب عالم اپنے دولت پوری کی بارہ دری میں جو نہایت عمدہ قسم کی تعمیر کی ہوئی اور خوب آراستہ ہے جا کر رہیں اور اس وقت تک وہاں سکونت کریں جب تک اعتماد باغ اور دوسری جگہوں کے شاہی محلات تعمیر نہ ہو جائیں بادشاہ نے رضامندی دے دی چنانچہ امرت لال عرض بیگی نے ولی عہد کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بات کی اطلاع دی۔ صاحب عالم، محسن الدولہ اور روشن الدولہ کی معیت میں بارہ دری کو فوراً روانہ ہو گیا۔ اس کی سواری کا جلوس دیکھنے کے

لیے تماشائیوں کا بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ولی عہد کے اصطبل کے گھوڑے فاقہ کشی کے مارے قریب المرگ ہو رہے تھے اور مشکل سے چند قدم تک اپنے سواروں کو لے جانے کے قابل ہو سکے۔

جب شہزادے کا حشم و خدم نزدیک آ پہنچا نواب معتمد الدولہ ان کے استقبال کے لیے نکلا جب وہ مسند پر بیٹھا تو وزیر نے نظر گزرانی۔ مہمان کی خاطر تواضع کے لیے ہر ممکن انتظام کیا گیا تھا۔ ۲۰ تاریخ کو بادشاہ کے حکم کے بموجب صاحب عالم بہ ہمراہی معتمد الدولہ بارہ دری سے سوار ہو کر حسن باغ پہنچے اور وہاں رہنے لگے۔

پھر روشن الدولہ اور معتمد الدولہ بادشاہ بیگم کے محل میں گئے صاحب عالم کی محل خاص سلطان بیگم کو مرزا رفیع الدین حیدر عرف منا جان کی انّا کے ساتھ اسی مقام پر پہنچا دیا۔ فتح علی عرض بیگی نے بیگم کی سواری کی بینڈ باجے کے ساتھ ساتھ حسن باغ تک رہنمائی کی روشن الدولہ اور معتمد الدولہ بادشاہ کی حضوری میں واپس پہنچ گئے۔ دو تین دن بعد بادشاہی فرمان کے بموجب کھانے کی قابیں جن کی تیاری میں سو روپیہ خرچ ہوئے صاحب عالم کو روانہ کی گئیں۔

سلیمان جاہ کے یوں چھوڑ کر چلے جانے کے بعد بادشاہ بیگم نے قطعی کھانا چھوڑ دیا۔ ساتویں صفر کو معتمد الدولہ بیگم کے محل پر پہنچا اور عاجزانہ درخواست کی کہ جو کھانے وہ بھیجے وہ انہیں براہ عنایت نوش کر لیں۔ بیگم راضی ہو گئی اور نواب مذکور بہت سی اقسام کے عمدہ عمدہ کھانے بیگم کے لیے مہینہ کی بارہ تاریخ تک بھیجتا رہا پھر بیگم کی خواہش پر یہ طریقہ بند کر دیا گیا کیونکہ بادشاہ نے دو لاکھ روپیہ کی رقم بیگم کو عنایت کر دی تھی۔

اس کے بعد بادشاہ بیگم نے خواص مسماۃ رجبی اصیل کو دو جوڑے کپڑوں کے اور سات ہزار روپیہ دے کر سلیمان جاہ کے پاس بھیجا اور وعدہ کیا کہ وہ اتنے ہی روپیہ

ہر ماہ بھیجتی رہے گی۔ اس نے کپڑے تو رکھ لیے مگر روپیہ واپس کر دیا اور پیغام رساں عورت کو دو سو روپیہ انعام دیئے۔ چونکہ صاحب عالم اور بیگم کے مابین ابھی تک پیام رسانی ملازمہ عورتوں کے ذریعہ ہوتی رہتی تھی لہٰذا خوشامدیوں اور چالاک لوگوں نے بہت جلد میل ملاپ کرا دیا۔ اس کے بعد صاحب عالم نے ۲۶ تاریخ سے کھانا کھانا چھوڑ دیا اور دوسرے دن بیگم کے محل میں واپس آ گیا۔

حالِ ولادت رفیع الدین حیدر محمد مہدی فریدوں بخت عرف منا جان

ولدیت پرشبہات اور تحقیقات:

۵ ذی الحجہ ۱۲۳۵ھ (۴ ستمبر ۱۸۲۰ء) کو بعد دو پہر سکھ چین خواص نصیر الدین حیدر نے جو بعد میں افضل محل سے ملقب ہوئی ایک بچہ جنا۔ جو معمولی مدت حمل کے بہت عرصہ بعد یعنی پچیس مہینہ گزر جانے کے بعد پیدا ہوا۔ ماماؤں نے محل میں دن چھپنے سے چار گھنٹہ قبل اس کو نہلایا اور بادشاہ بیگم کے حوالہ کیا۔ بیگم انتہائی خوش ہوئی اور موقعہ کے شایان شان جشن منانے کے احکام جاری کیے۔ اس نے بچہ کا نام محمد مہدی رفیع الدین حیدر عرف منا جان رکھا۔ اور محسن الدولہ کو اکیس اشرفیاں دے کر بھیجا کہ اس کی طرف سے بادشاہ کو نذر پیش کرے۔ ذرا دیر بعد سلیمان جاہ کو بذات خود نذر پیش کرنے کے لیے بھیجا لیکن امرت لال بیگی، فتح علی سیدی عبدالکریم داروغہ دیوان خانہ نے ان سے کہا کہ

> ''بہ تعمیل احکام شاہی ہمیں سختی سے منع کیا گیا ہے کہ آپ کو بادشاہ کے سامنے جانے نہ دیں۔ اس لیے آپ کو لوٹ جانا چاہیے''۔

دوسرے روز امرت لال کے اطلاع دینے پر بادشاہ نے تمام سپاہیوں اور فوجی افسروں کو جو شاہی محل کی ڈیوڑھی پر تعینات تھے برخاستگی کے احکام جاری کر دیئے اسی ڈیوڑھی میں ہو کر سلیمان جاہ اور محسن الدولہ کو اندر جانے کی اجازت تھی۔

دو دن بعد خبر نویس نے ریزیڈنٹ جان مانکٹن کو اس واقعہ کی اطلاع دی جس نے خیال کیا کہ ولی عہد کے نماز عید الفطر میں دیدۂ دانستہ بخلاف حکم شاہی غیر حاضر رہنے

سے معاملہ نازک ہو گیا ہے پس جب ریزیڈنٹ دوسری بار بادشاہ سے ملا تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ

''بحیثیت ایک دوست کے مجھے یہ شکایت کرنے کا حق حاصل ہے کہ آپ نے اپنے پوتے کے پیدا ہونے کی مجھے اطلاع نہیں دی''۔

یہ سن کر بادشاہ ایسا بن گیا گویا اس واقعہ کا اسے کوئی علم ہی نہ تھا اور اپنے چہرے بشرے سے ایسا ظاہر کیا کہ وہ ریزیڈنٹ کی اس بات کو سمجھا ہی نہیں۔ ریزیڈنٹ نے جو کچھ اس بچہ کے پیدا ہونے کے بارے میں سنا تھا اسے دہرایا اور کہا کہ

''یہ موقع اگرچہ رسمی ملاقات کا متقاضی تھا مگر ہز مجسٹی کی جانب سے مجھے سرکاری اطلاع موصول ہونے کا آج صبح تک انتظار رہا''۔

بادشاہ اس وقت کچھ ایسا بن گیا گویا کسی سوچ میں پڑ گیا ہے۔ ذرا دیر بعد دفع الوقتی کے طور سے جواب دیا کہ

''یہ تو مناسب موقع نہیں ہے کسی دوسرے وقت اس معاملہ پر گفتگو کریں گے''۔

یہ بات سن کر ریزیڈنٹ متعجب ہوا اور بادشاہ سے پوچھا کہ

''جو کچھ بچہ کی پیدائش، سلیمان جاہ اور محسن الدولہ کی حاضری کی ممانعت اور ڈیوڑھی پر متعینہ سپاہیوں کی برخاستگی کے بارے میں سننے میں آیا ہے کیا وہ صحیح ہے؟''

بادشاہ نے جواب دیا:

''بچہ پیدا ہونے کے بعد ولی عہد نے خاص برداروں کی معیت میں شام کے وقت حضور میں آنے کی بالجبر کوشش کی تھی لیکن یہ بچہ چونکہ ایک دھوبن

کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور یہ دھوبن پندرہ دن قبل ولادت طفل اغوا کی گئی تھی اور محل میں محض اس لیے لائی گئی تھی کہ وہاں بچہ جنے لہٰذا میں نے ان مروجہ رسومات کے ادا کیے جانے کا کوئی حکم نہیں دیا جو ایسے مبارک مواقع پر ادا کی جاتی ہیں''۔

بادشاہ نے مزید کہا:

''مجھے معلوم تھا کہ یہ سارا معاملہ ایک فریب ہے اس لیے تسلیم کرنے کے بارے میں کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی''۔

ریزیڈنٹ نے اس خبر کی سچائی پر جو بادشاہ کو ملی تھی اپنا شک ظاہر کیا اور کہا:

''یہ بہت ممکن ہے کہ سلیمان جاہ اور بادشاہ بیگم کے دشمنوں نے یہ تمام قصہ گھڑا ہو''۔

لیکن بادشاہ نے ریزیڈنٹ کو باور کرانے کی کوشش کی اور بتایا کہ

''میں نے اس بارے میں کامل طور سے اور احتیاط کے ساتھ تحقیقات کرالی ہیں''۔

ریزیڈنٹ نے اس پر جواب دیا:

''میں نہیں سمجھتا اس شرمناک کاروائی میں خود ولی عہد کیونکر شریک ہو گیا۔ اس کو یقیناً سب باتوں کا علم ہو گا اس لیے ایسی شدید غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا کہ اس معاملہ میں شریک جرم سمجھا جائے''۔

ریزیڈنٹ کو سلیمانؔ جاہ کی شرکت سازش کے بارے میں پھر بھی سخت شبہات رہے اور اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو اس کے خیال میں یہ سب کچھ اس کی کم عمری اور غیر مآل اندیشی کے سبب ہوا ہو گا لہٰذا بادشاہ کی دلیل سے قطعی غیر مطمئن ہو کر اس نے

بادشاہ کو وہ بات یاد دلائی جس کی اطلاع خود اس نے کچھ عرصہ قبل دی تھی یعنی یہ کہ ولی عہد محل شاہی کی چند لونڈیوں کی محبت میں پھنس گیا ہے اور ان میں بعض حاملہ بھی ہیں چنانچہ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ بچہ سلیمان جاہ ہی کے نطفہ سے پیدا ہوا ہے۔

متذکرہ بالا اطلاع پندرہ مہینے پیشتر دی گئی تھی اور اس کے بعد سے کسی فرزند نرینہ کی ولادت کی کوئی خبر نہیں ملی تھی البتہ یہ افواہ گرم تھی کہ ایک بچی تولد ہوئی ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں تھی۔

لیکن بادشاہ نے اس دلیل کو پر مذاق طریقہ سے رد کر دیا اور فرمایا:

''کیا ہی عجیب بات ہے! کیا پچیس مہینوں میں بھی کوئی بچہ کبھی پیدا ہوا ہے''۔ (یہی مدت تھی جو گزر بھی چکی تھی)

یہ گفتگو بادشاہ کی اس بات پر ختم ہوگئی کہ

''وہ اور گورنر جنرل دونوں دل سے چاہتے ہیں کہ ولی عہد کی شادی کسی اعلیٰ خاندان کی دوشیزہ سے کر دی جائے''۔

اطلاعات کا دوسرا ذریعہ خبر نویس تھا اس نے ریزیڈنٹ کو یہ خبر پہنچائی کہ کچھ عرصہ پہلے بادشاہ بیگم نے تین لڑکیاں سلیمان جاہ کے پاس بھیج دی تھی اور یہ بچہ ان ہی داشتہ لڑکیوں میں سے کسی ایک سے پیدا ہوا ہے۔ ریزیڈنٹ نے یہ سب تفصیلات گورنمنٹ کے صدر مقام واقع کلکتہ روانہ کر دیں اور گورنر جنرل کو لکھا:

''باپ تو بچہ کو تسلیم کرتا ہے مگر دادا تسلیم نہیں کرتا۔ بادشاہ کے اس ادعاء کی صداقت کے متعلق کہ سلیمان جاہ اس بچہ کا باپ نہیں ہے تحقیق کرنا بہت دشوار ہے اور یہ سمجھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ دونوں فریقوں کے مویدین کی اصل غرض کیا ہے''۔

اسی سال مسٹر مینکلف سیکرٹری محکمہ خارجہ نے ریزیڈنٹ کے مراسلہ مرقومہ ۱۶ ستمبر کی رسید کے جواب میں ۱۴ اکتوبر کو تحریر کیا تھا کہ:

''آپ کی تحریر سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ولی عہد کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا ہے جسے بادشاہ تسلیم کرنے سے منکر ہے۔ مبادا کسی موقع پر کوئی قضیہ اٹھ کھڑا ہو، اس لیے ہم پر واجب ہے کہ پوری تفتیش کریں ۔ بنابریں مناسب حال یہ ہے کہ آپ اس بات کی تحقیقات شروع کردیں کہ آیا ولی عہد ہی اس بچہ کا اصلی باپ ہے مزید برآں گورنر جنرل امید کرتے ہیں کہ بادشاہ اودھ بھی اصل حقیقت دریافت کرنے اور شکوک وشبہات مٹانے کے لیے خود بھی کوشش کریں گے''۔

ان واقعات کی ہم زمانیت کے پیش نظر کہ اس بچہ کا ایک دھوبن کے بطن سے پیدا ہونا بتایا جاتا ہے اور یہ کہ ایک حاملہ دھوبن کے لاپتہ ہوجانے کی بھی اطلاع ملی ہے ریزیڈنٹ نے چاہا کہ لاپتہ عورت کے خاوند کا بیان پوری احتیاط سے قلمبند کرلیا جائے قبل اس کے کہ بادشاہ کو اس کی بھنک پہنچے اور اپنے ملازمین کے ذریعہ اس کے بیان کو بدلوانے کی کوشش کریں چنانچہ میر منشی کو مامور کیا گیا کہ پہلے وہ اس دھوبی کو اپنے یہاں نوکر کرلیں بعد میں اس کا بیان ضبط تحریر میں لائیں۔

ریزیڈنٹ نے جب دوسری بار بادشاہ سے ملاقات کی تو ایک تحریر پیش کرتے ہوئے یہ درخواست کی کہ

''اس غرض کے پیش نظر کہ ریاست میں آئندہ کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہو بادشاہ کو چاہیے کہ اس بچہ کے بارے میں کافی غور وخوض کے بعد اپنی رائے ضبط تحریر میں لائیں اور یہ بھی کہا کہ قریب مصلحت ہوگا اگر محل میں جا کر آپ

خود بھی دیکھ لیں''۔

لیکن بادشاہ نے ایسا کرنا پسند نہیں کیا اور بالتکرار کہا کہ

''یہ بچہ ہمارا پوتا نہیں ہے اور اسی وجہ سے ہم نے کوئی خوشی کی رسم بھی ادا نہیں کی''

اور مزید حجت یہ پیش کی کہ اگر کوئی فی نہیں تھی تو بادشاہ بیگم نے بچہ کی ولادت کے موقع پر حسب دستور خاندان کی تمام خواتین کو مدعو کرنے سے کیوں گریز کیا؟

اس کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ

''دائی کو تلاش کر کے ان کے روبرو پیش کیا جائے''۔

بادشاہ بیگم کو بھی اس بارے میں ایک خط بادشاہ نے خود لکھ کر بھیجا۔

ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریزیڈنٹ نے تمام ممکن ذرائع سے اس معاملہ کی تحقیقات کی کوشش کی۔

مزید برآں خبر نویس نے اس واقعہ کی اطلاع بھی ریزیڈنٹ کو دی کہ

''۲۵ جمادی الثانی ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۳ مئی ۱۸۱۷ء کو منتظم الدولہ مہدی علی خاں کی نذر کی ہوئی تین عورتیں بادشاہ نے میمنت خواجہ کی معرفت بادشاہ بیگم کے پاس بھیجی تھیں ان میں سے دو کا انتقال ہو گیا۔ تیسری جس کا نام افضل محل ہے زندہ ہے اور وہی اس بچہ کی ماں ہے''۔

خبر نویس نے یہ بھی لکھا کہ

''اس کی چھاتیوں سے بچہ نے دودھ پیا تھا''۔

ولی عہد اور بادشاہ بیگم نے یہ حجت پیش کی کہ اگر اس بارے میں بادشاہ کو پھر بھی شبہ ہو تو خود آ کر بچہ اور اس کی ماں کو دیکھ لیں۔

اگر چہ اس موقع پر دھوبی کا بیان لکھنا کچھ بے موقع سا ہے تاہم لوگوں کو واقعات سے آگاہ کرنے کے لیے اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

ریزیڈنٹ کے روبرو دھوبی کا بیان:

''میرا نام پیرا دھوبی ہے، میری بیوی منا عمر، امسال ۸ ماہ سے پیٹ سے تھی ذی قعدہ کے مہینے کی ساتویں[1] تاریخ کو جب دو گھڑی دن چڑھا ہوگا وہ پرورش علی خان کے مکان پر دھلے کپڑے دینے گئی تھی پھر واپس نہ پلٹی۔ دوپہر کو مُنیا دلالہ میرے گھر آئی اور منا کو پوچھنے لگی۔ میری ساس نے بتایا پرورش علی کے یہاں گئی ہوئی ہے میں نے گھر آ کر شام تک اس کا انتظار کیا پھر پرورش علی کے گھر گیا جہاں مجھے معلوم ہوا کہ وہاں سے چلی گئی ہے کچھ لوگوں نے چونکہ مجھے یہ بتایا تھا کہ منیا دلالہ نے پرورش علی کی سازش سے میری بیوی کو فروخت کر دیا ہے میں اس کے گھر گیا اس کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ وہ تو دو دِن سے کہیں گئی ہوئی ہے اور واپس نہیں آئی۔

آخر کار تیسرے دن میں نے اسے ڈھونڈ نکالا اور کوتوال کو سب واقعات بتا دینے کے بعد اسے گرفتار کرا دیا۔ چار دن بعد دلالہ نے وعدہ کیا کہ اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو وہ میری بیوی کو واپس لا دے گی لہٰذا اسے چھوڑ دیا گیا اور اس کا نام کوتوالی میں درج رجسٹر کرا لیا گیا اور حاضری لکھ لی گئی۔

اس کے بعد میری ساس مسماۃ بی جانؔ نے معتمد الدولہ کی بیگم خورد محل کے سامنے شکایت کی جنھوں نے دلالہ کو پھر گرفتار کرا کے کوتوالی بھجوا دیا وہ

---

[1] مخطوطہ میں مہینے کی تاریخ درج نہیں ہے۔ حساب کرنے سے ۷ ذیقعد ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۷ اگست ۱۸۳۰ء آتی ہے۔

حوالات میں بند کر دی گئی پھر معتمد الدولہ نے سخت احکام جاری کیے کہ میری بیوی کو پوری طرح تلاش کیا جائے تو اس نے بھی سخت تدبیریں کیں مگر بے سود رہیں آخر کار مجھے بتایا گیا کہ رنگ محل کے اندر تو کوتوالی کی بھی نہیں چلتی ۔ اب میں مایوس ہو گیا۔ دلالہ ۴ محرم کو چھوڑ دی گئی ۔مگر میرا پکا یقین ہے کہ بہت سے لوگوں نے جو یہ بات کہی ہے کہ میری بیوی کو پندرہ روپے کے عوض رنگ محل میں بیچ دیا گیا تھا صحیح ہے''۔

ریزیڈنٹ نے ۲۰ دسمبر مذکور کو بادشاہ سے اپنی ملاقات کا اور دھوبی کے بیان کا پورا حال گورنر جرنل کو ارسال کر دیا۔

اسی دوران جب مسٹر مینکلف کے بجائے اسسٹنٹ ریزیڈنٹ مسٹر ریپر قائم مقام تھے ایک دن بادشاہ نے محسن الدولہ سے دریافت کیا کہ

''اس کا ماموں یعنی نصیر الدین حیدر ہمارے پاس خیریت پوچھنے کے لیے جبکہ ہمارے پیر میں چوٹ آ گئی تھی ...... کیوں نہیں آیا''۔

محسن الدولہ نے عرض کیا کہ ''وہ تو حکم شاہی کے منتظر تھے''۔

بادشاہ نے فرمایا:

''جاؤ اس سے کہو کہ مع اپنے بیٹے کے فوراً حاضر آئے''۔

محسن الدولہ نے بادشاہ بیگم کو اطلاع دی چنانچہ بیگم نے ولی عہد اور منا جان بچہ دونوں کو بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ ولی عہد نے بادشاہ کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا بادشاہ نے اسے اٹھایا اور زار و قطار روتے ہوئے اسے سینے سے لگایا اور بچہ کو گود میں لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کو عطائے خلعت سے سرفراز کیا۔ اسی دن یعنی ۱۰ اپریل ۱۸۲۱ء کو ریزیڈنٹ مسٹر ریپر نے اس مصالحت کی اطلاع گورنر جرنل کو پہنچا

دی تھی۔

مشکوک ولدیت کے ثبوت:

لیکن منجملہ دیگر واقعات کے جو اس بچہ کو غیر اصلی ثابت کرتے ہیں ایک تو یہ کہ مسٹر میڈک ریزیڈنٹ کے زمانے میں بادشاہ بیگم نے میعاد حمل کی مدت دو سال سے زیادہ ظاہر کی تھی پھر عام افواہ یہ بھی تھی کہ نصیر الدین حیدر پیدائشی نامرد ہے اور اس لیے کسی عورت سے صحبت کرنے کے ناقابل۔ اسی وجہ سے بیگم نے اس سے مایوس ہو کر اس کے کوئی اولاد نہ ہوگی اس بچہ کو حاصل کرلیا تھا چنانچہ شہر کا ہر شخص جانتا تھا کہ فریدوں بخت نصیر الدین حیدر کا حقیقی بیٹا نہیں ہے بلکہ اس کا یہ بیٹا بنا لینا اسی بنا پر تھا کہ وہ بے اولاد تھا۔ اس افواہ کی تصدیق معتمد الدولہ کے بیان سے بھی ہوئی تھی اور یہ بات تو شبہ سے بالاتر ہے کہ معتمد الدولہ غلط بات کہتا کیونکہ بادشاہ بیگم نے اس سے پکا وعدہ لیا تھا کہ نائب کا عہدہ اسے دلوائے گی اس لیے سوائے سچ بات کہنے کے اس کی کوئی غرض نہ ہوسکتی تھی جبکہ اس نے اس بیان کی تصدیق کی تھی کہ مناجان اصلی بچہ نہیں ہے۔

منتظم الدولہ کا بیان دوسرا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ اس نے ریزیڈنٹ سے بیان کیا تھا کہ

> ''نصیر الدین حیدر نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کیوان جاہ اور فریدوں بخت دونوں اس کے حقیقی بیٹے نہیں۔ اور اپنے بے اولاد ہونے پر اظہار غم بھی کیا تھا پھر نصیر الدین حیدر نے اپنے تخت نشین ہونے کے بعد فریدوں بخت کو اپنا ولی عہد تسلیم کرنے کے بارے میں کوئی تحریک نہیں کی بلکہ کیوان جاہ کی طرف کہ وہ بھی اس کا بیٹا نہیں تھا زیادہ مائل تھا۔ چنانچہ ریزیڈنٹ نے یہ تمام واقعات لکھ کر گورنر جنرل کو یکم جنوری ۱۸۳۱ء

(مطابق ١٦ ارجب ١٢٤٦ھ) کو پہنچا دیئے۔

دیگر بیانات:

چونکہ کچھ اشخاص جو اس معاملہ کے حقائق سے واقفیت رکھتے تھے کانپور میں مقیم تھے ان کے بیانات کانپور کے جج مسٹر اولڈ فیلڈ نے قلم بند کیے تھے۔ وہ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

بیان پرورش علی خاں عرف چھوٹے خاں:

(جو بلا جبر برضائے خود اور باہوش وحواس ١٩ جمادی الاول ١٢٤٢ نومبر ١٨٣٠ کو دیا)

''منیا ایک دھوبن تھی جو میرے یہاں کام کیا کرتی تھی۔ ذی الحجہ کے مہینے میں میرے پہننے کے کپڑے دھوکر میرے گھر لائی تھی اس وقت بادشاہ بیگم کی ملازمہ بی بی بوڑھی خانم جسے لوگ عام طور پر امانی خانم کہتے تھے موجود تھی یہ ہمارے گھر اکثر مہمان آیا کرتی تھی۔ میرے سامنے بھی اس نے منیا سے کہا:

''تیرے پیٹ میں بچہ ہے لیکن شوہر سے تیری نہیں بنتی محل میں ایک حاملہ عورت کی تلاش ہے اس لیے میں تجھے بادشاہ بیگم کے پاس لے جاؤں تیرے لڑکا پیدا ہو جائے تو سارے عیش وآرام کے سامان تیرے لیے مہیا کیے جائیں گے یعنی ایک عالیشان محل، ماماؤں کی ایک فوج، نفیس اور بڑھیا کپڑے، بہترین کھانے اور عیش وراحت کے دوسرے لوازمات۔ مجھے امید ہے کہ تم میری نصیحت پر عمل کرو گی اور میرے اس سلوک پر مجھے ہمیشہ یاد کرو گی''۔

چونکہ منیا اپنے شوہر سے بہت بیزار تھی اس نے خانم کی اس تجویز کے مطابق عمل کیا اور یہ دونوں منیا اور بوڑھی خانم ایک پردہ دار پینس (محافہ) میں سوار ہوکر بیگم کے محل پہنچیں ان کے ساتھ ساتھ ایک شخص مرزا عنایت علی محل کی ڈیوڑھی تک گیا تھا وہ اب تک شہر ہی میں رہتا ہے۔ اس مہینے کی چوتھی تاریخ کو میں بوڑھی خانم سے ملا تھا وہ بخار میں مبتلا تھی۔ تین دن بعد ۷ تاریخ کو اس کا انتقال ہوگیا''۔

سوال: منیا کے محل میں جانے کے کتنے دن بعد تم کو یہ معلوم ہوا کہ منیا نے بچہ جنا ہے؟

جواب: پندرہ سولہ دن بعد۔

بیان مرزا عنایت علی برضائے خود:

''ذی الحجہ کے مہینے میں (دن اور سال یاد نہیں) میں پرورش علی خاں کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ بیگم کی ایک خادمہ مسماۃ امانی خانم حسب معمول وہاں آئی اور مجھ سے کہا: بڑا احسان ہوگا اگر تم ہمیں بحفاظت پہنچا دو۔ میں نے اس کی ساتھی عورت کا اتہ پتہ پوچھا تو مجھے بتایا تھا کہ پیرا دھوبی کی عورت منیا ہے۔ چونکہ وہ دھوبن تھی اور اسے میں بھی بوجہ اس کے پیشہ کے جانتا تھا میں نے خانم سے ایک حاملہ عورت کے محل میں لے جانے کا مطلب دریافت کیا تو مجھے بتایا کہ اسی قسم کی عورت کی وہاں ضرورت ہے۔ یہ دونوں ایک پینس میں سوار ہوئیں، انہیں میں نے محل کی ڈیوڑھی تک حفاظت سے پہنچا دیا۔ خانم نے اگرچہ ایک بڑی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا مگر محل میں داخل ہونے کے بعد ایک دمڑی بھی نہیں دی''۔

سوال: منیا کے محل میں داخل ہونے کے کتنے دن بعد تمہیں معلوم ہوا کہ اس نے بچہ جنا ہے؟

جواب: پندرہ سولہ دن بعد۔

بیان شیخ زین اللہ برضائے خود:

''میں امانی خانم کی ملازمت میں تھا وہ ایک حاملہ عورت کو بادشاہ بیگم کے محل میں لے گئی اور مجھ سے محل کی ڈیوڑھی تک ساتھ چلنے کو کہا میں اس کے ساتھ گیا''۔

سوال: منیا کے محل میں لے جانے کے کتنے دن بعد تمہیں معلوم ہوا کہ اس نے بچہ جنا ہے؟

جواب: پندرہ سولہ دن بعد۔

بیان مسماۃ مہتاب، دولت خانہ قدیم کی ایک دائی برضائے خود:

''یہ واقعہ ہے کہ بادشاہ بیگم نے مجھے بلوایا، محل میں ٹھہرایا اور کہا کہ ''سکھ چین خواص حاملہ ہے اس لیے میں اکثر اس کے ساتھ ایک ہی بستر پر سوئی اور اس کے پیٹ کو یہ معلوم کرنے کے لیے ٹٹولا کہ آیا پیٹ میں بچہ ہے لیکن مجھے اس کے حاملہ ہونے کے کوئی آثار کبھی معلوم نہیں ہوئے نو مہینے گزر جانے کے بعد بیگم مجھ سے خفا ہوگئیں اور مجھے بے آبرو کرنے اور مروا ڈالنے کی دھمکی دی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا بتاؤ تم نے بچہ کیوں نہیں جنوایا میں نے کہا پیٹ میں جب بچہ ہی نہ ہو تو کیسے جنوایا جا سکتا ہے۔ میرے اس جواب پر بیگم غصہ سے مشتعل ہوگئیں اور مجھے حبشنوں کے حجروں میں بھیج دیا۔ جہاں میں سات دن ٹھہری رہی۔

ایک روز جبکہ چار گھڑی رات گزر چکی تھی فیض النساء یہ کہتی ہوئی میرے پاس آئی کہ سکھ چین کے دردزہ ہو رہا ہے اور میری خوش نصیبی پر مجھے مبارکباد دی۔ میں اس کے ساتھ گئی مگر وہاں جا کر کوئی علامت بچہ پیدا

ہونے کی نہیں پائی۔ میں ناامید ہوگئی مگر سزائے موت کے خوف سے خاموش رہی۔فیض النساء نے مشورہ دیا کہ باہر جاکر حقہ پینے لگوں۔ میں نے ایسا ہی کیا کوئی ایک گھڑی بعد یہ چرچا ہوا کہ بچہ پیدا ہوگیا ہے۔ میں بے حد متعجب ہوئی اور اندر محل میں لوٹ آئی فیض النساء اور محل کی دوسری خواتین بچہ کو میرے پاس لائیں۔ میں نے اس بچہ کا نال کاٹا۔ایک جوڑی پکھراج اور ایک ہزار روپیہ انعام پایا پھر میں نے کپڑا اور تیل مانگا تاکہ حسب رواج زچہ پر عمل کروں مگر انہوں نے کہا کہ یہ عمل غریب طبقوں میں ہوتا ہے۔ امراء کے یہاں اس کا رواج نہیں ہے میرے انعام میں سے فیض النساء نے دوسو روپیہ لے لیے اور آٹھ سو میرے لیے چھوڑ دیئے۔ جب غازی الدین حیدر شاہ زماں نے مجھے طلب کیا اور اس معاملہ کے بارے میں دریافت کیا تو یہی بیان میں نے ان کے سامنے بھی دیا تھا''۔

سوال: بچہ کے پیدا ہونے کی تاریخ مہینہ اور سال کیا تھا؟

جواب: مجھے اچھی طرح یاد ہیں غالباً ذی الحجہ کا مہینہ تھا۔

سوال: بچہ پیدا ہوا تو کیا تم کو یہ معلوم تھا کہ ماں بچہ کی کون ہے؟

جواب: آٹھ نو دن بعد فیض النساء نے مجھ سے کہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بچہ ایک دھوبن نے جنا تھا میں نے اس پر کہا کہ فضول کام تو میں نے کیا، نال تو اس کا میں نے کاٹا، مگر بچہ کی ماں کا مجھے کچھ پتہ ہی نہ چلا۔تو اس بات پر فیض النساء خفا ہوگئی اور کہا خاموش تم کو صرف یہی کہنا چاہیے کہ اس کی ماں سکھ چین ہے، میں نے کہا کہ میں جھوٹ کیسے بول سکتی ہوں۔

بیان دلاورخاں برضائے خود:

''میں اعلیٰ حضرت غازی الدین حیدر شاہ زماں بادشاہ اودھ کا پرانا خادم ہوں جب منیا دھوبن قید میں رکھی گئی مجھے حکم ہوا، اسے اپنی نگرانی میں رکھوں۔اس سے میں نے پوچھا تو کیوں پکڑی گئی ہے اس نے جواب دیا: ''میں پیرا دھوبی کی عورت ہوں، میں پیٹ سے تھی بادشاہ بیگم کی خادمہ امانی خانم دھوکہ سے مجھے محل میں لے آئی میں نے وہاں بچہ جنا اس کے بعد سے کسی نے میری خبر تک نہ لی پھر نوبتی خانم مغلانی اپنے گھر مجھے اٹھا لائی اس وقت دوا اور دوسری طاقت دینے والی چیزیں کھانے کی مجھے ضرورت تھی۔ اس نے ہمدردی سے میری خدمت کی۔ بادشاہ کے ملازم میری تلاش میں تھے۔مغلانی نے مجھے ایک شخص عباس علی بیگ کے حوالہ کر دیا جس نے معتمد الدولہ کے پاس اس لیے مجھے پہنچا دیا تاکہ بغرض تحقیقات وہ مجھے بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔معتمد الدولہ مجھے فرح بخش محل لے گئے میرے ساتھ والا (عباس بیگ) کچھ دنوں تک سپاہیوں کے ایک دستہ کی حراست میں رکھا گیا''۔

اس کے بعد بحکم شاہی میں نے اس عورت کو معتمد الدولہ کے پاس پہنچا دیا۔ اب کچھ عرصہ سے میں کانپور میں رہتا ہوں۔اس مہینہ کی سات تاریخ کو مجھ سے کہا گیا کہ میں ایک لاش کو دیکھوں جس کو میں نے پہچان لیا وہ منیا دھوبن کی لاش تھی''۔

نوبتی خانم مغلانی بادشاہ بیگم کی پرانی خادمہ کا بیان:

''میں اچھی طرح واقف ہوں کہ مناجان سکھ چین خواص کے پیٹ سے نہیں

پیدا ہوا سکھ چین ہمہ وقت میرے ساتھ رہتی تھی کبھی کوئی بچہ اس کے نہیں
ہوا۔ بادشاہ بیگم کی مرضی یہی تھی کہ سکھ چین کے بارے میں اعلان کر دیا
جائے کہ وہ اس بچہ کی ماں ہے۔ محل بیگم کے بیان سے بھی ظاہر ہے کہ بچہ
سکھ چین سے پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ دھوبن سے پیدا ہوا تھا''۔

سوال: کون سی دائی بچہ جنوانے کے لیے بلائی گئی تھی؟

جواب: بچہ جنوانے ایک دائی مسماۃ مہتاب بلائی گئی تھی۔

سوال: کیا تم نے بچہ جننے کے بعد سکھ چین کو دیکھا تھا؟

جواب: جی ہاں اسے میں نے خوب تندرست حالت میں محل کے اندر چلتے پھرتے دیکھا تھا۔

سوال: بچہ پیدا ہونے کی تاریخ، مہینہ اور سال کون سا تھا؟

جواب: تاریخ اور سال تو یاد نہیں مہینہ ذوالحجہ کا تھا جسے گیارہ سال گزر گئے ہیں۔

رپورٹ نوشتہ معتمدالدولہ جو ریزیڈنسی کے دفتر میں شامل مسل کی گئی:

بادشاہ بیگم نے جب بادشاہ کو اطلاع دی کہ سکھ چین حمل سے ہے تو بادشاہ آزردہ سے ہو گئے۔ بیگم سے کہا:

''تم نے بلا میرے علم اور اجازت کے اس لونڈی کو نصیر الدین حیدر کی
خدمت میں کیوں رکھا تھا۔ کیونکہ لارڈ ہیسٹنگز کی اور میری دونوں کی
خواہش تھی کہ نصیر الدین کی شادی کسی عالی نسب خاندان کی بیٹی سے کی
جائے تا کہ پہلونٹی کا بچہ جانبین سے نجیب ہو''۔

اس کے بعد بادشاہ نو مہینے تک انتظار کرتے رہے جب کوئی بچہ تولد نہ ہوا تو وہ چال بازی کو بھانپ گئے پھر انہوں نے بادشاہ بیگم کے پاس پیغام بھیجا کہ

''بچہ کی ولادت میں اتنی دیر باعث تعجب ہے''۔

بیگم نے جواب دیا کہ

''بچہ تو پیدا ہونے کو تیار ہے مگر جنات اور بدروحیں اسے پیدا نہیں ہونے دیتیں''۔

اس بات سے بادشاہ کے شبہات اور قوی ہوگئی۔انہوں نے حکم دیا کہ

''بچہ کی ولادت ان کی بہنوں، خالاؤں اور شاہی خاندان کی دوسری خواتین کی موجودگی میں ہو''۔

پچیس مہینے اسی طرح گزر گئے بادشاہ کا شبہ اور بھی پختہ ہوگیا۔اسی دوران یہ اطلاع ملی کہ بیگم کی خادمائیں کسی حاملہ عورت کی تلاش میں ہیں نیز یہ کہ ایک حاملہ دھوبن جو محمد باقر کے یہاں ملازم تھی لاپتہ ہے۔اس خبر کو سن کر بادشاہ نے دوسرا پیغام یہ بھیجا کہ

''منصوریہ ① خاندان کی جملہ خواتین کو بچہ ہونے کے وقت مدعو کیا جائے تاکہ بچہ کی ولادت ان کی موجودگی میں ہو''۔

چند روز بعد یکایک بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ بچہ پیدا ہوگیا ہے اور اس کے بعد ہی یہ خبر بھی ملی کہ ولی عہد از راہِ مکر وفریب نذر پیش کرنے اور یہ التجا کرنے کو آرہا ہے کہ شاہی خاندان میں بچہ پیدا ہونے کے موقع پر حسب دستور توپوں کی سلامی دی جائے۔اس پر بادشاہ نے غصہ سے کہا کہ

''توپوں کی سلامی تو اس حالت میں دی جاتی جب یہ بچہ میرا پوتا ہوتا''۔

ولی عہد ناامید ہوکر اور باریاب ہوئے بغیر واپس لوٹ گیا۔بادشاہ بیگم نے

---

① یعنی نوابانِ اودھ کا خاندان جو مرزا منصور علی خاں صفدر جنگ مورث اعلیٰ کے نام سے ''منصوریہ'' کہلایا۔

بار بار تاکید و ہدایت کے باوجود بادشاہ کی بہنوں، خالاؤں کو نہیں بلایا اور جیسا کہ خواجہ سرا نسیم کا بیان ہے کہ

''بچہ یقیناً نصیر الدین حیدر کی اولاد نہیں ہے اور اس کی ولادت پر اسے اعتبار نہیں''۔

اور دایہ نے بھی بموجب حکم شاہی طلب کی گئی تھی بیان دیا ہے کہ

''یہ سارا معاملہ محض بناوٹی و جعلی ہے اور یہ کہ وہ خدا اور بادشاہ کے حضور میں سچ کو نہیں چھپائے گی''۔

اس کا بیان ہے کہ

''بچہ میرے سامنے پیدا نہیں ہوا بلکہ میرے پاس اسے نال کاٹنے کے لیے لایا گیا تھا جس کے صلہ میں مجھے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا میں نے سکھ چین میں کوئی علامت بچہ جننے کی نہیں دیکھی''۔

بادشاہ نے اس تحقیقات کے نتائج سے ریزیڈنٹ جان مانکٹن کو آگاہ کر دیا تھا۔

چند دن بعد ولی عہد اور محسن الدولہ ایک عورت کی گود میں بچہ کو بادشاہ کے پاس لائے مگر بادشاہ نے غصہ میں آکر اس بچہ کی شکل تک دیکھنے سے انکار کر دیا اور اس واقعہ کی اطلاع منتظم الدولہ کے ذریعہ ریزیڈنٹ کو کر دی۔ ریزیڈنٹ نے اس پر کہا:

''سنا گیا ہے کہ بادشاہ نے اس بچہ کو اپنی گود میں بھی لیا تھا''۔

یہ بات سن کر بادشاہ آپے سے باہر ہو گئے اور ریزیڈنٹ کو مطلع کیا کہ

''کسی نے اسے دھوکہ دیا ہے اور غلط اطلاع بہم پہنچائی ہے کیونکہ ایسا تو ہم جب کرتے کہ بچہ ہمارا حقیقی پوتا ہوتا''۔

قائم مقام ریزیڈنٹ کرنل ریپرآ اور ریزیڈنٹ مسٹر رکٹیسؔ کے زمانوں میں

بادشاہ نے ان صاحبوں سے کہہ دیا تھا کہ

> ''یہ بچہ نصیر الدین حیدر کے صلب سے پیدا نہیں ہے اور مناسب وسزاوار یہی ہے کہ سلطنت اسی خاندان کے کسی فرد کو ملے نہ کہ باہر کے کسی غیر آدمی کو''۔

اس کے بعد بادشاہ بیگم نے دوسری بار یہ مشہور کیا کہ سکھ چین حمل سے ہے بادشاہ نے ایک طبیب کو اپنے ایک خاص ملازم انگریز ڈاکٹر اور ایک اور دیسی سرجن کو جو لکھنؤ میں نو وارد تھا۔ اصل حقیقت کا پتہ لگانے کے لیے محل میں بھیجا مگر بیگم نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ سکھ چین کے حمل سے ہونے کی شہرت چار برس تک رہی مگر بچہ کبھی پیدا نہ ہوا۔

بعض اور بیانات چونکہ دونوں فریقوں سے کسی کے لیے بھی کارآمد نہیں ہیں اس لیے میں نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔

مناجان کو بیٹا تسلیم کرنے سے بادشاہ کا انکار

تحقیقات جو مسٹر میڈک کے زمانہ میں شروع ہوئی تھیں اور کچھ عرصہ تک رکی رہی تھی پھر کرنل لو کے دور میں اس کا آغاز ہوا تھا۔ لہٰذا اس درمیانی مدت میں منتظم الدولہ مہدی علی خاں نے ۲ فروری ۱۸۳۲ء بمطابق شعبان ۱۲۴۷ھ کو ریزیڈنٹ سے ملاقات کی اور اس معاملہ کے متعلق تاج الدین حسین خاں کی موجودگی میں بعض اطلاع بہم پہنچائیں اور کہا کہ

''میں نے کچھ عرصہ ہوا کیوان جاہ اور منا جان کے بارے میں جو کہا تھا وہ بادشاہ کی طرف سے نہیں کہا گیا تھا لیکن جو بیان میں اب دے رہا ہوں وہ بادشاہ کے کھلے حکموں کے بموجب دے رہا ہوں جنہوں نے اس حقیقت کو آشکارا کرنے کا ارادہ کرلیا ہے کہ کیوان جاہ اور فریدوں بخت میں سے کوئی بھی ان کا بیٹا نہیں ہے۔ ہز میجسٹی نے اِن دونوں کو محل شاہی میں سے باہر نکال دینے کا عزم کرلیا ہے اور دوسرے مقامات میں یا تو دولت خانہ میں یا کسی اور جگہ ان کو رہنے کی اجازت دی جائے گی۔

ریزیڈنٹ نے اس پر حسب ذیل دو سوالات کیے:

۱۔ بادشاہ کو کیسے معلوم ہوا کہ فریدوں بخت ان کا بیٹا نہیں ہے۔

۲۔ وہ کیسے ان دونوں کا باپ سمجھتے ہیں۔

پھر ریزیڈنٹ نے نواب منتظم الدولہ کو یاد دلایا کہ کچھ عرصہ قبل خود انہوں نے بھی اپنا شبہ اس معاملہ میں ظاہر کیا تھا منتظم الدولہ نے جواب دیا کہ اس

وقت بھی شبہ کے وجوہ موجود تھے لیکن بادشاہ نے چونکہ مجھے حقائق کے افشا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی اس لیے میں نے شبہ کے علاوہ اور کچھ ظاہر کرنا پسند نہیں کیا تھا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اپنے باپ (غازی الدین حیدر) کے زمانہ میں نصیر الدین حیدر جو ایک دن محل کے اندر گئے وہاں میر افضل علی کو فریدوں بخت کی ماں ① کے ساتھ نہایت درجہ ناجائز بے تکلفی برتتے ہوئے پایا۔ وہ تو اسی وقت دونوں کو جان سے مار ڈالنا چاہتے تھے۔مگر میر فضل علی فوراً محل سے باہر نکل بھاگا اور بادشاہ بیگم نے ان دونوں کو مارے جانے سے بچا لیا۔نصیر الدین حیدر جو غصہ سے حد درجہ مشتعل تھے محل چھوڑ کر چلے آئے۔اور تین دن تک معتمد الدولہ کے یہاں ٹھہرے رہے۔لیکن شاہی حکم کی تعمیل میں انہیں پھر محل میں واپس چلے جانا پڑا۔

دوسرے دن سے انہوں نے محل میں رہنا پھر چھوڑ دیا اور حسن باغ چلے گئے۔ وہیں اقامت گزیں رہے۔تب بادشاہ بیگم نے ان کے اور فریدوں بخت کی ماں کے درمیان میں پڑ کر مصالحت کی کوشش کی اور اس کوشش کو انجام تک پہنچانے کے لیے اور باتوں کے علاوہ اس نے یہ ظاہر کیا فریدوں بخت کی ماں حمل سے ہے۔نصیر الدین حیدر نے جس وقت وہ شرمناک فعل دیکھا تھا اس کے چھبیس مہینے کے بعد فریدوں بخت پیدا ہوا۔ اس تمام عرصہ میں نصیر الدین حیدر نے اس عورت (والدہ فریدوں بخت)

---

① افضل محل والدہ فریدوں بخت اگرچہ ادنیٰ ذات ونمود کی عورت تھی لیکن ان لوگوں کی نظر میں جو اس کو اچھی طرح جانتے تھے اس کی ایک عیاش دربار میں خاصی نیک نامی تھی اور آج کے دن تک ویسی ہی نیک نامی قائم ہے۔(از کتاب سفر سلیمن)

سے کوئی واسطہ نہ رکھا تھا۔

بنابریں ہم دونوں بادشاہ اور خود میں پوری طرح یقین رکھتے ہیں کہ فریدوں بخت نصیرالدین حیدر کا بیٹا نہیں ہے''۔

منتظم الدولہ ① نے پھر کیوان جاہ کے بارے میں چند واقعات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ

''بادشاہ اس بات پر بہت منفعل ہیں کہ کیوان جاہ کو انہوں نے کیوں اپنا ولی عہد بنایا۔ بادشاہ بیگم کے متعلق منتظم الدولہ نے بتایا کہ وہ بادشاہ کے اس رویہ پر سخت برافروختہ ہے کہ ریزیڈنٹ کی دی ہوئے دعوت میں وہ فریدوں بخت کو نہیں لے گئے۔ بیگم نے تمام الزام میرے سر تھوپا ہے حالانکہ بادشاہ نے اس سے کہہ دیا تھا کہ فریدوں بخت کو ریزیڈنسی نہ لے جانے کے، وہ خود ذمہ دار ہیں اور یہ کہ اس میں میرا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ اس پر بھی بیگم کو یقین نہ آیا اور میری طرف سے عناد رکھنے لگی اس نے ایسی کئی

---

① حکیم مہدی علی میں انتظامی اہلیت اس درجہ تھی کہ بعد کے نوابی زمانہ کے بہت سے اعلیٰ عہدہ داروں میں ویسی نہ تھی۔ ۱۸۳۰ء میں دو سال تک انہوں نے وزارت کا عہدہ سنبھالا پھر ۱۸۳۶ء میں دو ماہ تک۔ مل کی ہسٹری برٹش انڈیا میں ہے کہ

''حکیم مہدی میں انتظامی اہلیت تھی۔ اگرچہ وہ محتاط نہیں تھا مگر دیانت دار تھا اس نے وزارت شان سے کی اور بہت سے کام انجام دیئے۔ اس میں گھمنڈ کرنے کا عیب تھا اپنے عمال کے ساتھ بداخلاقی برتتا تھا۔ اور جو سختی اس نے تخفیف کرنے میں دکھائی اس سے بہت غیر ہردلعزیز ہو گیا اور یہی اس کے زوال کا باعث ہوا''۔

یشپ ہیبر اس کا ہمعصر سیاح بیان کرتا ہے:

''حکیم مہدی ہیں بہت سی صلاحتیں ہیں وراشتاً وہ بہت متمول ہے اور پورا دیانت دار اور قابل عزت۔ خاص و عام کے ساتھ اس کا برتاؤ بحیثیت ایک مشرقی وزیر کے جیسا عام طور سے ہونا چاہیے تھا ویسا نہ تھا''۔

افواہیں پھیلائیں کہ دو گھنٹے سے زیادہ مجھے زندہ نہیں رکھا جائے گا اور معتمد الدولہ کو کہلا بھیجا کہ وہ دارالحکومت آنے کے لیے تیار رہے۔معتمد الدولہ کے نام خط لے جانے والا دریائے گنگا کے کنارے پکڑا گیا اور اب تک زیر حراست ہے۔اس کا اقبالیہ بیان اس واقعہ کی صداقت کا شاہد ہے۔
بادشاہ چاہتے ہیں کہ بیگم کسی اور مقام پر ترجیحاً فیض آباد میں جا کر رہے''۔

ریزیڈنٹ نے ۳ فروری بمطابق ماہ رمضان ان سب باتوں کی اطلاع صدر مقام کو بھیج دی۔ ۹ فروری بمطابق ۷ رمضان بادشاہ اور ریزیڈنٹ نیز منتظم الدولہ ڈنر کھانے کے بعد خلوت میں گفتگو کرتے رہے۔تھوڑی سی بات چیت کے بعد بادشاہ نے خجالت کے انداز سے کہا کہ

''بیس دن بعد ماہ رمضان ختم ہو جائے گا۔ یہ معمول رہا ہے کہ فریدوں بخت اور کیواں جاہ نماز عید ادا کرنے کو بڑی شان اور طمطراق سے مسجد کو جایا کرتے تھے مگر یہ رسم اب بند کر دی گئی ہے''۔

ریزیڈنٹ نے کہا:

''مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں حضور کو اس بارے میں کامل اختیار حاصل ہے تاہم اس رسم کو بند کرنے کے وجوہ سے مجھے براہ مہربانی مطلع فرما دیں''۔

بادشاہ نے نواب کو اشارہ کیا۔لیکن ریزیڈنٹ نے اپنی اور گورنر جرنل کی طرف سے بادشاہ کو پوری ہمدردی کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ

''یہ وجوہ تو آپ خود ہی بتائیں''۔

نواب نے بھی بادشاہ سے اصرار کیا کہ خود بیان فرمائیں۔ بادشاہ نے واضح

طور پر صاف صاف کہا:

''میں آپ کو اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ نہ فریدوں بخت میرا بیٹا ہے اور نہ کیوان جاہ۔ میں اس بات کا اظہار اس لیے کر رہا ہوں کہ آپ اسی کے بموجب گورنر جنرل کو مطلع کر دیں۔ دوسرے امور کے بارے میں تو نواب نے آپ کو پہلے ہی بعض ابتدائی معلومات بہم پہنچا دی ہیں جن کی تفصیلات وہ اب آپ کو بطور راز کے بتلا دیں گے اس پر نواب نے وہ تمام واقعات جو پہلے ایک مرتبہ بیان کر چکا تھا بیان کر دیئے بادشاہ نے اس پر یہ اضافہ کیا:

''یہ افواہ ہے کہ وہ دونوں میرے ہی بیٹے ہیں محض جھوٹی ہے اس کی تشہیر ایک دلیرانہ اقدام اور رشوت دیئے جانے کا نتیجہ تھی۔ ملکہ [1] زمانیہ نے ان لوگوں کو جو مجھے کیوان جاہ کو گود لینے و متبنی کرنے پر آمادہ کریں ایک لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا اور ایسی ہی پیشکش میر فضل علی اور سکھ چین نے فریدوں بخت کے لیے بھی کی تھی میرے والد اور خود میں جانتے تھے کہ فریدوں بخت میرا بیٹا نہیں ہے''۔

بادشاہ نے نواب کے اس بیان کی تصدیق کی جو میر فضل علی اور فریدوں بخت کی ماں کے تعلق اور چھبیس مہینوں کے بعد بچہ کے پیدا ہونے کے بارے میں تھا اور کہا:

''سابق میں چند دغا باز مکار آدمیوں نے مجھے خوف دلایا تھا اور یہ ترغیب دی تھی کہ میں فریدوں بخت کو اپنا بیٹا تسلیم کر لوں اس وقت تو مجھے مان لینا

---

[1] ملکہ زمانیہ یعنی سکھ چین ایک نیچ ذات عورت تھی جس کو نصیر الدین حیدر نے بیوی بنا لیا تھا۔ اس نے بڑی کثیر دولت جمع کر لی تھی اور اپنے شاہی خاوند کے ابتدائی زمانہ بادشاہت میں بہت اثر و اقتدار رکھتی تھی۔

پڑا تھا لیکن اب یہ صحیح وقت ہے کہ سچائی ظاہر کر دی جائے اس لیے کہ نواب (معتمدالدولہ) پورا پورا وفادار ہے اور سچائی سب سے اچھی بات ہے''۔

آخر میں بادشاہ نے دغابازوں کی سازش میں شرکت پر افسوس اور ندامت کا اظہار کیا اور فرمایا:

''میں نے پختہ عزم کرلیا ہے کہ حق کی راہ سے نہیں بھٹکوں گا''۔

اس کے بعد بادشاہ نے ریزیڈنٹ سے استدعا کی کہ وہ گورنر جنرل کو لکھ دیں کہ

''بادشاہ اودھ خراب اثرات کے تحت آ گیا تھا اور یہ کہ جو کچھ اس نے کیا وہ دوسروں کے ورغلانے سے کیا تھا''۔

ریزیڈنٹ نے ان کو یقین دلایا اور کہا:

''ایسے بہت سے لوگ ہیں کہ ایام شباب میں راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں لیکن اب جبکہ حضور بالغ ہو چکے ہیں یہ بات نہایت مناسب ہے کہ بادشاہت کے فرائض آپ دانشمندی سے انجام دیں تاکہ ریاست برباد نہ ہو''۔

اس کے بعد بادشاہ نے ایک تحریری بیان دیا کہ

''وہ بے اولاد ہے''۔

ریزیڈنٹ نے بادشاہ کی فرمائش پر پوری تفصیل کے ساتھ ان معاملات کی اطلاع گورنر جنرل کو دے دی۔ گورنر جنرل نے بادشاہ کی حق گوئی پر اس کی تعریف کی اور ریزیڈنٹ کو حکم بھیجا کہ چونکہ بادشاہ اودھ لاولد ہے۔لہٰذا مناسب یہ ہے کہ سعادت علی خاں کے موجودہ بیٹوں میں سے جو سب سے بڑا ہو، اسے تخت نشینی کے لیے نامزد کر دیا جائے۔

اس سے قبل جب نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے انہوں نے اس بچہ کو فریدوں بخت سے ملقب کیا تھا۔ ۲۲ جمادی الاول ۱۲۴۴ھ جولائی ۱۸۲۸ء کو بادشاہ بیگم نے نصیر الدین حیدر کی چھبیسویں سالگرہ کی تقریب میں منصوریہ خاندان کی خواتین کو مدعو کیا یعنی نواب نصیر الدولہ ① نواب جعفر علی ② اور نواب کاظم ③ علی کی ماؤں اور دوسری خواتین کو۔ بیگم نے بادشاہ کے لیے نیا خلعت تیار کرا کے پیش کیا۔ رات کو محسن الدولہ کی بہنوں کی شادی مرزا ابو طالب ④ خان مرحوم کے بیٹوں سے انجام پائی اور فریدوں بخت کی اسلامی رسم ختنہ انجام دی گئی جس حجام نے ختنہ کیا تھا اسے بیس ہزار روپیہ انعام دیئے گئے اور پچاس ہزار روپے بادشاہ کو بھیجے گئے کہ درباریوں اور شاہی ملازمین میں تقسیم کر دیں۔

چونکہ ابھی تک بیگم اور بادشاہ کے تعلقات اچھے نہیں تھے اس لیے بادشاہ کا مزاج برہم ہو گیا اس نے ملبوسات اور آرائشی اشیاء نذر آتش کرا دیں اور کرنل جان لو سے درخواست کی کہ

''بیگم شیرینی کا جو حصہ انہیں بھیجے قبول نہ کریں''۔

بیگم نے چاندی کے مرتبانوں میں مٹھائی رکھ کر ریزیڈنٹ کو بھیجی بادشاہ کی خواہش کے مطابق اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ فریدوں بخت کی مشکوک ولدیت صیغہ راز میں نہ رہے۔

اسی زمانے میں بیگم نے فریدوں بخت کی شادی محسن الدولہ کی بیٹی سے کر ڈالی لیکن ابھی تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ دولہن کا انتقال ہو گیا۔

①②③ یہ تینوں سعادت علی خاں کے بیٹے تھے۔
④ یہ سعادت علی خاں کے دامادوں میں سے تھے۔

(میں مناسب موقع پر وہ تمام وجوہ بیان کروں گا جو عام طور سے بادشاہ سے منسوب کیے جاتے ہیں خصوصاً جن پر بادشاہ اور بیگم کے ملازموں کا یقین ہے اور جو بادشاہ کی جانب سے اصلی واقعات کی توضیح وتشریح کا موجب ہوئے ہیں)

آخر کار بادشاہ نے ایک فرمان مشتہر کیا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ

''فریدوں بخت میرا بیٹا نہیں ہے عوام کو چاہیے کہ اسے ولی عہد تسلیم نہ کریں''۔

اس فرمان کا متن ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

فرمان نصیر الدین حیدر شاہ اودھ دربارہ ولدیت منا جان:

''میری والدہ نے منا جان نامی طفل ملقب بہ فریدوں بخت کو جو ایک نیچ ذات عورت سے پیدا ہوا تھا میرا بیٹا ہونا تسلیم کر لیا ہے اور بچپن سے اس کی پرورش کی ہے میں نے ان سے متعدد بار کہا کہ یہ فعل ہمارے عالی مرتبت خاندان کی شان کے منافی ہے اور اس سے بہت زیادہ قباحتیں پیدا ہوں گی۔ میرے والد بادشاہ مرحوم نے بھی کافی تفتیش کے بعد اس کو میرا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کا علم سب لوگوں کو ہے لیکن بیگم کو پھر بھی اصرار رہا اور اس کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو شاہی منصب کے ایک رکن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔اس بچہ کا میرے ساتھ کوئی تعلق رشتہ کا نہیں ہے۔

یہ بات اگرچہ پوری طرح تحقیق نہیں ہو سکتی کہ بیگم نے اسے کہاں سے حاصل کیا تاہم اغلب یہ ہے کہ وہ عورت جس کے بطن سے اس بچہ کا پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے وہ مثل ان دوسری خواصوں کے تھی جو میر فضل علی کے یہاں آتی جاتی تھیں اور جنہیں اس بات سے روکا نہیں جا سکتا۔ یہ بچہ یا تو میر فضل علی کا ہے یا ان لوگوں میں سے کسی کا ہے جن سے ملنے کے لیے وہ عورت آزاد تھی۔لیکن اس کے بچے صرف اسی حالت میں پیدا

ہوتے ہیں جب یہ مان لیا جائے کہ یہ بچہ اسی خواص کے بطن سے پیدا ہوا تھا ورنہ جیسا کہ عام طور سے معلوم ہے کہ یہ بچہ ایک دھوبن کے پیٹ سے جسے اغوا کر کے محل میں لایا گیا تھا پیدا ہوا تھا۔ اسی لیے بادشاہ سابق نے اس بچہ کے غیر اصلی ثابت کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی تھی۔

علاوہ بریں اس کی ولادت کے وقت میں سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچا تھا اس لیے اس بچے کے میرے نطفے سے ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوسکتا چونکہ اس تمام کاروائی کے نتائج پردہ راز میں نہیں رہ سکتے اس لیے پورے معاملہ کی اطلاع گورنر جنرل کو جو اس ملک میں امن اور انتظام کے ذمہ دار ہیں دے دی گئی تھی انہوں نے جواب میں اس بچہ کے غیر اصلی وفرضی ہونے کو تسلیم کر لیا تھا۔ لہٰذا جملہ اشخاص یعنی تمام شہریوں، درباریوں، امراء حکام اور دوسرے وابستگان دربار کی اطلاع کے لیے مشتہر کیا جاتا ہے کہ یہ بچہ غیر اصلی ہے اور شاہی نسل سے نہیں ہے‘‘۔

مشکوک ولدیت کے وجوہ:

گزشتہ بیانات اور مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر۔

پہلی: وجہ شبہ کی تو یہ ہے کہ یہ بچہ ایام حمل کی اصل مدت گزرنے کے یعنی ۲۶ ماہ کے بعد پیدا ہوا تھا۔

دوسری: وجہ یہ کہ بادشاہ غازی الدین حیدر نے اعلان کر دیا تھا کہ یہ بچہ نصیر الدین کا نہیں ہے اور یہی بات گورنر جنرل سے بھی کہہ دی تھی۔

تیسری: وجہ یہ ہے کہ بادشاہ بیگم نے بادشاہ کے صریح حکم اور رسم عام کے برخلاف کہ بچہ کی ولادت کے وقت شاہی گھرانے کی جملہ خواتین کو مدعو کیا جائے ایسا نہیں کیا۔

چوتھی: وجہ یہ ہے کہ دائی نے جس کو اس معاملہ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہونا چاہیے

تھا اس بات سے صاف انکار کر دیا تھا کہ بچہ اس کی موجودگی میں پیدا ہوا اور ساتھ ہی چند نئی باتیں بھی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ

''محل کی عورتیں ایک بچہ کو لے کر آئیں اور میرے حوالہ کر دیا میں نے اس کا نال کاٹا، سکھ چین میں جسے اس بچہ کی ماں بتایا گیا تھا میں نے حاملہ ہونے کی کوئی بھی علامتیں نہیں دیکھیں''۔

پانچویں: یہ کہ اس زمانہ میں جبکہ یہ بچہ پیدا ہوا ایک حاملہ عورت تلاش کی جا رہی تھی چنانچہ ایک حاملہ باندی کو مرشد آبادی غازی حسین خاں نے فروختگی کے لیے محل میں بھیجا تھا (یہ شریف زادہ جو غربت زدہ تھا ان دنوں لکھنؤ میں مقیم تھا۔ معتمد الدولہ کو جب اس سودے کا علم ہوا انہوں نے اسے اپنے کردار کی جواب دہی کرنے کو بلایا لیکن شہر کے بڑے بڑے آدمی چونکہ اس باعزت اور بارسوخ شخص کا خیال کرتے تھے ان کی سفارشیں نیز خود اس کا ان واقعات سے منکر ہونا اس کی بریت کا باعث ہوا)

چھٹی: وجہ شبہ کی یہ ہے کہ اگر مناجان حقیقتاً ان کا بیٹا ہوتا تو بادشاہ کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آتا کہ وہ کیوان جاہ کو جو بلاشک وشبہ ان کا حقیقی بیٹا نہ تھا اپنا ولی عہد مقرر کرتے۔

ساتویں: وجہ یہ ہے کہ کرنل جان لو (ریزیڈنٹ) کی تحقیقات کے موقع پر نصیر الدین حیدر نے ریزیڈنٹ سے براہ راست اور اپنے نائب منتظم الدولہ کے ذریعہ صاف کہہ دیا تھا: مناجان اور کیوان جاہ دونوں میرے حقیقی بیٹے نہیں ہیں اور ریزیڈنٹ سے استدعا کی تھی کہ اسی کے بموجب وہ گورنر جنرل کو مطلع کر دیں تا کہ آئندہ یہ سلطنت ان کے ہاتھ میں نہ چلی جائے اور اصلی دعویدار محروم نہ رہیں۔

بادشاہ نے یہ بھی کہا تھا کہ

''بادشاہ بیگم کے اور بعض مکار اور دھوکہ باز لوگوں کے اثر میں آ کر منا جان کو میں نے اپنا بیٹا تسلیم کر لیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی پیدائش کے وقت میں سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچا تھا''۔

آٹھویں: وجہ یہ کہ فرمان شاہی میں اس بچہ کے فرضی وغیر اصلی ہونے کی تصدیق کر دی گئی تھی اگر چہ شروع میں (ایسٹ انڈیا) کمپنی کے ملازمین یہ خیال رکھتے تھے کہ بادشاہ بیگم اور غازی الدین حیدر کے مابین اختلافات اس انکار کا سبب تھے لیکن مزید تفتیش کی بنا پر جو ہر طرح مکمل تھی خود نصیر الدین حیدر ہی نے بیان دیا تھا کہ یہ بچہ ان کا نہیں ہے۔ چونکہ یہ نا جائز و نا مناسب تھا کہ جائز حقدار کو محروم کر کے نا حق شخص کو تخت نشین کیا جائے گورنر جنرل نے ریزیڈنٹ کو حکم دیا کہ ریاست سعادت علی خاں کے باقی ماندہ بیٹوں میں سے بڑے بیٹے کو منتقل ہو جانی چاہئے۔

غازی الدین حیدر کی وفات

نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی، نواب اور بادشاہ بیگم کے اختلافات اور فریدوں بخت کے شاہی نسل سے ہونے کی فریب کاری کے بارے میں اعلان:

غازی الدین حیدر کی وفات ۲۷ ربیع الاول مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ہوئی اور اسی دن ساڑھے نو بجے شب کو نصیر الدین تخت نشین ہوئے اور ''نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ'' کا لقب اختیار کیا۔سکہ پر یہ شعر ثبت تھا۔

بہ دھر سکہ شاہی زدہ ز لطف الہ
سپہر مرتبہ شاہ جہاں سلیمان جاہ

اگرچہ یہ بات عام طور سے معلوم تھی کہ نئے بادشاہ کے تعلقات اس کے باپ کے وزیر اعظم معتمد الدولہ سے جس کو امور سلطنت میں کلی اختیارات حاصل تھے خوشگوار نہ تھے تاہم انہوں نے وزیر پر ایسی عنایات کیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کو ہی وزیر اعظم کے اعلیٰ منصب پر برقرار رکھیں گے معتمد الدولہ کو خوش کرنے کے جتن کیے اور بادشاہ نے بھی مزید خوشی سے خزانہ شاہی پر اس کو پورے اختیارات دے دیئے۔ جہاں سے اس نے جس قدر چاہا سونے اور جواہرات پر تصرف بے جا کر لیا۔

جمادی الاول کی ۲۰ تاریخ مطابق ۱۰ نومبر لارڈ کیمبر میر سلطنت اودھ کے صدر مقام لکھنؤ آئے۔ ایک شاندار دعوت کے بعد جرنل موصوف اور بادشاہ کے درمیان نجی ملاقات ہوئی جس میں سوائے ریزیڈنٹ کے اور کوئی شریک نہ کیا گیا بادشاہ بیگم کے صلاح ومشورہ کے مطابق بادشاہ نے جرنل سے کہا کہ

''تمام خرابی کا باعث معتمد الدولہ ہے اس کی برخاستگی اور گرفتاری کے بغیر انتظام سلطنت مناسب طور سے نہیں چلایا جا سکتا''۔

اس پر جرنل نے کہا کہ

''اندرونی نظم ونسق میں بادشاہ پوری طرح خودمختار ہیں، تمام ملازمین کی تقرری، برطرفی نیز حراست قطعی طور سے ان کے اختیار میں ہے''۔

پھر ریزیڈنٹ کی موجودگی میں بادشاہ کو معتمد الدولہ کی گرفتاری کی اجازت دے دی۔ یہ راز اس قدر خفیہ رکھا گیا کہ معتمد الدولہ باوجود ہر ذریعہ استعمال کرنے کے اپنی گرفتاری سے قبل اس راز سے باخبر نہ ہوسکا۔ اس زمانہ میں بادشاہ بیگم نے فضل علی اور فیض النساء کو جو بایام جلاوطنی کمپنی کی عملداری میں رہتے تھے اپنی پناہ میں لے کر محل کے اندر چھپا رکھا تھا۔ اس کی خبر تک نہ ہوسکی۔ ان جلاوطنوں کے لکھنؤ واپس آ جانے کے تیسرے دن وہ محل کے دروازے پر دیکھے گئے جو لوگ انہیں جانتے تھے انہوں نے پہچان لیا پھر یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ نواب (معتمد الدولہ) اس سے بہت گھبرایا۔ بادشاہ نے اس واقعہ سے عدم واقفیت کا بہانہ کیا۔ اور نواب کو یہ یقین دلاتے ہوئے کہ جوں ہی کلکتہ سے اجازت آ گئی اسے وزارت عظمٰی کا خلعت عطا کیا جائے گا فرمایا:

''میر (فضل علی) تو بیگم کے امور خانہ داری کا داروغہ تھا اور ممکن ہے کہ وہ کسی کام کی غرض سے آ گیا ہو اسے امور سلطنت سے کوئی واسطہ وسروکار نہیں ہے''۔

بادشاہ نے حیلہ سازی سے کام لیا۔ نواب کے موسومہ خطوطہ میں اسے ''برادر عزیز، لحمک لحمی ودمک دمی'' لکھتے رہے۔ اسی سال ۱۰ اجمادی الثانی مطابق

۲۰ دسمبر کو صبح سویرے لباس خلعت نیابت باہر نکال کر رکھا گیا اور بادشاہ نے چوبدار کے ہاتھ ایک خط بصیغہ راز ریزیڈنٹ کو بھیجا جس میں درخواست کی گئی کہ آغا میر (معتمد الدولہ) کو جیسے ہی وہ اس کی کوٹھی پر پہنچے گرفتار کر لیا جائے۔ پھر معتمد الدولہ کو طلب کیا، اسے خلعت دکھایا اور کہا کہ

''پہلے ریزیڈنٹ کے پاس جا کر چند امور پر گفتگو کر لے اور فوراً واپس آ کر خلعت پہننے کی رسم ادا کرے''۔

نواب اس بات سے نہایت درجہ مطمئن ہوا مگر بری طرح دھوکہ کھایا۔ جیسے ہی وہ ریزیڈنٹ سے ملاقی ہوا اور گفتگو شروع کی انگریز سپاہیوں کی دو کمپنیوں نے زیر کمان کیپٹن سیمویل بچ اسے گھیر لیا اور کہا کہ اپنی تلوار حوالہ کر دو اسی لحہ نواب خواب غفلت سے چونکا اور محسوس کیا کہ اس سے دغا کی گئی ہے۔ ریزیڈنٹ نے اس کے بعد ساری باتیں اسے بتا دیں اور کہہ دیا کہ

''یہ سب کچھ بادشاہ کے حکم کے بموجب کیا گیا ہے اور خطوط بھی بادشاہ کے اسے دکھا دیئے''۔

نواب نے اس پر ریزیڈنٹ سے عاجزانہ درخواست کی میری آبرو کا تحفظ دیا جائے ریزیڈنٹ نے اپنی مدد کا اسے یقین دلایا اور ہاتھی پر سوار کر کے انگریز سپاہیوں کی حفاظت میں اسے اس کے مکان پر روانہ کر دیا۔ بادشاہ نے اسی دن اس کے رشتہ داروں، دوستوں اور لواحقین کے گھروں پر پہرا بیٹھا دیا۔ تین دن تک شہر میں بڑا غوغا و ہنگامہ مچا رہا اور غنڈوں نے بہت سے مکانات اس بہانے سے لوٹ لئے کہ وہ معتمد الدولہ کے وابستگان کے ہیں بالآخر ریزیڈنٹ نے اس شورش و ہنگامہ کو بند کرایا۔ اسی دن خلعت وزارت میر فضل علی کو عطا ہوا۔ ان دونوں کارروائیوں یعنی

انقلاب وزارت اور ہنگامہ خیزی کی ذمہ دار بادشاہ بیگم تھی جو اس نے بادشاہ کو پرانے زمانے کے بادشاہوں کے قصے سنا سنا کر اور ان پر عمل کرنے کی ترغیب دے کر سرانجام دیئے تھے۔

اس کے بعد بیگم نے ریزیڈنٹ کو خود اپنے ہاتھ سے خط لکھا جس میں یہ درخواست کی تھی کہ وہ آغا میر معتمد الدولہ کو اس کے حوالے کر دے تاکہ اس کی غداری کی سخت سزا دی جائے مگر ریزیڈنٹ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

اگرچہ بادشاہ روزانہ صبح وشام بیگم کی خدمت میں پابندی سے حاضر ہوتا اور اس کے احکام کی تعمیل کو فرض منصبی سمجھتا تاہم یہ بدیہی امر ہے کہ جب صدر ریاست کسی شخصیت کی اس قدر تعظیم وتوقیر کرے تو یقیناً اس کا (یعنی بیگم کا) رتبہ بہت ہی بلند ہوگا پھر بھی میر فضل علی اور فیض النساء کا محل میں جو اثر تھا اور امور سلطنت میں جو مداخلت وہ کرتے تھے اس سے بادشاہ آزردہ خاطر ہو گیا مگر اس نے اپنے اصلی احساسات کو ظاہر ہونے نہیں دیا۔

بالآخر میر فضل علی نے کنارہ کشی اختیار کی اور وزارت عظمیٰ کے فرائض سے وہ اس وقت کے بعد سے جبکہ ولیم میور نے اس کی بے عزتی کی تھی اور اس کے سر پر سے زبردستی دستار اتار لی تھی دست بردار ہو گیا اور امور سلطنت کی انجام دہی اب اقبال الدولہ پسر فتح علی خاں، راجہ رام دیال اور جعفر علی خاں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ یہ لوگ اپنی ناتجربہ کاری اور کم عمری کے سبب ایسی ذمہ داری کے منصب کے لیے چونکہ ناموزوں ثابت ہوئے اور جلد ہی شراب نوشی وغیرہ جیسی بدکاریوں میں مبتلا ہو گئے بادشاہ نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ مہدی علی خان منتظم الدولہ کو وزارت عظمیٰ کا چارج لینے کے لیے فرخ آباد سے بلائے انگریز افسروں نے بھی اس خیال سے اس بات کو پسند کیا

کہ بادشاہ چاہتا ہے کہ سلطنت کے نظم ونسق کو بہتر بنانے کے لیے اس ذمہ داری کو ایسے شخص کے سپرد کرے جس کی عادتیں کفایت شعارانہ ہوں اور انتظامی امور کا اسے تجربہ بھی ہو۔

احکام شاہی کی متابعت میں منتظم الدولہ نے ۱۷ جمادی الثانی ۱۲۴۶ھ مطابق ۴ نومبر ۱۸۳۰ء کو وزارتِ عظمیٰ کا چارج سنبھالا اور کفایت شعاری کے ساتھ سلطنت کا انتظام کرنا شروع کیا۔ منتظم الدولہ تو فطرتاً ہی یہ چاہتا تھا کہ شاہی خزانہ معمور ہو جائے مگر بادشاہ بیگم ان مذہبی بدعات واختراعات کی انجام دہی میں جن کی پابندی وہ اسلام کے پانچ اصلی وبنیادی اصول وفرائض سے زیادہ اہم سمجھتی تھی اسراف بے جا کرنے پر تل گئی۔ اس کے نوکروں کو روپیہ طلب کرنے کے لیے روزانہ نواب کے پاس آنا پڑتا تھا وزیر آخر کار تنگ آ گیا اور بیگم کی ان بے کار اور بے جا فضول خرچیوں پر اس نے کنایتاً رائے زنی کی جو بیگم کو ناگوار ہوئی کیونکہ وہ تو ان فضول خرچیوں کی عادی ہو گئی تھی۔

یہ دونوں (بیگم اور وزیر) اس معاملہ میں فطرتاً ایک دوسرے کی ضد تھے لہٰذا ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ نواب نے اب بادشاہ کے سامنے بھی اس بارے میں وقتاً فوقتاً رائے زنی کی اور بیگم سے اس کو برگشتہ کرنا چاہا۔ اسی عرصہ میں بادشاہ نے بسم اللہ نام کی ایک خوبصورت عورت سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے تھے۔ جسے ''نواب مخدرہ زماں، مہد عظمیٰ، بلقیس دوراں، ملکہ آفاق، قدسیہ سلطان، مریم بانو بیگم'' کے خطابات دیئے تھے۔

اس عورت کو جب معلوم ہوا کہ بادشاہ کی دلی آرزو یہ ہے کہ اس کے اولاد نرینہ پیدا ہو تو اس مکارہ نے حاملہ ہونے کا بہانہ کیا۔ بادشاہ بھی دھوکے میں آ گیا اس نے دوسری سب بیگمات پر اسے برتری وفوقیت دے دی اور اس کو خوش رکھنے کی ہر طرح

کوشش کرتا رہا۔ شروع شروع میں قدسیہ اور بادشاہ بیگم کے تعلقات اچھے رہے لیکن کچھ دنوں بعد ان دونوں میں کھٹ پٹ ہوگئی اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے۔

جھوٹے اور مصنوعی حمل کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا کہ ایک رات قدسیہ جب بادشاہ کے پاس تھی اس نے کہا کہ ہونے والا بچہ باوجود حقیقی وارث ہونے کے تخت نشینی سے محروم کر دیا جائے گا کیونکہ دستور ہے کہ سب سے بڑا بیٹا ہی تخت نشین ہوتا ہے اور بادشاہ سلامت نے تو بادشاہ بیگم کے ایما پر غیر اصلی منا جان فریدوں بخت کو ولی عہد نامزد کر دیا ہے اور اس کی اطلاع بھی کمپنی کو دے دی ہے۔ اس نے پھر تجویز پیش کی کہ ناجائز تخت نشینی کو روکنے کے لیے قرین مصلحت ہے کہ فوری تدابیر اختیار کی جائیں۔

قدرت کو یہی منظور تھا کیونکہ یہ عین اس وقت کا واقعہ ہے جب گورنر جرنل نے فریدوں بخت کے حق وراثت کے متعلق تحقیقات اس خیال سے کرائی تھی کہ درصورت فوت ہو جانے بادشاہ کے وارث تخت کے انتخاب میں کوئی دشواری نہ ہو اور مستحق شخص محروم نہ رہ جائے چونکہ بادشاہ کے پاس اب اپنی ماں بادشاہ بیگم کے اثرات کو کم کرنے کے لیے وجوہ بھی تھے اس نے اپنی تائید میں ہر طرف سے رائیں حاصل کر لیں۔

کمپنی کے نمائندے جان لَو نے جب تحقیقات کی تھیں اس وقت ہی بادشاہ نے صاف صاف کہہ دیا تھا:

''قبل اس کے کہ میں سن بلوغ کو پہنچتا بیگم نے ایک بچہ کو گود لے لیا جو ایک باندی کے پیٹ سے اور میر فضل علی یا کسی اور شخص کے نطفہ سے پیدا ہوا تھا اور اس کو میرا بیٹا بنا دیا''۔

بادشاہ نے مزید کہا تھا:

''مجھے اندیشہ ہے کہ انگریز جیسا کہ عام طور سے یقین کیا جاتا ہے کہیں اس

کو میرا بیٹا تسلیم نہ کرلیں اور انتظام سلطنت اس کے سپرد کر دیں لہٰذا میں اعلان کرتا ہوں کہ اب اگر کوئی بچہ میری کسی عورت کے پیٹ سے پیدا ہو تو صرف وہ ہی نہ کوئی اور میرا وارث ہونے کا حق دار ہوگا''۔

اس کے بعد بادشاہ نے جو کچھ زبانی بیان کیا تھا اس کو پختہ کرنے کے لیے ریزیڈنٹ کو اس کے متعلق ایک تحریری بیان بھی لکھ کر دے دیا۔

اسی دن جبکہ یہ بیان دیا گیا تھا ریزیڈنسی لوٹتے وقت انگریز سپاہیوں سے جو بیلی گارڈ کے دروازہ پر متعین تھے ریزیڈنٹ نے یہ کہہ دیا کہ اب وہ منا جان کی سواری کے وقت آئندہ سے کوئی تعظیم نہ دیں جیسا کرنے کے وہ برسوں سے عادی رہے ہیں اور پھر جملہ اطلاعات جو اسے ملی تھیں گورنر جنرل کو ارسال کر دیں۔

گورنر جنرل کا جو جواب موصول ہوا وہ یہ تھا کہ بادشاہ کے خط سے نیز خود اس کے یعنی ریزیڈنٹ کے خط سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بادشاہ اودھ بے اولاد ہے اس لیے آئندہ وارث تخت سعادت علی خاں کا سب سے بڑا بیٹا ہوگا۔ بادشاہ نے اس کے بعد ایک اعلان جاری کیا جس میں اس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ فریدوں بخت اس کا اصلی بیٹا نہیں ہے اس اعلان کو رومی دروازہ جیسے پبلک مقامات پر چسپاں کرا دیا تا کہ دارالحکومت کے باشندے اور مفصلات کے رہنے والے اور وہ لوگ جو حق وراثت کے دعویدار ہوں سب ہی مطلع ہو جائیں آخر میں نائب (منتظم الدولہ) چند واقعات بادشاہ کے نوٹس میں لایا جس سے وہ بیگم سے بدظن ہو گیا لیکن قبل ازیں کہ اس کا کوئی قابل لحاظ اثر ظاہر ہوتا بیگم کا صرف ایک اشارہ ۷ ربیع الاول ۱۲۴۸ھ (۵ اگست ۱۸۳۲ء) کو منتظم الدولہ پر زوال لانے کا موجب ہو گیا۔

اسی سال ۴ جمادی الثانی مطابق ۲۹ اکتوبر کو روشن الدولہ اس کا جانشین ہوا۔

اس نے سبحان علی خان کو اپنا مشیر و مددگار مقرر کیا۔ اب بادشاہ نے بیگم سے اپنی بیزاری کے احساسات کا علانیہ اظہار شروع کر دیا۔ نائب اور اس کے مشیر یہ جانتے تھے کہ مدار المہامی کا عہدہ بیگم کے اثرات کے باعث اتنے بہت سے ہاتھوں سے نکل چکا ہے لہٰذا انہوں نے بادشاہ بیگم کے خلاف اکسانے کی کوشش کی کیونکہ صرف اسی طرح وہ اس عہدے پر فائز رہ سکتے تھے۔ بیگم سے بادشاہ سخت ناراض ہو گیا۔ اب تک تو وہ بیگم کے محل میں روزانہ جایا کرتا تھا لیکن اب اس نے اس دستور کو بدل دیا۔ اور دو دو تین تین دن کے وقفہ کے بعد جانے لگا۔ قدسیہ سے جو تعشق فریفتگی بادشاہ کو اس وجہ سے تھی کہ اس نے حاملہ ہونے پر بہانہ کیا تھا وہ اب نفرت سے بدل گئی اور نزاعات پیدا ہو گئے جن سے قدسیہ اس درجہ بوکھلا گئی کہ ناامید و مایوس ہو کر اس نے زہر کھا لیا اور ۱۵ ربیع الثانی ۱۲۵۰ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۸۳۴ء کو فوت ہو گئی۔ مرنے کے بعد اس کی پوشاک کے ایک کنارے میں پسی ہوئی سنکھیا بندھی ہوئی نکلی۔

بہرکیف قدسیہ کو نئی کربلا کے متصل مہدی [1] گنج میں دفن کیے جانے کے بعد بادشاہ نے شدید رنج وغم کا اظہار کیا اور خود اس نے اور جملہ امرائے دربار نے سیاہ ماتمی لباس پہنا اس رنج وغم میں بادشاہ نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔ بادشاہ بیگم نے جب یہ سنا تو خود ہی اس کے پاس آئی اور مادرانہ شفقت والفت سے تنبیہ ونصیحت کی کہ رنج وغم کا اس قدر غلبہ نہ ہونے دو کہ اپنی بھی جان خطرہ میں پڑ جائے بیگم نے کہا:

''خدائے تعالیٰ نے تو اس سے بھی زیادہ حسین وخوش اندام عورتیں پیدا کی ہیں ایک مکارہ کے لیے جان دے دینے سے کیا حاصل! بہت سی

[1] مہدی گنج محلہ سعادت گنج کا ایک حصہ ہے جو لکھنؤ کے جنوب مغربی علاقہ میں ہے اور حکیم مہدی کے نام سے موسوم ہے جو اودھ کے وزرا میں سے بہت مشہور وزیر ہوا ہے۔

عورتیں اس سے بھی کہیں بہتر موجود ہیں تم چاہو تو حاصل ہو سکتی ہیں''۔

بادشاہ تو اس سے پہلے ہی سے ناخوش تھا۔تنبیہ اور نصیحت کے ان الفاظ سے وہ اور زیادہ خفا ہو گیا اور یہ الزامی جواب دیا:

''ذرا یاد تو کرو، میر فضل علی کے مرنے پر تم کیسی کچھ غمزدہ ہوئی تھیں۔اگر تم کو مجھ سے ماں کی سی محبت ہوتی تو خود تم نے بھی ماتمی لباس پہنا ہوتا مگر ماں کی سی محبت تم میں ہے نہیں کیونکہ تم میری حقیقی ماں نہیں ہو''۔

بیگم نے بھی ویسا ہی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور کہا:

''میں نے سیاہ ماتمی لباس سوائے سید الشہدا امام حسین کے ماتم کے اور کبھی نہیں پہنا اور نہ کبھی پہنوں گی۔ہمارے خاندان میں غازی الدین حیدر یا سعادت علی خاں کی موت پر بھی کسی نے سیاہ لباس نہیں پہنا۔بظاہر کچھ بدخواہوں نے تمہیں میرے خلاف اکسا دیا ہے اور وہ ہماری بربادی کے خواہاں ہیں۔اس کا نتیجہ سوائے رنج و افسوس کے کچھ نہ ہوگا''۔

بادشاہ کا بیگم سے محل خالی کرانا

بیگم غصہ میں بھری ہوئی اپنے محل میں لوٹ گئی۔اب بادشاہ نے اس کو اور بھی تنگ کرنا شروع کیا۔اسے حکم بھیجا وہ محل خالی کر دے۔بیگم نے جواب دیا کہ

''یہ محل مجھے میرے شوہر نے دیا ہے میرے لیے ناممکن ہے کہ اسے خالی کر دوں''۔

بادشاہ نے پھر یہ تجویز پیش کی کہ

''مجھ سے بیس یا پچیس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ لے لیا کرو اور شہر میں اپنی پسند کی کسی دوسری جگہ جا کر رہنے لگو''۔

بیگم نے ایسا کرنا پسند نہ کیا اور کہا:

''میں نہیں چاہتی کہ ماہانہ تنخواہ لوں تاہم اگر تم چاہتے ہو کہ میں محل چھوڑ دوں تو صرف اس صورت میں چھوڑ سکتی ہوں کہ علاقہ سلونؔ جسے پہلے میرے شوہر نے اور بعد کو تم نے دیا تھا مجھے پھر دے دیا جائے اور اس پر عملدرامد کا ضامن ریزیڈنٹ ہو''۔

بادشاہ نے اس کا ذکر ریزیڈنٹ سے کیا اور کہا:

''میں بیگم سے اس کے سوائے اور کچھ نہیں چاہتا کہ وہ محل خالی کر دیں اگر آپ کی مدد سے بیگم مع اپنے تمام مال منقولہ اور ساز وسامان کے کسی اور مقام کو منتقل ہو جائیں تو میں مطمئن ہوں۔انہیں ماہانہ تنخواہ چاہے کتنی ہی ہو دیتا رہوں گا بشرطیکہ وہ رقم آپ متعین کر دیں''۔

بادشاہ کی بار بار درخواست کے باوجود ریزیڈنٹ نے اس بات کو نامنظور کر دیا اور کہا:

''یہ ایک ذاتی ونجی معاملہ ہے۔صدر مقام سے مجھے احکام ملے ہیں کہ میں صرف معاملات سلطنت میں دخل دے سکتا ہوں اس لیے میں اور کوئی کام کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا''۔

بادشاہ کا بیگم کو ستانا، مزدوروں سے گالیاں دلوانا، فضلہ سے بھری ہوئی ہانڈیاں محل میں پھینکوانا:

بیگم سے بادشاہ کی ناراضگی اب اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے مزدور مرد اور عورتوں کو جو شاہی عمارتوں کی تعمیر کے کام پر لگے ہوئے تھے حکم دیا کہ پہلے سے کوئی اطلاع دیئے بغیر وہ عمارت کی چھتوں پر جہاں سے بیگم محل کے اندرونی کمروں کا سامنا ہوتا ہو چڑھ جائیں اور وہاں سے بیگم کو ایسی گالیاں دیں کہ وہ غصہ میں آ کر محل چھوڑ کر چلی جائے لیکن بیگم نے مستقل مزاجی دکھائی اپنے کمرے سے نہ ہٹی اور خادماؤں کو حکم دیا کوئی جواب نہ دیں۔ چونکہ اس احمقانہ ترکیب پر بھی محل خالی نہ کیا گیا۔ اس لیے بادشاہ نے پھر یہ حکم دیا کہ

''شاہی نوکر مٹی کی ہانڈیاں فضلہ اور پیشاب سے بھر بھر کر محل کے اندر پھینکیں''۔

بیگم کو اس طرح بہت زیادہ اذیت ومصیبت میں ڈال دیا گیا۔لیکن وہ ان مقبروں میں جا کر گوشہ نشین ہوگئی جو اس نے بارہ اماموں کی یادگار کے طور پر تعمیر کرائے تھے اور رات دن قران مجید کی تلاوت کرنے میں گزارتی رہی۔ بادشاہ نے اس کے بعد یہ حکم دیا کہ

''فضلہ سے بھری ہوئی ہانڈی ان مقبروں کے اندر بھی پھینکی جائیں''۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ بیگم نے مقبروں کو خود اپنے ہاتھوں سے اور اپنی خادماؤں کی مدد سے صاف کیا اور خود ان کے اندر ہی مقیم رہی۔

کچھ عرصہ تک بیگم ان سب باتوں کو برداشت کرتی رہی بادشاہ نے جب دیکھا کہ اس حد تک ستانے اور اذیت دینے کے باوجود جس سے زیادہ کسی خاتون کے ساتھ برابرتاؤ نہیں کیا جا سکتا اس کا مقصد دلی پورا نہیں ہوا تو اس نے غلام یحییٰ خان، فتح علی خاں اور قندھاری رسالہ کے افسروں انگریزی عمال اور دوسرے ملازمین اور درباریوں کو بھیجا تاکہ وہ بیگم کو ترغیب دیں کہ مکان خالی کر دے اس شرط پر اسے پچیس ہزار ماہوار تنخواہ دی جائے گی مگر بیگم نے کوئی بات نہ سنی اور اپنی خادماؤں کے ذریعہ انہیں کہلا بھیجا:

''مجھے تم میں سے کسی پر اعتبار نہیں کیونکہ تم نے خدا اور رسول کا خوف بھلا دیا محض اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے مجھے دھوکہ دے رہے ہو۔صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ بادشاہ وہ جاگیر مجھے عطا کر دے جو میرے شوہر نے مجھے دی تھی اور ریزیڈنٹ بیچ میں پڑ کر اس کی ضمانت دیں صرف اسی صورت میں مکان خالی کر سکوں گی''۔

ریزیڈنٹ نے مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر مداخلت کرنے سے انکار کر دیا اور بیگم و بادشاہ دونوں کو لکھا کہ

''معاملہ ذاتی و نجی حیثیت کا ہے اس لیے اس کو الگ رہنا چاہیے''۔

اور چند نصیحت آمیز کلمات بھی لکھے۔

بادشاہ نے جب دیکھا کہ وہ اپنی ترکیبوں میں ناکام رہا ہے اور تمام طبقات

کے لوگ اس طور وطریق سے متنفر ہیں جس سے اس نے ایسی ذات کو ستایا جس نے اس کو بڑی خبر گیری سے پرورش کیا اور اس کی مربی رہی اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں :

''کوئی نیچ سے نیچ اور کمین سے کمین بھی اس درجہ رذالت پر نہیں اترے گا''۔

تو بادشاہ غضبناک ہو گیا اس نے فرح بخش کوٹھی کو چھوڑ دیا اور اس ارادہ سے دولت خانہ میں آ گیا کہ جب تک بیگم محل کو خالی نہ کر دے گی وہ واپس نہ جائے گا۔حسن اتفاق سے یہ وہ وقت تھا کہ کرنل لو گورنر جنرل لارڈ کیونڈش بینٹنگ سے ملاقات کے لیے کلکتہ جا رہے تھے بادشاہ نے گورنر جنرل کے نام انہیں خط دیا جس میں اس معاملہ کو بالتفصیل بیان کیا گیا تھا اور ان سے یہ درخواست کی گئی تھی کمپنی کے نمائندوں کو وہ اس معاملہ میں مداخلت کرنے کی اجازت دیں۔

بیگم نے بھی بصد مشکل ایک خط گورنر جنرل کے نام ریزیڈنٹ کی معرفت بھیجا جس میں یہی خواہش ظاہر کی تھی کہ اس معاملہ میں مداخلت کریں اور فیصلہ دیں اور یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے حکم کی تعمیل کرے گی اور فرمانبردار رہے گی۔

ریزیڈنٹ طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد ڈاک گاڑی سے ۲ بجے دوپہر کو کلکتہ پہنچا اس دن ۷ شعبان مطابق ۹ دسمبر تھی۔گورنر جنرل سے ملاقات میں ریزیڈنٹ نے بادشاہ کے خطوط پیش کیے اس پر گورنر جنرل نے حکم دیا کہ ایسے معاملات میں دخل دینے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔

ریزیڈنٹ جب واپس آیا اور بادشاہ کو گورنر جنرل کے حکم کی اطلاع ہوئی تو اس نے بیگم کو اور بھی زیادہ ستانا شروع کیا اس پر بیگم نے ریزیڈنٹ سے شکایت کی۔اس نے جواب دیا کہ

''گورنر جنرل نے دخل دینے کی ممانعت کر دی ہے''۔

اس پر اس کی تمام امیدوں پر جو اس نے انگریزوں سے وابستہ کر رکھی تھیں پانی پھر گیا۔

فوجی طاقت استعمال کر کے محل خالی کرانا:

ریاست کے کار پردازوں نے اب درشن سنگھ غالب① جنگ کو حکم دیا کہ

''وہ بیگم کی عزت وحرمت اور حیثیت و درجہ کا لحاظ کیے بغیر محل کو خالی کرا لے''۔

اس نے شاہی حکم کے بموجب بیگم کی قیام گاہ کے ہر طرف سپاہیوں کے چھوٹے چھوٹے دستوں کا پہرہ لگا دیا سب سے آخر میں راجہ شیوادین سنگھ② کو بھیجا۔ شیوادین نے سپاہیوں کی بڑی تعداد ساتھ لے کر بیگم کے ملازمین میں سے گیارہ کو بشمول کشن چند وغیرہ گرفتار کر لیا اور انہیں ٹیرھی کوٹھی③ میں زیر حراست رکھنے کے لیے بھیج دیا۔

---

① غالب جنگ کو غازی الدین حیدر نے بہت ہی ادنیٰ درجہ سے ترقی دی ۱۸۲۵ء میں وہ اس کا بہت منظور نظر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے نصیر الدین حیدر کا بھی اس نے اپنے آقا کی مہربانی کا بے جا استعمال کیا۔ وزیر آغا میر نے اس کی دخل اندازی اور متبذل گستاخی کو نا قابل برداشت پا کر ایک دن بادشاہ کی ناراضی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا تنزل کرا دیا اور گرفتار کرا کے اپنے آوردے تاج الدین حسین انچارج ضلع سلطان پور کے پاس فوراً روانہ کر دیا جہاں اس کے ساتھ اس قدر سخت برتاؤ کیا گیا کہ اس تشدد اور غذا کی کمی سے وہ قریب المرگ ہو گیا اور جتنی دولت اس نے اکٹھی کر رکھی تھی وہ سب اگلوائی گئی۔ غازی الدین کی وفات اور اس کے فرزند نصیر الدین حیدر کی جانشینی کے چار سال بعد غالب جنگ کو ۱۸۳۱ء میں وزیر حکیم مہدی نے پھر دربار میں ایک معتبر آسامی پر مقرر کرا دیا۔ وزیر نے اپنے دو سال کے دوران حکومت میں اس کو قابو میں رکھا۔ اسّی سال کی عمر میں غالب جنگ یکم مئی ۱۸۵۱ء میں فوت ہوا۔ (سلیمن کا سفر)

② یہ نیچ ذات کا شخص تھا نصیر الدین حیدر نے بطور عنایت خاص اسے راجہ کا خطاب عطا کیا تھا۔

③ یہ کوٹھی چھتر منزل کے شمال میں سعادت علی خاں نے بنوائی تھی۔

۲۰ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۸۳۵ء کو محل کا محاصرہ کر لیا گیا اور زندگی کی معمولی ضروریات کھانا پانی تک اندر نہ پہنچنے دیا۔ بیگم نے اپنے چند خاص برداروں کو مسلح کر کے محل کے دروازہ پر تعینات کر دیا مگر اس کے ان سپاہیوں کا تو کہیں پتہ نشان نہ تھا جن کو بیگم باقاعدہ تنخواہ دیا کرتی تھی۔

لہٰذا وہ جان گئی کہ خواجہ سراؤں نے اسے دھوکہ دیا ہے اور اس رقم کو جو اس کے خزانہ سے اپنی تنخواہ کے لیے لیا کرتے تھے خورد برد بھی کر گئے ہیں لیکن اس نے اس پر کچھ دھیان نہ دیا کیونکہ ایسے وقت میں اس بات کی تحقیقات کرنا یا ان کی بے وفائی پر سزا دینا خلاف مصلحت ہوتا۔

راجہ نے پھر پانچ مضبوط سیڑھیاں محل کی دیواروں پر چڑھنے کے لیے منگائیں اور متصلہ باغوں میں نصب کر کے زمین کھودنے والوں کو حکم دیا کہ دیوار پر چڑھ جائیں اور عمارت کو گرا دیں۔ بیگم اپنی مغلانیوں کے ساتھ محل سے باہر نکل آئی اس کے حبشی غلاموں نے اینٹیں پتھر اور لکڑی کے ٹکڑوں کی بوچھاڑ شروع کر دی حملہ آوروں کو فرار ہونا پڑا۔ عورتوں نے دروازہ تک ان کا تعاقب کیا۔ اس لڑائی دنگے میں راجہ مذکور اور انعام علی چیلۂ سلطانی اینٹوں کے روڑوں سے زخمی ہو گئے۔

بیگم اس کے بعد اندر واپس چلی گئی راجہ نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ

''بیگم کے پردہ کا لحاظ کیے بغیر محل میں گھس جائیں''۔

پھر کسی نے اندر سے ایک فیر (فائر) بندوق کا کر دیا اس پر دونوں طرف سے فیر ہونا شروع ہو گئے۔ چار حبشی کنیزوں نے گولی لگنے سے اپنی مالکہ کے قدموں پر دم توڑ دیا۔ ظالم سنگھ صوبیدار ایک راہ گیر اور شاہی فوج کا ایک سپاہی بندوق کے فیروں سے جو محل کی چھت پر سے کیے گئے تھے زخمی ہو گئے۔ ابراہیم خاں خاصہ بردار، ایک

نجیب سپاہی① اور چند باندیاں بھی جو چھت پر تھیں گولی لگنے سے مرگئیں ملازمان شاہی نے ان کی لاشیں جو بیگم کی جانب سے مرے تھے دریائے گومتی میں پھینکوادیں۔

لڑائی دنگے کے اس ہنگامہ کی وجہ سے شہر میں دوکانیں بند ہوگئیں۔ بادشاہ کو جب یہ حال معلوم ہوا اس نے ایک توپ بیگم کے محل کے دروازے پر بھجوا دی اور علی رضا کوتوال کو حکم دیا کہ رعایا کا خوف دور کرے اور انہیں دکانیں کھولنے پر آمادہ کرے۔

بیگم اب بھوک پیاس سے نڈھال ہوکر لڑائی سے اکتا گئی تھی وہ باغ کی سمت سے اماموں کے مقبروں کے دروازے پر پہنچ گئی اور راجہ سے حفاظت کی طالب ہوئی۔ ٹھیک اسی وقت روشن الدولہ بادشاہ کے حضور میں پہنچا اور کہا کہ

''بیگم نے اس سے مدد چاہی ہے اور الماس② باغ میں منتقل ہو جانے کو تیار ہے''۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ

''فوراً ان کی سواری کے انتظامات کیے جائیں''۔

چنانچہ روشن الدولہ نے پچاس رتھ اور ستر محافے بھیج دیئے۔ کوتوال سے کہا گیا کہ

''غلہ کے بیوپاریوں کو الماس باغ بھیج دیا جائے''۔

---

① عمادالسعادت کے مصنف نے نجیب کے بارے میں لکھا ہے کہ کوڑہ جہاں آباد اور بکسر کی لڑائی میں شکست ہونے کے بعد شجاع الدولہ کو اپنے رسالہ پر اعتماد نہ رہا تھا...... چند پلٹنیں بھرتی کیں جن کی وردی سبز رنگ کی رکھی اور نجیب سے ملقب کیا۔ میر کرم اللہ مصور کے بیٹے میر احمد کو ان کا سردار بنایا۔ ہر سپاہی کو تنخواہ چھ روپیہ فی نفر سے زیادہ نہ تھی اور نیچ قوم کے لوگوں کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ سیر المتاخرین (جلد ۳) میں نجیب پلٹن کا ذکر قدرے تفصیل سے ہے اور مشاہرہ فی نفر پندرہ روپیہ بیان کیا ہے۔

② الماس باغ لکھنؤ سے تقریباً تین میل پر تھا۔ لکھنؤ سے ملیح آباد جاتے ہوئے پختہ سڑک سے الماس باغ کے احاطہ کی دیواریں نظر آتی ہیں۔

بیگم ان پانچ چھ عورتوں کو جو لڑائی دنگے میں زخمی ہوئی تھیں اپنے ساتھ لے گئی۔ الماس باغ میں وہ غروب آفتاب سے دو گھنٹے بعد پہنچی۔ اس قدر پیاسی تھی کہ راستہ ہی میں شربت سے پیاس بجھانے پر مجبور ہوئی۔ اس کی روانگی کے وقت مادھو سنگھ اپنے آدمیوں کو لے کر اور دلجیت ① سنگھ سپاہیوں کی دو کمپنیوں کے ساتھ اردلی میں چلا گیا۔

الماس باغ کے مکانات چونکہ خالی پڑے ہوئے تھے، مرمت بھی ان کی نہیں کی گئی تھی وہاں نہ روشنی کا انتظام تھا نہ فرنیچر۔ اس لیے بیگم اور فریدوں بخت نے کچھ کھائے پیے بغیر تمام رات سکھ پال میں گزاری اور سب کنیزوں اور خدمت گارنیوں نے ساری رات جاگ کر کاٹی۔

بادشاہ کے حکم سے فتح علی خاں کپتان بیگم کے محل گیا اور تمام کمروں کو جو ہر طرح سے آراستہ پیراستہ تھے مقفل کر دیا اس کے بعد بیگم کے نوکروں کو حکم شاہی سے رہا کر دیا گیا۔

اس لڑائی دنگے میں بیگم کے اسباب منقولہ کا بہت سا حصہ برباد ہوا اور لوٹ لیا گیا پھر بادشاہ کے ملازمین نے بحکم شاہی اس سامان کو جو باقی رہ گیا تھا گاڑیوں میں لدوا کر الماس باغ کو منتقل کر دیا اور ان سب کنیزوں اور خدمت گارنیوں کو جو بیگم کے ساتھ نہیں جا سکتی تھیں یا تو اس وجہ سے کہ سواریاں نہیں تھیں یا رات ہو جانے کے سبب ان سب کو اپنی حفاظت میں پہنچا دیا۔

① دلجیت سنگھ نسل سے راجپوت اور پیشہ ور سپاہی تھا وہ نصیر الدین حیدر کا بہت منظور نظر تھا۔

بادشاہ بیگم الماس باغ میں

اور تقریباً نوسوسپاہیوں کی بھرتی زیر کمان امام بخش بھشتی، ریاست میں مزید شورش کو روکنے کے لیے ریزیڈنٹ کی مداخلت:

بادشاہ بیگم جیسا اوپر بیان ہوا ہے جب الماس باغ میں رہنے لگی اس نے کامل غور وفکر کے بعد نیا منصوبہ بنایا۔امام بخش بھشتی ساکن فتح گنج کو حکم دیا کہ

''وہ خفیہ طور سے آزمودہ کارلڑاکا آدمیوں کی ایک تعداد بھرتی کرے جو پوری طرح مسلح ہوں''۔

اول اول تو بادشاہ اور کارپردازان سلطنت کو اس کی کچھ خبر نہ ہوئی۔لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد جب کثیر تعداد اِن لوگوں کی دیہات میں پھیل گئی اور فصلوں اور پھلوں کو لوٹنے لگی۔خبرنویسوں کی رپورٹوں سے بادشاہ کو حال اس کا معلوم ہوا تو اس نے بیگم کو حکم دیا کہ

''ان لوگوں کو برطرف کردے''۔

بیگم نے عذر کیا کہ وہ ایک سنسان اور اجاڑ مقام میں رہتی ہے اس لیے اس کو سپاہیوں کی یہ فوج اس غرض سے رکھنی پڑی کہ یہ لوگ اس کے مکانوں کا پہرہ دیتے اور چوروں اور ڈاکوؤں کے حملوں سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

بادشاہ نے اس پر اعلان کردیا کہ

''جوکوئی بادشاہ بیگم کی ملازمت کرے گا۔اس پر مقدمہ چلایا جائے گا''۔

چونکہ آوارہ منش انفار کی اتنی بڑی جماعت کا شہر کے ایک سرے پر متعین رہنا

خطرے سے خالی نہ تھا۔ لہٰذا ریزیڈنٹ کو مطلع کیا اور امن برقرار رکھنے کے لیے شاہی فوجیں بھیج دی گئیں۔ شاہی افواج نے الماس باغ کے قریب نالہ کے اس پار پڑاؤ ڈالا بیگم کے سپاہیوں نے نالہ کے دوسرے کنارے پر اپنا جماؤ رکھا۔

ریزیڈنٹ نے اگرچہ شروع میں مداخلت کرنے سے اس بنا پر احتراز کیا تھا کہ یہ قضیہ خانگی نوعیت کا تھا لیکن اب معاملہ نے جو صورت اختیار کی اس سے ریزیڈنٹ کو اہلکاران ریاست کے تغافل وسہل انگاری برتنے کا پورا اندازہ ہوا۔ نیز یہ خوف ہوا کہ ریاست کے لیے کہیں یہ ایک خطرہ نہ بن جائے بالآخر اس نے چند جاسوس خبر لانے کے لیے بھیجے جنہوں نے سابقہ موصولہ خبر کی تصدیق کی اس کے بعد ریزیڈنٹ خود موقع پر گیا اور دیکھا کہ بمقابلہ بیگم کے سپاہیوں کے جو توانا ومضبوط اور ساز وسامان سے لیس تھے، شاہی فوج کمزور تھی اور سامان بھی اس کے پاس پورا نہ تھا تب اس نے یہ محسوس کر کے کہ لڑائی بھڑائی چھڑ جانے کی صورت میں دارالحکومت کی آبادی کو جو موقع واردات سے اس قدر قریب ہے سخت خطرہ لاحق ہو جائے گا اس لیے اس نے سید التفات حسین خان بہادر امیر الانشاء کو ہدایت دے کر بیگم کے پاس بھیجا۔ سید موصوف الماس باغ گئے اور ریزیڈنٹ کا سلام پہنچانے کے بعد بیگم کو بتایا کہ ریزیڈنٹ نے یہ کہا ہے:

''اگرچہ میں خانگی وذاتی معاملات میں کوئی دخل نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اب معاملہ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عام دنگا وفساد برپا ہو کر رعایا کے لیے خطرہ کا موجب ہو سکتا ہے لہٰذا میں مجبور ہوں کہ ریاست کی سلامتی وحفاظت کے لیے کارروائی کروں کیونکہ معاہدوں اور عہد ناموں کی رو سے ملک میں اندرونی اور بیرونی امن قائم رکھنے کی ذمہ داری انگریزوں کے سر ہے۔ سپاہیوں کی اتنی بڑی تعداد کو سربراہ سلطنت کی رضامندی کے بغیر رکھنا۔

بے جا و نامناسب ہے لہٰذا یہ اچھا ہو کہ آپ میری تجویز پر عمل پیرا ہوں۔ زیادہ سپاہیوں کو برطرف کر دیں صرف چار سو پانچ سو کو اپنے مال کی حفاظت اور نگرانی کے لیے البتہ رہنے دیں اگر آپ اس پر راضی ہوں تو میں آپ کی کچھ خدمت کر سکوں گا، جو لوگ آپ کی ملازمت میں باقی رہنے دیئے جائیں گے ان کی ماہانہ تنخواہ جو اِن کی ضروریات کے لیے کافی ہو گی مقرر کر دی جائے گی اور شاہی فوج آپ کی خاص طور سے حفاظت و پاسبانی کرے گی۔

ان سب امور کی پوری پوری اطلاع گورنر جنرل کو دے دی جائے گی لیکن آپ اگر اس کی تعمیل نہ کریں گی تو انگریزی فوج کی تین کمپنیاں آپ کے آدمیوں کو منتشر کر دینے کے لیے مامور کر دی جائیں گی پھر کسی افسوس اور رنج کا اظہار کرنا آپ کے مفید مطلب نہ ہو گا اس کاروائی کی پوری اطلاع بھی گورنر جنرل کو بھیج دی جائے گی''۔

اس پر بیگم اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئی اور آہ و زاری کی کہ سننے والوں کے دل دہل گئے پھر اس نے میر منشی سے کہا:

''مجھے ریزیڈنٹ کے احکام کی تعمیل میں کوئی پس و پیش نہیں ہے بلکہ میں تو چاہتی ہی یہ تھی کہ وہ مداخلت کریں تاکہ میں اپنے دشمنوں کی شرارتوں سے محفوظ رہوں۔ میں نے سلیمان جاہ کے پرورش کرنے میں کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائی ہیں اور اس نے چند مفسدہ پردازوں کے بہکاوے میں آ کر کس کس طرح مجھے ستایا ہے یہ سب باتیں تو تمھیں معلوم ہوں گی۔ اب بھی جب میں اس ویرانے میں پڑی ہوئی ہوں مفسدہ پرداز میرے پیچھے لگے ہوئے

ہیں مجھے اتنی بڑی فوج بھرتی کرنے کی فی الواقع کوئی ضرورت نہ تھی لیکن یہ جو کچھ کیا گیا تحفظ ذاتی کے لیے کرنا پڑا ہے اگر ریزیڈنٹ میرا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیں اور مجھے میری جاگیر جو میرے شوہر نے مجھے دی تھی دوبارہ حاصل کرنے میں مدد کریں تو میں وہیں چلی جاؤں گی اور باقی ماندہ ایام زندگی وہیں گزار دوں گی''۔

التفات حسین خاں نے جواب دیا کہ

''ریزیڈنٹ نے مجھے اس کا مجاز نہیں کیا ہے کہ کوئی پیغام ان کے لیے لے جاؤں لیکن آپ ریزیڈنٹ کو لکھ سکتی ہیں اور جواب پانے کی توقع رکھ سکتی ہیں۔ میں اگرچہ کوئی وعدہ نہیں کرتا تاہم آپ یقین رکھیں کہ آپ کو اتنا کافی وظیفہ دیا جائے گا کہ ان سب ملازمین کے اخراجات پورے ہوسکیں گے جو آپ محل میں رکھیں بشرطیکہ گورنر جنرل اس کو منظور کریں''۔

بیگم نے جواب دیا کہ

''مجھے تو جاگیر چاہیے اگر یہ مل جائے تو میں فوراً سب سپاہیوں کو برطرف کر دوں گی اور ریزیڈنٹ کے حکم کی تعمیل کروں گی لیکن ایسا کرنے سے قبل مجھے ان کے واجبات ادا کرنے ہیں ان کی تنخواہیں چڑھ گئی ہیں کیونکہ ایک طویل عرصہ سے مجھے شاہی خزانے سے کوئی وظیفہ نہیں مل رہا ہے مجھے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنے تمام جواہرات اور زیورات کو فروخت کر دینا پڑا ہے۔ تین لاکھ روپیہ اگر مجھے دے دیئے جائیں تو میں ان کے واجبات ادا کردوں گی اور انہیں برطرف کردوں گی''۔

اس پر میر منشی نے پلٹ کر جواب دیا:

''دوسال سے آپ انہیں کہاں سے تنخواہیں دے رہی ہیں۔ اب آپ کیوں عذرات پیش کر رہی ہیں۔ ریزیڈنٹ کے احکام کی تعمیل کرنا ہی واحد طریقہ آپ کے لیے رہ گیا ہے کہ آپ اس طرح خوشی سے بامراد زندگی بسر کرسکیں گی''۔

غرض یہ کہ میر منشی نے اس طرح بیگم سے ردوقدح کی جس پر اس نے حلفیہ وعدہ کیا کہ ریزیڈنٹ کے احکام کی وہ تعمیل کرے گی چنانچہ اس کے بعد ہی اس نے اپنے سب سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور ان کو خدمت سے سبکدوش کیے جانے کا حکم دے دیا میر منشی نے واپس جا کر جو کچھ گزرا تھا سب کچھ ریزیڈنٹ کو کہہ سنایا۔ ریزیڈنٹ نے ان خطرناک حالات سے بادشاہ کو مطلع کیا اور اپنے دخل انداز ہونے کی اجازت لی۔

بادشاہ کی منظوری سے بیگم کو ایک لاکھ روپیہ دے دیئے گئے اور افسران شاہی کو خاص طور سے حکم دیا گیا کہ بیگم کے ملازمین سے کوئی روک ٹوک نہ کرے اور انہیں بنا کسی پابندی کے آمدورفت کی اجازت دی گئی۔

مزید برآں بیگم کو تحریری یقین دہانی کی گئی کہ وہ اپنے سپاہیوں کو جب خدمت سے سبکدوش کر دے گی اور صرف چار سو آدمی رہنے دے گی تو انہیں پاسبانی کے لیے سرکاری خرچ پر رکھا جائے گا اور خود بیگم کو پندرہ ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ مع یکمشت رقم ایک لاکھ روپیہ برائے ادائیگی واجبات برطرف شدہ فوج کے دیا جائے گا۔

بیگم نے ان پختہ مواعید کے برخلاف عطائے جاگیر اور تین لاکھ روپیہ دیئے جانے کی مزید درخواست اس لیے کی کہ جو عطیات اس کے لیے منظور کیے گئے ہیں وہ اس کی ضروریات کے لیے ناکافی ہیں لیکن ریزیڈنٹ نے جو کچھ پہلے طے ہو چکا تھا اس سے زیادہ کچھ ادا کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ بیگم کو مجبوراً اطاعت کرنی پڑی۔

امداد آور خدا بخش عصا برداروں کو حکم دیا گیا کہ وہ سپاہیوں میں ایک لاکھ روپیہ جو خزانہ شاہی سے آیا تھا تقسیم کر دیں اگر چہ بیگم نے ان شاہی افسروں کی موجودگی میں اپنے کچھ آدمیوں کے واجبات تو ادا کر دیئے مگر خفیہ طور پر ان کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ اپنے گھروں ہی پر رہیں اور خود کو اب بھی ملازم سمجھیں۔

بعد ازاں بیگم نے اپنے وکیل مرزا علی خان کی معرفت یہ ظاہر کیا کہ جو رقم دی گئی ہے وہ کم رہی ہے اس لیے مزید رقم منظور کی جائے۔ ریزیڈنٹ کو بالآخر مان لینا پڑا اور ایک لاکھ روپیہ کی مزید منظوری دی گئی۔

شام کو روپیوؤں کی تھیلیاں سر بمہر کر کے صبح ہی بیگم کے پاس بھیجی جانے والی تھیں کہ اسی رات میں بادشاہ کی زندگی کا چراغ یکا یک گل ہو گیا۔

شاہ اودھ نصیر الدین حیدر کی وفات اور بعد کے حالات

بادشاہ بیگم کا فریدوں بخت کو تخت نشین کرنے کے لیے انبوہ کثیر کے ساتھ الماس باغ سے کوچ، کرنل جان لوکا بادشاہ بیگم اور فریدوں بخت کو قید کرنا اور نصیر الدولہ محمد علی خاں فرزند کلاں سعادت علی خاں کو تخت نشین کرنا:

۴ ربیع الثانی مطابق ۱۸ جولائی ۱۸۳۷ء کو نصیر الدین حیدر ان عوارض میں جو بدچلن لوگوں کو ہو جایا کرتے ہیں فوت ہو گیا۔

سلطنت کے اعلیٰ حکام نے وکیل السلطنت مولوی یحییٰ خان کی معرفت یہ افسوسناک خبر حسب دستور مروجہ کمپنی کے نمائندے کرنل جان لوکو پہنچائی۔ کمپنی کے دیگر شہرت یافتہ قابل منتظم افسروں کی طرح کرنل لوفی الفور مع ڈاکٹر اسٹیونسن کے موقع پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے ایک آپریشن کے بعد اعلان کر دیا کہ بادشاہ فوت ہو چکا ہے۔ پھر کرنل لو نے اپنے فرسٹ اسسٹنٹ کیپٹن جیمس پاٹن کو مع سپاہیوں کی ایک کمپنی کے امن قائم رکھنے کی غرض سے فرح بخش بلا لیا۔ کیپٹن مع انگریز سپاہ کے موقع پر موجود ہو گیا اس کے بعد روشن الدولہ کپتان فتح علی خاں کی مدد سے کہ یہ دونوں کامیاب اور تجربہ کار افسران ریاست تھے۔ ریزیڈنٹ نے کوٹھی کے دروازے اور آنے جانے کے دوسرے راستوں پر مسلح گارڈ اس ہدایت سے تعینات کر دیئے کہ کوئی شخص ادنیٰ ہو یا اعلیٰ اندر نہ جانے پائے۔ اس کے بعد ریزیڈنٹ واپس ریزیڈنسی کو چلا گیا اور چوبدار خدا بخش کو بادشاہ بیگم کے پاس یہ درخواست دے کر بھیجا کہ وہ کسی حالت میں بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے پھر ایک مراسلہ افسر کمانڈنگ منڈیاؤن کو ارسال کیا کہ سواروں کا ایک دستہ

بھیج دے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ بادشاہ نے اپنی زندگی میں منتظم الدولہ مہدی علی خاں کے زمانہ وزارت عظمیٰ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ فریدوں بخت میرا بیٹا نہیں ہے ریزیڈنٹ نے گورنر جنرل کے حکم کے بموجب سعادت علی خاں کے باقی ماندہ بیٹوں میں سے سب سے بڑے بیٹے نصیر الدولہ محمد علی خاں کو جانشینی کے لیے منتخب کرلیا تھا اس لیے فوراً اس نے اپنے دوسرے اسسٹنٹ جان شیکسپیئر اور امیر الانشاء التفات حسین کو ان کی خدمت میں مع تحریری دستاویز مہر شدہ کے بھیج دیا یہ دونوں افسران جب ان کی قیام گاہ پر پہنچے انہیں سوتا ہوا پایا نواب کے ملازم آدھی رات کے وقت ان لوگوں کو دیکھ کر حیران ہوئے لیکن پھر بھی انہیں نواب کو ایسے ناوقت جگانا ہی پڑا۔نواب جب باہر آئے تو ان لوگوں نے ان کی تخت نشینی کی مبارک خبر انہیں سنائی نواب نے جوش مسرت میں فوراً ہی اس کاغذ پر اپنی مہر ثبت کر دی دونوں افسران نے واپس آکر اپنی کامیابی کی اطلاع ریزیڈنٹ کو دی۔

اس کے بعد ریزیڈنٹ ریزیڈنسی سے روانہ ہوا اور سید التفات حسین ولیفٹیننٹ شیکسپیئر کی معیت میں فرح بخش کوٹھی پر اس لیے پھر واپس آ گیا کہ کیپٹن جیمسن پاٹن نواب روشن الدولہ اور مولوی غلام یحیٰی خاں کو نواب نصیر الدولہ کی خدمت میں بھیجے، اسی وقت خدا بخش چوبدار بھی یہ اطلاع دینے کو لوٹ آیا تھا کہ بیگم نے قصد کرلیا ہے کہ وہ محل شاہی میں آئے گی اور اپنے وکیل مرزا علی خاں کو ریزیڈنٹ کے پاس بھیجا ہے۔ ریزیڈنٹ نے بیگم کے وکیل کو اس کے سوالات کے معقول جوابات دیئے چنانچہ وہ انہیں بیگم کو پہنچا دینے کے لیے واپس چلا گیا۔جب اس رات میں ابھی پانچ ''ساعت'' باقی تھیں نواب نصیر الدین مع اپنے بڑے بیٹے اور دو پوتوں اور دو دامادوں مسمیان

محسن الدولہ و منتظم الدولہ کے فرح بخش کوٹھی کی بالائی منزل پر اپنی سواری سے اترے۔ ریزیڈنٹ نے ان کا استقبال پہلے زینے پر کیا، دونوں بغلگیر ہوئے پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دریا کے سامنے والے ورانڈے (برآمدے) میں جا کر بیٹھے اور خوش مزاجی سے بات چیت کرنے لگے اس کے بعد نواب ایک بغلی کمرے میں جا کر سو گئے۔

اب چند حیرت انگیز اور خلاف توقع واقعات رونما ہوئے۔

بیگم نے آٹھ یا نو سو سپاہیوں کو تین سال سے اپنی ملازمت میں رکھ چھوڑا تھا جنہیں ایک کندہ ناتراش اور جاہل بھشتی امام بخش نے جو فتح گنج کا رہنے والا تھا لوٹ مار کرنے والے دیہاتیوں میں سے بھرتی کیا تھا ان میں سے دو سو سپاہیوں کے ساتھ جو امام بخش و موہن سنگھ للتا پرشاد راجپوت کے زیر کمان تھے بیگم نے مع فریدوں بخت کے الماس باغ سے محل شاہی کو کوچ کیا۔ بیگم کے لشکر کی روانگی کی اطلاع ایک خبر نویس نے فوراً ہی ریزیڈنٹ کو دے دی پھر اس کے پیچھے پیچھے دوسرا خبر نویس یہ اطلاع دینے کو پہنچا کہ بیگم گومتی کے دوسرے کنارے سے محل شاہی کے بالکل قریب پہنچ گئی ہے۔

ریزیڈنٹ نے پھر بیگم کے پاس چوب دار خدا بخش کے ذریعہ دوسرا پیغام بھیجا کہ تمہیں ایسے وقت میں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی اور مشورہ دیا کہ فوراً واپس چلی جاؤ بیگم تو اَب الماس باغ کو واپس جانے کو تیار تھی مگر منا جان اور خدا بخش اس کے راستے میں حائل ہو گئے اور محل شاہی تک اپنا کوچ جاری رکھنے پر اسے یہ کہہ کر آمادہ کر لیا کہ اگر یہ موقع کھو دیا تو پھر کبھی ایسے موقع کے ہاتھ آنے کا کوئی امکان نہ ہو گا۔

ریزیڈنٹ نے اب فوج کی پوزیشن کے متعلق دریافت حال کیا تو معلوم ہوا کہ

شاہی فوج سڑکوں پر گشت کرنے اور حملہ آوروں کو روکنے کے لیے مامور نہیں کی گئی اگرچہ ایک بٹالین زیر کمان روبرٹؔ صرف محل کے اطراف میں ہوشیاری سے پاسبانی کررہی ہے اور جو سڑک بیگم نے محل میں پہنچنے کو اختیار کی ہے وہ قطعاً بے روک ٹوک کھلی ہوئی ہے اس لیے ریزیڈنٹ کے حکم سے کپتان جیمسؔ پاٹن فرسٹ سیکرٹری نے انگریزی سپاہیوں کو ساتھ لے کر مغربی دروازہ کی طرف کوچ کردیا اور فتح علی خاں کے مکان کی طرف والے دروازہ محل شاہی کے کواڑوں کو مضبوطی سے جکڑ دیا۔

بادشاہ بیگم اور منا جان جب وہاں پہنچے تو مفسدوں کے سرغنہ امام بخش منا جان کی اجازت سے ایک ہتھنی لے آیا جسے شاید اسی مقصد سے خاص طور پر سدھایا گیا تھا کہ ٹکر مار کر دروازہ توڑ دے اب جو ہلچل اور افراتفری پڑی اس میں فرسٹ اسسٹنٹ نے دیکھا کوئی شخص کسی سپاہی کی فیر سے زخمی ہوگیا ہے مگر پھر بھی افسروں نے بڑی دلیری سے اس کی پرواہ نہ کی اور زور دے کر مفسدوں سے بآواز بلند ہٹ جانے اور الگ ہو جانے کو کہا لیکن ان کے سرغنہ نے بدقسمتی سے یہ بات نہ مانی اور بہت ہی بدتمیزی سے پیش آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری جانب کے چند لوگ بری طرح زخمی ہوگئے۔ ریزیڈنٹ کے چپراسی سریدوں سنگھ اور مکھن سنگھ گولی لگنے سے بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ بیگم نے پھر دوسرے دروازے سے داخل ہونے کے لیے یہی ترکیب چلی۔

اب جبکہ یہ افواہ پھیلی کہ فرسٹ اسسٹنٹ مارا گیا تو ریزیڈنٹ بہ ہمراہی سید التفات حسین بیگم کے پاس گئے تاکہ اسے متنبہ کریں اور فتنہ وفساد سے باز رکھیں لیکن اس کے ساتھیوں کے بے قابو جوش نے بیگم کو اس عاقلانہ مشورہ پر کاربند نہ ہونے دیا اب اس وقت تک باغیوں نے تینوں معززین (ریزیڈنٹ، اس کے اسسٹنٹ اور سید التفات حسین) کو گھیرے میں لے لیا تھا اور بارہ دری کے دروازہ کو توڑ کر جو شاہراہ

عام کی جانب تھا اندر داخل ہو گئے تھے۔ راجپوت سپاہیوں (امام بخش، موہن سنگھ، اور للتا پرشاد) نے منا جان کو تخت پر بٹھا دیا۔ بے وقوف منا جان نے پھر نذریں قبول کیں جو اس کے ملازموں نے پیش کیں اور وہ توپیں جو اس کے ساتھی اپنے ساتھ لائے تھے داغی گئیں۔

پرانے ملازم یہ دیکھ کر کہ بیگم کے دو سو آدمی اندر گھس آئے ہیں دل چھوڑ بیٹھے اب تمام شاہی محلات باغیوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ راجہ شیو دین اور اس کی مثل دوسرے لوگ محصور کر لیے گئے تھے۔ باغیوں نے روشن الدولہ، نصیر الدولہ اور ان کے رشتہ داروں کو حراست میں لے لیا تھا انہوں نے روشن الدولہ کو قتل کر دینے کی کوشش کی مگر اس کے ملازم قادر بخش نے اس کی جان بچا لی۔

سبحان علی خاں ① نے اپنی جیسی یہ ترکیب چلی کہ چھوٹی پگڑی کے بجائے جو وہ عموماً پہنا کرتا تھا ایک بہت بڑا شاندار عمامہ سر پر باندھا اور بھاگم بھاگ جان بچا کر اپنے گھر پہنچ گیا۔ غلام یحییٰ خاں وکیل السلطنت نے شمالی دیوار پر سے کود کر اپنی عزت بچائی اگرچہ یوں گرنے سے اس کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو گئیں بڑی مشکل سے وہ دریا کے کنارے پہنچ پایا۔ اور ایک ناؤ میں سوار ہو گیا جب بلوہ ختم ہو گیا تو اس کے ملازم اسے تلاش کرتے ہوئے عین اسی وقت پر آ پہنچے اور گھر لے گئے۔ اب دن نکل آیا تھا بیگم کا وکیل مرزا علی خاں ریزیڈنٹ کے پاس گیا اور کہا کہ بیگم نے آپ کو بلایا ہے۔ ریزیڈنٹ اس کے ساتھ محل میں آیا جہاں بیگم اس کے خیر مقدم کو تیار بیٹھی تھی۔ ریزیڈنٹ نے بیگم سے ردوقدح کرنے کے بعد مشورہ دیا کہ حالات کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تم

---

① سبحان علی خاں نائب وزیر تھا۔ سلیمن نے کہا ہے کہ وہ عیار و مکار شخص تھا۔ کیپٹن ہر برٹ جو شاہ اودھ کا منجم شاہی تھا۔ ۱۸۸۳ء کی ایک تحریر میں کہتا ہے کہ سبحان علی خاں ایک بے اصول شخص ہے انتہائی درجہ کا نہیں پھر بھی بہت زیادہ۔

واپس چلی جاؤ مگر اس نے اس پر کان نہ دھرا۔

اس تمام وقت میں جب ریزیڈنٹ بیگم سے ردوقدح کرتا رہا وہ فطری طور پر اس قدر چوکنا رہا کہ بیگم کے وکیل کا ہاتھ نہ چھوڑا۔ اس موقع پر چند باغیوں نے نہایت گستاخانہ طور سے نذریں پیش کیں اور دوسری رسمیں ادا کیں جو بادشاہ کی تخت نشینی پر رواجاً ادا کی جاتی ہیں لیکن ہوشیار ریزیڈنٹ نے ان کو پسند نہیں کیا اور ہاتھ کے اشارے سے نذر لینے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے بعض نے ریزیڈنٹ کے ضرب لگائی اور کمینہ پن سے گالیاں دیں لیکن ریزیڈنٹ خاموشی اختیار کیے رہا۔ ایک باغی نے ریزیڈنٹ کو قتل کر دینے کا بھی اقدام کیا تھا لیکن وکیل نے خوشامد کر کے اس کو اس فعل سے باز رکھا دوسرے باغی نے بندوق کا فیر بھی کر دیا اور گولی سنسناتی ہوئی ریزیڈنٹ کے کندھے کے پاس سے گزر گئی۔

قصہ مختصر: بڑا جوش واشتعال پھیلا ہوا تھا باغیوں میں سے ہر ایک عجیب عجیب حرکتیں کر رہا تھا جو بدزبانی اور فحش گفتگو یہ لوگ کر رہے تھے ریزیڈنٹ اس سے تنگ آ گیا اور آخر کار وکیل کی مدد سے اس نے آہستہ سے اپنا پیچھا چھڑا لیا اور لیفٹیننٹ شیکسپیئر اور میر منشی کی معیت میں بارہ دری کے صحن تک پہنچ گیا یہاں اس نے انگریزی فوج کے جو منڈیاؤں چھاؤنی سے آ گئی تھی ترتیب سے لگانے کے انتظام میں اپنا وقت صرف کیا۔

جیسا کہ عقلمندوں کا معمول ہے کہ عذر و معذرت کے لیے وہ کوئی وجہ باقی نہیں چھوڑتے ریزیڈنٹ نے مرزا علی خاں اور مصطفیٰ خاں رسالدار قندھاری کو جنہوں نے اس شورش میں حصہ لیا تھا بلا کر کہا کہ

''بیگم سے کہہ دو کہ ان کے لیے بہترین طریقہ کار یہی ہے کہ وہ تخت شاہی سے نکل آئیں اور اپنے محل کو واپس چلی جائیں''۔

مگر ان لوگوں نے بات ٹالنی چاہی اور کوئی توجہ اس پر نہ کی۔ ریزیڈنٹ نے آخر کار مصطفیٰ خاں کو پھر بلایا اور اس سے صاف کہہ دیا کہ

''اگر بیگم دس منٹ کے اندر اندر ہمارے روبرو حاضر ہو کر اطاعت نہ کرے گی تو وہ توپ دم ہونے کے لیے تیار ہو جائے''۔

بیگم نے پہلے تو حکم بجا لانے کا وعدہ کر لیا مگر عمل کچھ نہ کیا کیونکہ اس کے نوکر تو لڑنے مرنے پر تلے ہوئے تھے۔

ریزیڈنٹ کے لیے کوئی چارہ کار اس کے سوائے باقی نہ رہا تھا کہ وہ یہ حکم دے کہ

''کمرۂ تخت کے سامنے سے چھروں کے فیر بندوقوں سے کیے جائیں''۔

ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ

''سڑک پر جہاں سے لوگ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کر جاسکیں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا کی جائے''۔

اب انگریزی سپاہی سیڑھیوں کے ذریعہ بارہ دری تک پہنچ گئے۔ خوش نصیبی سے بیگم چند منٹ پہلے ہی پالکی میں سوار ہو کر بارہ دری کے ملحقہ مکان میں جہاں بادشاہ کا جنازہ رکھا تھا جا چکی تھی اور منا جان کو مصطفیٰ خاں جلدی سے دوسرے کمرے میں لے گیا تھا اگرچہ وہ خود کمرۂ تخت سے نہ ہٹا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موت کا آرزومند ہے۔ بندوقیں جب سر کی گئیں تو بیگم کے آدمیوں میں سے ساٹھ نفر جن میں مصطفیٰ خاں رسالدار، موہن سنگھ، للتا پرشاد باغی راجپوت اور نورا کلاونت کا بیٹا دولت جو مبارک باد کے اشعار گا رہا تھا یہ سب مارے گئے دو انگریزی سپاہی بھی زخمی ہوئے اور ایک مارا گیا۔

بیگم یہ ہولناک منظر دیکھ کر پالکی میں نہ ٹھہر سکی بے پردہ باہر نکل آئی۔ فتح مند انگریزی سپاہی پھر بارہ دری کے اندر داخل ہو گئے اور منا جان کو حراست میں لے کر

ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں اور بادشاہ بیگم کی پالکی کے ساتھ زرد کوٹھی واقع احاطہ ریزیڈنسی تک اسے پیدل لے جایا گیا۔ اس ہنگامہ میں بیگم کی پالکی میں سے چند چیزیں، اس کے کچھ زیورات اور بارہ دری کی کچھ اشیاء لوٹ لی گئیں۔ دوسری لاشیں دریا میں پھینک دی گئیں۔ ان سب حادثوں کے ختم ہونے تک ریزیڈنٹ فرح بخش میں ٹھہرا رہا اور نصیر الدولہ سے اس وقت تک باتیں کرتا رہا جب تک کہ کپتان فتح علی خاں نواب اودھ کے لیے شاہی خلعت اور آرائش وزینت شاہی کا سامان لے کر نہ آ گیا پھر نواب جن کے پیچھے پیچھے ریزیڈنٹ، کپتان جیمس پاٹن لیفٹیننٹ شیکسپیئر اور امیر الانشاء سید التفات حسین چل رہے تھے شاہی کمرے میں داخل ہوئے اور تخت پر بیٹھے ہوئے ریزیڈنٹ اور بریگیڈئیر جانسٹن کے داہنی جانب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

پرانے دستور کے مطابق توپ خانے کے ہر حصے نے اکیس اکیس توپوں کی سلامی دی۔ سب سے پہلے نذر بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے مرزا امجد علی نے پیش کی پھر روشن الدولہ بہادر، سبحان علی خاں، ڈاکٹر اسٹیونس اور راجہ بختاور سنگھ نے۔ اس کے بعد بادشاہ شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ تخت رواں① پر بیٹھ کر فرح بخش کو منتقل ہو گئے وہاں رکن الدولہ بہادر اور بادشاہ کے بھائی احمد علی خاں اور مہر علی خاں ان کے حضور میں پیش ہوئے اور اجازت نذریں پیش کرنے کی حاصل کی پھر بادشاہ اور ریزیڈنٹ نے اپنے ہی ہاتھوں سے ایک دوسرے کو ہار پہنائے۔ اس کے بعد عطر پیش کرنے کی قدیم رسم ادا کی گئی جو علامت رخصت ہو جانے کی ہوتی تھی ریزیڈنٹ بھی رخصت ہو کر چلا گیا۔

ان رسوم کی ادائیگی کے بعد ریاستی معاملات پر توجہ کی گئی۔ بادشاہ نے منّو جان

① تخت رواں اس لیے کہلاتا تھا کہ اس پر سوار ہو کر بادشاہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا۔

معمار کو متوفی بادشاہ کی تدفین کے لیے دریا کے دوسری جانب قدسیہ بیگم کے مقبرے کے پاس قبر تیار کرنے کا حکم دیا پھر مرزا علی خاں کوتوال کو حکم ہوا کہ شہر کے سب دوکانداروں اور تاجروں کو دوکانیں کھولنے کی ہدایت کرے اور ان کو حکومت کی جانب سے امن وامان کا یقین دلائے۔

اب بادشاہ کی توجہ اس واقعہ کی جانب مبذول کرائی گئی کہ کوٹ گشتی ① کے ہرکاروں کے جمعدار رام نواز اور بسرام نے، جو ریاست کی ملازمت سے منسلک تھے۔ شورش کے زمانے میں سپاہیوں کی ایک جماعت سبحان علی خاں کے مکان پر تعینات کردی تھی اس لیے روشن الدولہ بہادر نے شاہی حکم کی تعمیل میں ان کو قید کردیا۔ مرزا علی خان وکیل اور امام بخش داروغہ جو باغیوں کے سرغنہ تھے وہ بھی قید کیے گئے۔

ان واقعات کے بعد سلطنت کے مختلف علاقوں کے عاملوں کے نام اس مضمون کے شاہی فرمان جاری کیے گئے کہ قطب الدین ابو النصر سلیمان جاہ نصیر الدین حیدر (شاہ اودھ) کی وفات ۴ ربیع الثانی یوم شنبہ کی رات میں ہوگئی اور اپنے حق وراثت کی رو سے اور خدا کی مرضی سے حضور معظم (ہز مجسٹی) کمپنی کے تعاون سے ان کے جانشین ہوئے۔ عاملوں کو تاکید کی گئی کہ اپنے فرائض منصبی پوری احتیاط اور تن دہی سے انجام دیتے رہیں اور کارکردگی کی رپورٹیں بتوسط روشن الدولہ بہادر بھیجتے رہیں۔

دن کا جب چوتھائی حصہ باقی رہ گیا تھا نائب حضوری میں پیش ہوا۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد وہ ریزیڈنٹ کے پاس گیا اور ایک گھنٹہ کے بعد واپس آیا۔ آخر کار سہ پہر کے

---

① کوٹ گشتی کے آدمیوں کا کام تھا کہ دفاتر سرکاری اور عدالتوں میں گشت کرکے تمام اہم واقعات اور روزمرہ کے انتظامی معاملات کی خبریں فراہم کریں اور اپنے افسر بالا کے ذریعہ بادشاہ کو اطلاعیں پہنچائیں۔

بعد متوفی بادشاہ کی میت کو مخدرۂ علیا① کے محل کے پاس دریا میں غسل دیا گیا پھر شاہی جلوس کے ساتھ روشن الدولہ، مہدی علی خاں، احمد علی خاں، محسن الدولہ بہادر اور دیگر افراد خاندان شاہی اور ممتاز اشخاص کی ہمراہی میں جنازہ لے جایا گیا۔

ریزیڈنٹ ڈاکٹر اسٹیونسن بھی جنازے کے ساتھ ساتھ تھے۔ دو ہزار روپیہ خیرات کیے گئے۔ مجتہد نے نماز جنازہ پڑھائی پھر قدسیہ بیگم کے مقبرے سے متصل نئی کربلا میں میت دفن ہوئی۔ فاتحہ پڑھ کر لوٹ گئے۔ قطعہ تاریخ وفات ؎

بو نصر قطب دین وسلیمان روزگار
دردارِ خلد رفت ازیں دار بے مدار
سال وفات خواست چو عقل دقیقہ یاب
گفتا کہ غسق نجم کن شمار/ ۱۲۵۳ھ

آخر الامر جب جائز وارث تخت محمد علی شاہ اودھ کے نام کا خطبہ پڑھا جا چکا اور تاج پوشی ہو چکی تو دبیر الدولہ② راجہ رتن سنگھ شاہی امیر الانشاء نے جو عربی فارسی اور

① مخدرہ علیا ایک اینگلو انڈین خاتون تھی۔ نصیر الدین حیدر نے اپنی تخت نشینی کے بعد ہی اس سے شادی کر لی تھی اور کچھ دنوں تک اس سے والہانہ محبت کرتا رہا تھا۔ اس کے مقبرے ہی کے پاس نئی کربلا تھی جہاں خلقت کا اژدہام ہوتا میلہ لگتا برسوں کے بچھڑے مل جاتے تھے۔ انشاء نے ایک کسبی نورن اور بڈھے میر صاحب کی گفتگو نقل کی ہے وہ کہتی ہے:

''اجی آؤ میر صاحب تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ دلی میں آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمہیں کیا ہو گیا کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے اب کے کربلا میں کتنا میں نے ڈھونڈا کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہیں آٹھوں میں بھی نہ چلو تمہیں علی کی قسم آٹھوں میں مقرر چلیو''۔ کربلا اور آٹھوں کے میلے لکھنؤ میں بڑی دھوم سے ہوتے تھے۔

② یہ قوم کا یستھ سے تھا اور کئی پشتوں سے اس کا خاندان سلطنت اودھ کی ملازمت میں منسلک رہا راجہ بھگوان داس اس کا دادا آصف الدولہ کا اتالیق اور دیوان تھا خود رتن سنگھ فارسی کا فاضل اور شاعر تھا زخمی تخلص تھا اس کی تصانیف سے اودھ کی تاریخ سلطان التواریخ ہے جو ۱۸۳۲ء میں لکھی گئی تھی۔

انگریزی کا فاضل تھا تاریخ تخت نشینی کی یادگار میں سکہ شاہی کے لیے ایک شعر موزوں کر کے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا انہوں نے پسند کیا اور حکم دیا کہ

''سونے چاندی کے سکوں پر مسکوک کیا جائے''۔

شاہی مہر پر ''ابوالفتح معین الدین سلیمان الزمان نوشیروان عادل محمد علی شاہ بادشاہ اودھ'' ثبت کیا گیا۔ ایک کثیر رقم منصوریہ خاندان کے افراد میں جو شاہی اہلکاروں کی غفلت سے غربت میں زندگی بسر کر رہے تھے فیاض دلی سے تقسیم کی گئی۔

بادشاہ نے اپنے بیٹے کو ثریا جاہ کا لقب عطا کیا، وہ ولی عہد بنایا گیا اور گورنر جنرل سے بتوسط ریزیڈنٹ اس کی منظوری حاصل کی گئی جو ۴ جمادی الثانی مطابق ۴ اکتوبر کو باضابطہ آگئی بادشاہ کی جانب سے خلعت ولی عہدی ثریا جاہ کو عطا کیا گیا۔

اب میں اصل مضمون کی طرف آتا ہوں جس سے میں گریز کر گیا۔

بادشاہ بیگم اور منا جان جب زرد کوٹھی میں مقید تھے شروع کے دو دن تو منا جان نے تنہائی میں گزارے پھر ریزیڈنٹ نے اس کی آہ وزاری پر ترس کھا کر حکم دیا کہ بادشاہ بیگم ہی کے ساتھ اسے بھی رکھا جائے۔ایک ٹوٹی چارپائی اور پرانے بوریے کے سوا انہیں کوئی سامان نہیں دیا گیا تھا انگریزی سپاہی ان کے اس قدر قریب پہرہ دیتے تھے گویا ان کے سر پر ہی کھڑے ہوں۔

بہشتی کا ایک چھوکرا کھانا ان کے واسطے لاتا تھا۔تیسرے دن ایسا ہوا کہ بیگم نے تھوڑا سا کھایا اور پانی پیا۔ریزیڈنٹ خود بھی کبھی کبھی قیدیوں کے معائنہ کے لیے آیا کرتا تھا۔

بیگم کو اس نے ہمیشہ قرآن پاک کی تلاوت اور دیگر ارکان مذہبی ادا کرتے ہوئے پایا مگر وہ اپنی تقدیر اور قسمت کی ایسی کایا پلٹ سے ذرا بھی مضطرب و پریشان

نظر نہ آتی تھی۔①

صد حیف کہ یہ صاحب اقتدار خاتون چند احمق صلاح کاروں کی بری رایوں اور مشوروں میں پھنس کر اختیار اور دولت سب کچھ کھو بیٹھی۔ ریزیڈنٹ نے بعد میں لباس کے دس دس مردانہ وزنانہ جوڑے مہیا کر دیئے اور سید التفات حسین خان بہادر کی معاونت سے منا جان اور بادشاہ بیگم کو ایک پالکی میں سوار کرا کر انگریز سپاہیوں کی نگرانی میں جو لیفٹیننٹ شیکسپیئر کی قیادت میں تھے۔ ۸ ربیع الثانی مطابق ۱۲ جولائی کی آدھی رات کے وقت کانپور بھیج دیا گیا تاکہ جرنل اسٹیونس انچارج افواج بمقام کانپور بطور قیدیوں کے زیر نگرانی رکھے جائیں۔

اہل خرد کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ جب یہ ہنگامہ ختم ہو گیا ریزیڈنٹ نے اس کی رپورٹ اپنی حکومت کو کلکتہ ارسال کی جو کچھ اس نے کیا تھا چونکہ حق بجانب تھا اس لیے اس پر صاد کر دیا گیا چنانچہ ایک چٹھی انگریزی میں لکھی ہوئی ۲۱ ربیع الثانی مطابق ۲۵ جولائی کو موصول ہوئی جس میں نئے بادشاہ کی تخت نشینی کی منظوری دی گئی تھی اور جو انتظامات ریزیڈنٹ نے کیے تھے ان کو بہت کچھ سراہا گیا تھا۔ اس موقع پر جشن منانے اور اظہار خوشی کرنے کے لیے اکیس توپیں سر کی گئیں پھر اسی ماہ کی ۲۴ اور ۲۸ تاریخ کو گورنر جرنل کے خریطے خود بادشاہ کو وصول ہوئے اور دوبارہ توپیں داغی گئیں۔

کلکتہ سے آئے ہوئے احکام کی تعمیل میں ریزیڈنٹ نے اٹھارہ خادماؤں اور منا جان کی ماں افضل محل کو جنہیں بیگم نے اپنے پاس رکھنے کے لیے طلب کیا تھا کانپور بھیج دیا اور الماس باغ میں جو کچھ بچا کھچا سامان باقی رہ گیا تھا وہ سب جن میں ضروریات کی

① نائٹن کی کتاب ''اودھ کے مقتول بادشاہ'' میں یہ فقرہ درج ہے کہ ''اس عالی مرتبہ اور بدقسمت خاتون کو جس طرح لے جایا گیا اور جو جو پہاڑ ذلتوں واہانتوں اور توہینوں کے اس وقت توڑے گئے جب وہ ان کی قید میں تھی وہ حد درجہ مطعون خلائق ہیں''۔

چیزیں (یعنی پہننے کے کپڑے، خانہ داری کے سامان، سونے چاندی کی چیزیں) شامل تھیں اور بیگم نے طلب کی تھیں اٹھارہ گاڑیوں میں لدوا کر روانہ کر دیں بیگم کی ملکیت کا جو سامان بچ رہا تھا یعنی سونے چاندی کے ظروف، ہاتھی، گھوڑے وہ سب بادشاہ نے ضبط کر لیے۔

ایک طوطے کی جدائی پر بیگم کا اظہارِ غم:

کیسی انوکھی بات ہے کہ بیگم جب لکھنؤ سے آئے ہوئے سامان کا معائنہ کر رہی تھی اس نے بڑے اشتیاق سے ایک لاڈلے طوطے کو ڈھونڈا جسے منا جان اس قدر عزیز رکھتا تھا کہ صرف اسی طوطے کی دیکھ بھال کے لیے سولہ نوکر رکھے گئے تھے چونکہ کسی کو یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے ایسے ایام مصیبت میں یہ مصیبت زدہ بیگم اس طوطے کے لیے اتنی بے چین و مضطرب ہو گی لہٰذا اسے وہیں چھوڑ دیا گیا تھا لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ بیگم طوطے کے فراق میں بری طرح رو رہی ہے تو اس کو بھی بھیج دیا گیا۔

قلعہ چنار گڑھ میں نظر بندی:

صدر مقام سے موصول شدہ احکام کی تعمیل میں ان دونوں قیدیوں کو بنارس سے چھ میل دور چنار گڑھ کے قلعہ میں جس کا حصار بہت مضبوط اور جس کے گرداگرد عمیق خندق تھی نظر بند رکھنا تھا۔ چنانچہ جب وہ سب سامان آ گیا جو لکھنؤ میں رہ گیا تھا تو ۴ رجب مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۸۳۷ء کو منا جان اور بیگم کو تلنگوں کی دو کمپنیوں اور انگریزی سواروں کی ایک رجمنٹ کی حفاظت میں چنار گڑھ بھیج دیا گیا اور دو ہزار چار سو روپیہ ماہوار کو وظیفہ ان کے لیے مقرر کر دیا گیا۔

میں نے اس واقعہ کی تاریخ ذیل کے قطعہ میں لکھی ہے ۔

چو منا جان بر تخت سلطنت بنہا دیائے خود

سید بختی زاوج حشمت واقبال خارج شد
بلوح دہر بہر یاد گاری خامہ رابطہ
رقم زد سال تاریخش کہ مناجان خارج شد
/ ۱۲۵۳ھ

اہل دانش کو معلوم ہونا چاہیے کہ بیگم کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی اس نے اپنے خسر سعادت علی خاں، اپنے شوہر غازی الدین حیدر اور اپنے بیٹے نصیر الدین حیدر کے زمانے دیکھے تھے اور اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ لوگ کمپنی کے احکام کی تعمیل کس وفاداری سے بجالاتے تھے۔ جس زمانہ میں اس کا تنازعہ اپنے بیٹے سے چل رہا تھا ریزیڈنٹ کا اس کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ اور اس کی موافقت میں کمپنی کے صدر مقام سے احکام حاصل کرنے کے لیے ریزیڈنٹ کی کوشش ایسے حقائق ہیں جن سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن بیگم نے دولٹیرے راجپوتوں اور بھشتی کے بہکائے میں آ کر نیز چند دیگر اوباشوں کی مدد سے محض اپنی ہوس دولت واقتدار بجھانے کے لیے ایسے نوجوان کو تخت پر بٹھادیا جس کی رگوں میں شاہی خون نہ تھا۔[1] اور اس کے برے انجام کا خیال تک نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اسے اس قسم کے مصائب برداشت کرنا پڑے۔

اگر برطانوی فوج باغیوں کو آگے بڑھنے سے آدھے رستے میں روک دیتی اور شاہی محل کے دروازے میں نہ داخل ہونے دیتی تو عوام الناس صحیح معلومات کے فقدان سے بہت کچھ شبہات کا اظہار کرتے اور سارا الزام ریزیڈنٹ کے سر رکھتے لیکن محض باغی فوج کے آگے بڑھنے میں دیر لگانے میں بیگم کے اصلی اغراض کو زیادہ عرصہ تک

---

① ملاحظہ ہو سلیمن کی کتاب ''سلطنت اودھ کے درمیان سفر'' جلد ۲ باب ۱۴ جو اس کے برعکس رائے رکھتا ہے اور اس بات کی حمایت میں دلائل پیش کرتا ہے کہ مناجان شاہی نسل سے تھا۔

پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا اور اس سے شبہ کی کوئی بنیاد نہ ہوتی۔

برطانوی انصاف اور حقوق پروری کا پاس و لحاظ رکھنا ہی جائز وارث و حقدار کے تخت پر بیٹھنے کا باعث ہوا اور سلطنت کے جملہ عمائدین نے اس بارے میں احسان مندی کا اظہار کیا ہے۔①

خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی یہ کتاب اختتام کو پہنچا دی۔ اب چاہتا ہوں کہ ان چند غیر معمولی واقعات کو ضبط تحریر میں لاؤں جو اسی سال واقع ہوئے ہیں۔

اہل دانش کو جنہیں علم سے محبت ہے اور صحیح واقعات کے جاننے کی آرزو ہے معلوم ہونا چاہیے کہ اس سال کچھ ایسے غیر معمولی واقعات رونما ہوئے کہ عمر رسیدہ لوگوں نے ایسی باتیں کبھی دیکھی سنی نہ تھیں لہٰذا اس سال کو ''سالِ حوادث'' کہنا چاہیے۔

اس سال کا پہلا حادثہ یہ تھا کہ مرض ہیضہ بڑی شدت سے آٹھ ماہ تک پھیلا رہا۔ ہر شخص جس نے منہ بھر کے قے کی یا ایک دست ہوا۔ طبی امداد ملنے کے امکان سے پہلے مر جاتا تھا۔

اس سال گرمی اس شدت کی پڑی کہ جو لوگ گھر سے باہر قدم نکالتے اعضائے رئیسہ ان کے متاثر و ماؤف ہو جاتے تھے۔ کوتوالی کے اعداد و شمار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روزانہ سو اموات ہوتی تھیں جن میں سب سے زیادہ تعداد بچوں اور بوڑھوں کی ہوتی تھی مقابلۃً عورتیں کم اور جوان مردان سے بھی کم تر مرے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو زیادہ مرے اور بہ نسبت اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے ادنیٰ طبقے کے لوگ مرض میں

① شہر کے معزز اور پرامن لوگ اگرچہ ان کی ہمدردیاں اس لڑکے کے ساتھ تھیں مگر وہ اس کی موافقت کی کسی تحریک میں اعانت کرنے کو اپنے گھرانوں کی عزت و آبرو اور مال کے لیے بہت خطرناک سمجھتے تھے۔ ان کی حفاظت و سلامتی برطانوی فوج کی کامیابی پر منحصر تھی۔ کتاب سلیمن کا سفر جلد ۲ باب ۱۴۔

زیادہ مبتلا ہوئے اور زیادہ مرے۔

دوسری بات یہ ہوئی کہ بارش اس سال شہر پوار اور مرداد (بھادوں کنوار) میں دو دفعہ کے سوائے مطلق نہ ہوئی جس کے نتیجے میں کال پڑ گیا اور گیہوں بارہ سیر فی روپیہ بکنے لگا۔①

تیسری بات یہ کہ بادشاہ اودھ کی موت جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اسی سال واقع ہوئی۔

چوتھی بات یہ ہوئی کہ ۲۳ جون ۱۸۳۷ء مطابق ۱۹ ربیع الاول ۱۲۵۳ھ انگلستان کے شاہ ولیم چہارم کی وفات ہوئی۔

پانچویں یہ کہ سلطان رفیع الشان محمد اکبر ثانی دارالسلطنت شاہجہاں آباد (دہلی) میں ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۵۳ھ مطابق ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو فوت ہوا۔

خدا سب کو تندرست اور خوش رکھے میں خاص طور سے لیفٹیننٹ جان شیکسپیئر کی سلامتی کی دعا کرتا ہوں جن کے ایما پر میں نے یہ کتاب تالیف کی ہے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ غَفُوْرُ الرَّحِیْم

---

① یعنی اب سے سوا سو برس پہلے ۱۸۳۷ء میں امساک باراں سے جو قحط پڑا تھا اس میں گیہوں فی روپیہ بارہ سیر فروخت ہوتا تھا اور امسال ۱۹۶۵ء میں اسی شہر لکھنؤ میں روپے فی سیر بک رہا ہے۔

ترجمہ اشعار رابط بطرز مثنوی

خدا کا احسان ہے کہ میں نے یہ کتاب مکمل کر لی۔ میرے قلم نے منظر کی مصوری کی ہے میری صداقت اس امر کی گواہ ہے کہ میں نے کسی کی جانبداری نہیں کی جو بات میں نے نہیں سنی یا نہیں دیکھی اسے قلمبند نہیں کیا۔ اگر کوئی بات غلط ہے تو اس وجہ سے ہو گی کہ جن لوگوں نے مجھے اطلاع دی وہ غلط دی ہوگی۔

میں نے داستان کے واقعات میں توڑ مروڑ نہیں کی۔ مجھے امید ہے کہ نقاد اور اہل دانش میری فروگذاشتوں کو نظرانداز کر دیں گے اور عیب چینی نہ کریں گے۔

خداوندا! ان چند اوراق کو اہل بینش کی آنکھ کی پتلی بنا دے اور مبصر کے لائق پسندیدگی کر دے۔

وقائع دل پذیر

بادشاہ بیگم اَوَدھ

یہ کتاب ہندوستان کی مذہبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اِس میں سلطنت اَوَدھ کے ایک عہدِ شاہی کی دلپذیر حکایت کہی گئی ہے۔ اِس ضمن میں شاہانِ اَوَدھ کے ہاں مذہب کے تشبیہی عناصر کی مادی کیفیات، بادشاہ بیگم کی مذہبی زندگی اور اُن کے ہاں رائج مذہبی روایات کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اماموں سے منسوب فرضی بیبیوں کے دلچسپ واقعات بیان کیے گئے اور یہ بتایا گیا ہے کہ شاہانِ اَوَدھ کس طرح زچہ بن کر فرضی اماموں کو جنم دیتے تھے اور چھٹی نہا کر زنانہ لباس میں جلوس لے کر نکلتے تھے۔ کتاب میں بتایا گیا ہے کہ شاہانِ اَوَدھ کے ہاں اماموں کے مصنوعی جنازے نکالے جاتے اور اُن کے فرضی مقبرے بنائے جاتے تھے۔ وہ نیچ ذات کی عورتوں سے تمتع کرتے تھے جن کی شاہی محل میں بہتات تھی۔ اِس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے کہ پٹھان روہیلوں کی تباہی و بربادی میں اَوَدھ کے نوابوں کا نمایاں حصہ تھا جن کے ایما سے روہیلوں پر وحشیانہ مظالم ڈھائے گئے۔ کتاب میں نوابانِ اَوَدھ کے عیاشانہ طرزِ معاشرت، اسلامی معاشرے اور اردو ادب پر اُس کے منفی اثرات سے بحث کی گئی ہے، نیز لکھنؤ اور اَوَدھ کی ٹھاٹ باٹ سے بھرپور زندگی، شہر کی شادابی، رعایا کی آسودہ حالی، مہ جبینوں کی دلفریبی اور رقص وسرود کی حیاباختہ محفلوں کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ یہ اس عہد کے معاصر مصنف کے رواں دواں قلم سے بادشاہ بیگم کے زوال کی المناک داستان ہے جسے حارث پبلی کیشنز کی جانب سے نئے اہتمام کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب اہلِ اردو کو شاہانِ اَوَدھ کے تاریخی کرداروں سے بخوبی روشناس کرائے گی۔

حارث پبلی کیشنز

Email: haris.publications@gmail.com